ادبی نقوش

ادبی تنقیدی مضامین کا مجموعہ

شاہ معین الدین احمد ندوی

بار اوّل ستمبر ۱۹۶۰ء

پبلشر

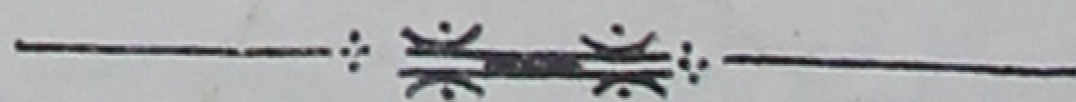
ادارۂ فروغ اردو ۳۷ امین آباد پارک لکھنؤ

پرنٹر

سرفراز قومی پریس لکھنؤ

قیمت مجلد پانچ روپیہ

فہرست مضامین



دیباچہ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

ایک زمانہ میں جب شعروادب سے زیادہ دلچسپی تھی، موجودہ دور کے بہت سے شعراء کے کلام پر مضامین اور تنقیدیں اور اردو زبان وادب کے بعض پہلوؤں پر مقالات لکھے، ان کی تعداد اتنی تھی کہ ان کا ایک ضخیم مجموعہ مرتب ہو سکتا تھا، میرے مخلص دوست مولوی نیاز احمد صاحب صدیقی پرنسپل محمد حسین کالج جونپور عرصہ سے مصر تھے کہ اردو کے طلبہ کے مطالعہ کے لئے ان کا مجموعہ شائع کر دیا جائے، مگر اس وقت شعروادب کی دلچسپیاں ختم ہو چکی تھیں اور ادبی مضامین کی کوئی قدر و قیمت نگاہ میں باقی نہ رہ گئی تھی، اس لئے طبیعت کسی طرح ان کی ترتیب و اشاعت کے لئے آمادہ نہ ہوتی تھی، مگر میرے عزیز رفیق کار سید صباح الدین عبدالرحمٰن صاحب

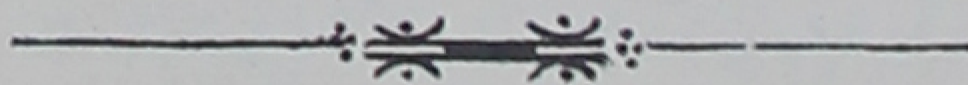
بھی اس کے لئے مصر اور یہاں تک آمادہ ہو گئے کہ اگر میں ان کو مرتب نہ کروں گا تو وہ خود مرتب کر کے دار المصنفین سے شائع کریں گے ان کو روکنا میرے بس میں نہ تھا اور دار المصنفین سے ان مضامین کی اشاعت میرے لئے اور بھی گراں تھی، اس لئے بادل ناخواستہ اس کام کے لئے آمادہ ہونا پڑا اور مضامین مرتب کر کے ان کی لاعلمی میں ادارہ فروغ اردو لکھنؤ کے حوالہ کر دیا جس کے لئے ان کی عزیزانہ خفگی بھی برداشت کرنا پڑی، اس لئے اگر یہ کوئی مفید کام ہوا ہے اور اس سے کچھ فائدہ پہونچ سکتا ہے تو ان دونوں عزیزوں کی کوشش کا نتیجہ ہے۔

اس مجموعہ کے اکثر مضامین عہد شباب کی یادگار ہیں اس لئے ان کے خیالات میں رنگینی اور قلم میں شوخی ہے، ممکن ہے اس قسم کی بعض اور بے اعتدالیاں بھی ہوں، اس لئے اس عمر میں جب کہ شباب کی بہار ختم ہو چکی اور صبح پیری کا آغاز ہے بعض مضامین میں ترمیم و اصلاح کی ضرورت محسوس ہوئی جزوی اصلاح تو آسانی سے ہو سکتی تھی مگر ان کا پورا ڈھانچہ بدل دینا میرے بس میں نہ تھا، اس سے ان کی صورت ہی بگڑ جاتی تھی۔ یہ بھی خیال ہوا کہ یہ مضامین موجودہ مذاق کے لحاظ سے "بے رنگ" سہی لیکن ایک بڑے دلکش دور کی یادگار ہیں، بڑھاپے میں جوانی کی تصویر مٹا نہیں دی جاتی بلکہ اور عزیز ہو جاتی ہے، اس لئے اس عزیز یادگار میں تصرف کرنا مناسب نہ معلوم ہوا، ایسا کرنا خلاف دیانت بھی تھا، اس لئے اگر ثقہ حضرات کو ان مضامین میں کوئی بے اعتدالی

نظر آئے تو اس لئے قابل معافی ہے کہ وہ ایسے دورِ رنگین کی یادگار ہیں جس کے لئے خواجہ حافظ کی معذرت موجود ہے۔

اس مجموعہ میں بعض ایسے مضامین بھی ہیں جن کو ادبی کے بجائے علمی کہنا زیادہ مناسب ہے مگر وہ ہیں اُردو زبان وادب سے متعلق، اس لئے ان کو بھی اس مجموعے میں شامل کر دیا گیا "اُردو شاعری میں ہندو کلچر اور ہندوستان کے طبعی وجغرافی اثرات" کا مضمون ہندوستانی اکیڈمی الہ آباد کے جلسہ میں پڑھا گیا تھا اور اس کے تماہی رسالہ میں شائع ہوا تھا اور "اُردو زبان کی لسانی علمی اور تمدنی اہمیت" آل انڈیا اورنٹیل کانفرنس کے اجلاس لکھنؤ میں پڑھا گیا تھا، ان کے علاوہ کل مضامین معارف کے لئے لکھے گئے تھے اور اس میں شائع ہوئے۔

معین الدین احمد ندوی
۱۰ اگست سنہ ۱۹۶۰ء
دار المصنفین، اعظم گڑھ



بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اردو شاعری میں ہندو کلچر اور ہندوستان کے طبعی و جغرافی اثرات

اُردو شاعری کا موضوع جس قدر وسیع ہے اتنا ہی اس قدر پامال ہو چکا ہے کہ اُس کے متعلق مشکل سے کوئی نئی بات کہی جا سکتی ہے۔ زیر بحث موضوع بھی کوئی نیا موضوع نہیں ہے، لیکن اس کی جانب بہت کم توجہ کی گئی ہے اس لئے نسبتاً اس پر گفتگو کی گنجائش باقی ہے۔ آئندہ سطروں میں اسی کے متعلق کچھ عرض کرنا ہے، اس سے اُردو شاعری پر بعض سطحی اعتراضوں کی حقیقت بھی واضح ہو جائے گی۔

یہ فطری اصول ہے کہ ہر ملک اور ہر قوم کی زبان اُس ملک کے جغرافی حالات کی تصویر اور اس قوم کی تہذیب و معاشرت کا آئینہ ہوتی ہے اس لحاظ سے اُردو شاعری کو ہندوستان کے جغرافی حالات اور یہاں کی تہذیب و معاشرت کا آئینہ دار ہونا چاہیے۔

لیکن اس پر منجملہ اور اعتراضوں کے ایک اعتراض یہ بھی کیا جاتا ہے کہ یہ ہندی نژاد ہونے کے باوجود ہندوستانی رنگ و روپ سے کوئی علاقہ نہیں رکھتی۔ اس کے سارے خط و خال ایرانی ہیں۔ اس کے باغوں میں

سرو صنوبر اُگتے ہیں۔ اس کی بہار لالہ وگل کہلاتی ہے۔ اس کے چمن میں قمری وبلبل نغمہ سنجی کرتے ہیں۔ اس کی نہروں میں دجلہ و فرات کی روانی ہے۔ اس کے افسانہائے محبت میں شیریں و فرہاد کی داستانیں ہیں۔ اس کی رزمیات میں رستم و سہراب کے معرکے ہیں۔ اس کے محبوب کی آنکھیں نرگس شہلا، رخسار گل، زلف سنبل، قامت سرو رعنا، غرض اس کی تمثیلات، تشبیہات استعارے اور شاعری کے تمام عناصر عجمی ہیں۔ آئندہ سطروں میں اس اعتراض سے قطع نظر کرکے ہم کو دکھانا ہے کہ اُردو شاعری میں ہندی خیالات ہندو مذہب، ہندی تہذیب و معاشرت، آداب و رسوم اور ہندوستان کے طبعی اور جغرافی اثرات کہاں تک ہیں؟ اس سے ضمناً مذکورہ بالا اعتراض کی حقیقت بھی واضح ہو جائے گی۔

یہ موضوع اتنا وسیع ہے کہ اس کے تمام پہلوؤں کا احاطہ کرنے کے لئے ایک مستقل کتاب چاہیئے۔ اس لئے اس مضمون میں بعض اہم پہلوؤں کو صرف اس حد تک دکھایا جائے گا کہ اس سے یہ اندازہ ہو جائے کہ اُردو شاعری قدیم ملکی تہذیب و معاشرت اور اپنے جنم بھوم کے جغرافی حالات سے کہاں تک متاثر ہوئی اور اُس میں اس کے کیا کیا اثرات پائے جاتے ہیں۔

ہندوستان میں ہندو اور مسلمانوں کے میل جول سے جس مشترک تہذیب کی بنیاد پڑی، اُس میں دونوں قوموں کے بعض نسلی اور مذہبی خصوصیات کے علاوہ دونوں تہذیبوں کے عناصر یکساں پائے جاتے ہیں، بلکہ میں یہاں تک کہنے کی جرأت کروں گا کہ مذہب کا بلند کنگرہ بھی اس کی کمند سے محفوظ

نہ رہ سکا۔ آج ہندی مسلمانوں کے رائج مذہب میں مذہب کے نام سے جس قدر ہندوانہ رسمیں داخل ہوگئی ہیں، اس کا اندازہ بہتوں کو ہوگا۔ خصوصاً معاشرت میں یہ رنگ اتنا گہرا ہوگیا ہے کہ آج خالص اسلامی معاشرت اور رسوم کی شکل پہچاننا مشکل ہے۔ اسی طرح ہندو مذہب اور ہندو تہذیب بھی اسلامی تہذیب بلکہ مذہب اسلام سے متاثر ہوئی ہے۔ ہندوؤں کی مذہبی اور معاشرتی اصلاحیں، اور ترقی یافتہ کایستھ اور کشمیری برہمن خاندانوں کی معاشرت اس کی شاہد ہے۔ اور یہ عین اصول فطرت ہے۔ اُردو شاعری بھی اسی مشترک تہذیب کا نتیجہ اور دونوں قوموں کی مشترک ادبی کوششوں کا ثمرہ ہے اس لیئے وہ کس طرح ان اثرات سے محفوظ رہ سکتی تھی؟

اس موقع پر ایک ضروری پہلو کی جانب توجہ دلانا ہے۔ یہ عجیب حیرت انگیز امر ہے کہ جو لوگ اُردو شاعری پر فارسی کی تقلید اور نقالی کا الزام لگاتے ہیں وہ اس اصول کو بھول جاتے ہیں کہ اُردو تو اسلامی یا ایرانی اور ہندی تہذیب کے میل جول کا نتیجہ ہے اس لیئے فطرت اور انصاف دونوں کا تقاضا یہ ہے کہ اس میں دونوں کا اثر ہو۔ اُردو شاعری نے جن درباروں کے زیرسایہ پرورش پائی گو وہ ہندوستان میں ہونے کی وجہ سے ہندی ہوگئے تھے لیکن تھے وہ عجمی نژاد۔ اس لیئے وہ اپنے نسلی اور موروثی اثرات کو اس حد تک کس طرح مٹا سکتے تھے کہ اُن کا کوئی نشان اُن کی پیدا کردہ زبان اور شاعری میں نہ مل سکتا؟ یہ اثرات تو بالکل طبعی اور فطری ہیں۔

لطیفہ یہ ہے کہ انھیں معترضین میں بعض بامذاق حضرات، اُردو شاعری میں

انگریزی زبان کی شاعری کے نمونے ڈھونڈھتے ہیں۔ اس وقت وہ اس اصول کو بھول جاتے ہیں کہ ہر قوم و ملک کی شاعری، اس کی قومی اور ملکی خصوصیات اس کے جذبات و میلانات اور مقامی حالات کا مظہر ہوتی ہے۔ اس لیئے ایک ہندوستانی شاعر یورپ کا رنگ اور مذاق کہاں سے پیدا کر سکتا ہے؟ اگر کرے گا تو محض آورد اور نقالی ہوگی۔ بہر حال یہ ایک جملہ معترضہ تھا۔ اب میں اصل موضوع کی جانب متوجہ ہوتا ہوں۔

جیسا کہ اوپر عرض کیا گیا، اُردو شاعری ایرانی اور ہندی تہذیب اور اُن کی شاعری سے مل کر پیدا ہوئی، اس لیئے اس کو دونوں کے اثرات وراثت میں ملے۔ اس مضمون میں اس کے صرف ایک پہلو یعنی ہندو کلچر کے اثرات کو دکھانا ہے۔ ہندو کلچر کا کوئی ایسا پہلو نہیں ہے جس کے اثرات اُردو شاعری میں نہ ملتے ہوں۔ ہندو مذہب و معاشرت، آداب و رسوم، زبان و خیالات وغیرہ جملہ عناصر اُردو شاعری کے دامن میں موجود ہیں۔ اب ان سب کو علٰحدہ علٰحدہ پیش کیا جاتا ہے۔

زبان کے اثرات

سب سے پہلے زبان کو لیجیے۔ اُردو شاعری مختلف دوروں سے گذری ہے۔ ابتدائی دور میں اُس پر ہندی الفاظ اور خیالات کا اس قدر غلبہ تھا کہ اُس میں اور ہندی شاعری میں فرق کرنا مشکل ہے۔ یہ اُردو زبان کا تکوینی دور تھا، جس میں اس نے مستقل زبان کی حیثیت حاصل نہیں کی تھی۔ اس لیئے ہم اس کو چھوڑ کر صرف اُس دور کو لیتے ہیں، جب ریختہ نے اُردو زبان کا قالب اختیار کر لیا تھا اور فارسی کو شاعری کی مسند سے اُٹھا کر

خود اُس کی جگہ حاصل کر لی تھی اور فارسی کے بجائے اُردو اظہارِ کمال کا ذریعہ بن گئی تھی۔ اس میں بھی ہم اُن الفاظ کو قلم انداز کریں گے جنھوں نے اردو میں جذب ہو کر ہندی کی تخصیص کھو دی ہے، بلکہ خالص ہندی اور ہندوانہ الفاظ پیش کریں گے۔ ان دونوں میں وہی فرق ہے جو "عربی زبان" اور "اسلامی مصطلحات" میں ہے۔ ہندی ایک وسیع زبان ہے جس میں مذہبی اور غیر مذہبی سب طرح کے الفاظ داخل ہیں۔ لیکن ہم کو صرف وہ الفاظ پیش کرنا ہیں جن کا تعلق ہندو مذہب اور ہندو تہذیب و معاشرت سے ہے، کہ یہ تخصیص ہمارا مدعا ثابت کرنے کے لئے اور زیادہ موثر ہے۔

اس قسم کے بہت سے الفاظ فارسی کے وسیلے سے آئے، اور اس طرح اردو شاعری کا جزو بن گئے کہ اب اُن کی حیثیت مصطلحات کی ہو گئی ہے۔ مثلاً دیر و حرم، مسجد و بُت کدہ، شیخ و برہمن، ناقوس و اذان، تسبیح و زنار وغیرہ۔

میر:- میر کے دین و مذہب کو، اب پوچھتے کیا ہو اُن نے تو
قشقہ کھینچا، دیر میں بیٹھا، کب کا ترک اسلام کیا

ہم یہ کہتے تھے کہ مت دیر و حرم کی راہ چل
اب یہ جھگڑا حشر تک شیخ و برہمن میں رہا

کفر کچھ چاہیے، اسلام کی رونق کے لیے
حُسن، زُنّار ہے، تسبیح سلیمانی کا

نامعلوم:- اذاں دی کعبے میں، ناقوس دیر میں پھونکا
کہاں کہاں ترا عاشق، تجھے پکار آیا

گو یہ الفاظ فارسی شاعری کی راہ سے آئے، لیکن ہندوستانی
اثرات نے انھیں پائدار بنا دیا۔ خالص ہندوانہ الفاظ جن سے ہندو کلچر کے
مختلف اثرات کا اندازہ ہوتا ہے، یہ ہیں۔

انشا:۔ سانولے پن پر، غضب دھج ہے بسنتی شال کی
جی میں ہے کہہ بیٹھیے اب، جے کنھیا لال کی
شیو کے گلے سے، پاربتی جی، لپٹ گئیں
کیا ہی بہار آج ہے، برہما کے رند پر
لگے کہنے بھیم کسل اسے جو علی کے دھیان کے بیچ ہے
تورے دکھ دلدر کہ جتنے تھے گئے بھاگ آپ کے بھاگ سے
شیر کی کھال بچھا اور ملے تن پہ بھبھوت
گاہ جوگی کی طرح رہتے ہیں آسن مارے

انشاء اللہ خاں کے یہاں اس قسم کے الفاظ بکثرت ملتے ہیں۔ ہم نے
صرف چند مثالیں دی ہیں۔ دیگر شعرا کے اشعار ملاحظہ ہوں۔

امانت:۔ سانولے پن پہ، قبا ہے جو ترے، بھاری ہے
لالہ کہتا ہے چمن میں کہ یہ گردھاری ہے
دیا ہے کوچے میں قاتل نے لاش کو لٹکا
نہ مجھ پہ گور کا احساں ہوا نہ مرگھٹ کا
آہوں کا دھواں ہے طرف چشم تو اے دوست
گنگا پہ یہ مردہ کسی ہندو کا جلا ہے

سودا:- ترکش الیند سینۂ عالم کا چھان مارا
مژگاں نے تیرے پیارے ارجن کا بان مارا

منیر:- کب تلک دھونی رمائے جوگیوں کی سی رہوں
بیٹھے بیٹھے در پہ تیرے میرا آسن جل گیا

امیر:- ڈر کے میری شب جدائی سے
کالکا رام رام کرتی ہے
سانولی دیکھ کے عورت کسی متوالی کی
ہوں مسلمان مگر بول اٹھوں جے کالی کی

جرأت:- دردِ دل اس بتِ بے درد سے کہئے تو کہے
جا کے یہ رام کہانی تو سنا اور کہیں

شاہ حاتم:- خط نکلے پہ بوسہ رخ پر نور کا پایا
خیرات برہمن کو ملی چاند گرہن سے

عورتوں کی زبان پر ہندی الفاظ بکثرت ہیں، اس لئے ریختی تو سراسر ہندی میں ڈوبی ہوئی ہے۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں۔

جان صاحب:-
سوم کے گھر میں میاں کی دال بھی گلتی نہیں
ہر دم راکس جان لے گا، آہ بکھرے گی کالکا
گو شکل مری اچھی ہے، پر کیا کروں چھمی
تقدیر تو بدتر ہے مری بھاگ بھرتا ہے

نام کیا لنکا میں کرتی سامری سے میں سوا
مجھ سی جادو گرنیاں ہوتیں اگر راون کے ساتھ
ایک ایک نقطے پر مُوے لڑتے ہیں مُردوے
محفل مشاعروں کی اکھاڑا ہے بھیم کا
کیونکر قدم رسولوں، جاکر بھروں نہ چوکی
رکھئے جو آسرا تو، ایسے مہابلی کا
تم تو کیا ہو بیگما! ڈنڈوت کرتے ہیں یہاں
سب مہاراجوں کے راجہ جی بڑے ہیں جو کہ منڈ

اس موقع پر ہم نے قصداً اُن نظموں کو نقل نہیں کیا ہے جو ہندوانہ مصطلحات کے ساتھ ٹھیٹھ ہندوانہ لب و لہجے میں کہی گئی ہیں۔ نظیر اکبرآبادی نے اس قسم کی متعدد نظمیں کہی ہیں۔ زمانۂ حال میں اکبر کے یہاں اس قسم کے الفاظ و مصطلحات بکثرت ملتے ہیں۔ ہندوانہ الفاظ کی ہمہ گیری کے اثر سے خالص مذہبی شاعری بھی خالی نہیں ہے۔ مشہور نعت گو محسن کاکوروی کے مشہور نعتیہ قصیدے کی تشبیب سراسر اسی رنگ میں ڈوبی ہوئی ہے۔ اُن کے بعض اشعار یہ ہیں:۔

سمت کاشی سے چلا، جانب متھرا بادل
برق کے کاندھے پہ لاتی ہے، صبا گنگا جل
گھر میں اشنان کریں، سرو قدانِ گوکل
جاکے جمنا پہ نہانا بھی ہے اک طول امل

خبر اُڑتی ہوئی آئی ہے مہابن میں ابھی
کہ چلے آتے ہیں تیرتھ کو ہوا پر بادل
دُھر کا ترسا بچہ ہے، برق، لیئے جل میں آگ
ابر، چوٹی کا برہمن ہے، لیئے آگ میں جل
دیکھیئے ہوگا سری کرشن کا کیونکر درشن
سینۂ تنگ میں دل گوپیوں کا ہے بے کل
راکھیاں لے کے سلونوں کی برہمن نکلیں
تار بارش کا تو ٹوٹے کوئی ساعت کوئی پل
اب کی میلا تھا ہنڈولے کا بھی گرداب بلا
نہ بچا کوئی محافہ، نہ کوئی رتھ، نہ بہل
ڈوبنے جاتے ہیں گنگا میں، بنارس والے
نوجوانوں کا سنیچر ہے، یہ بڑھوا منگل
تہ و بالا کیئے دیتے ہیں، ہوا کے جھونکے
بیڑے بھادوں کے نکلتے ہیں بھرے گنگا جل
خوب چھایا ہے سر گوکل و متھرا بادل
رنگ میں آج کنھیا کے ہے ڈوبا بادل

الفاظ کی بحث میں صرف انھیں مثالوں پر اکتفا کی جاتی ہے۔
آئندہ مختلف سلسلوں میں جس قدر اشعار آئیں گے اُن سب سے اس کا
مزید ثبوت ملتا جائے گا۔

تشبیہ و استعارہ شاعری کی ایک اہم صنعت تشبیہ و استعارہ ہے۔ شاعر اپنے گرد و پیش جو کچھ دیکھتا ہے، اُسی کو تشبیہ اور استعارے کے کام میں لاتا ہے۔ اس لحاظ سے اُردو شعرا نے بکثرت ہندی تشبیہیں استعمال کی ہیں۔ بلکہ یہاں تک کہا جا سکتا ہے کہ شاید ہی خالص ہندی شاعری کی کوئی تشبیہ ایسی مل سکے جسے اُردو شعرا نے استعمال نہ کیا ہو۔ ہم نے اس سلسلے میں اتنی تشبیہیں جمع کی ہیں کہ اُن پر علیحدہ ایک مستقل مضمون لکھا جا سکتا ہے۔ اُن میں سے چند یہاں پیش کی جاتی ہیں۔

قد کی تشبیہ بوٹے اور کونپل سے۔

ناسخ:۔ گڑ گئے گلبن ترے بوٹا سے قد کو دیکھ کر
تھا کفِ گل میں جو زر گویا دفینہ ہو گیا

امانت:۔ قد جو بوٹا سا ترا سروِ رواں یاد آیا
غش پہ غش مجھ کو چمن میں تہِ شمشاد آیا

امیر:۔ ہر چند لڑکپن میں ہے بوٹا سا قد اُن کا
ہونے دو جواں سرو و صنوبر سے بڑھیں گے

ابھی اُس نونہال پر عالم باغباں ہے نکلتی کونپل کا

زلفوں کی تشبیہ گھٹا سے۔

لنک کے زلفیں جو آ پڑی ہیں، کمر کسی کی لچک رہی ہے
بلا کی آئی ہیں دو گھٹائیں، غضب کی بجلی چمک رہی ہے

مہ تشنہ:۔

خوش نما ہے چہرۂ محبوب پر زلفِ سیاہ
عالم اک دکھلاتی ہے کالی گھٹا گلزار پر

زلف کی گھٹا سے اور سُرخی رخسار کی شفق سے :۔

پھولے شفق تو زرد ہو گالوں کے سامنے
پانی بھرے گھٹا ترے بالوں کے سامنے

ایک اور تشبیہ۔

ہے یادِ زلف میں دل پُر داغ مُنتشر
کالی گھٹا کے شوق میں، کھولے ہے مور پر

بعض مرکب تشبیہیں۔

سیاہ گیسو ہیں رُخ پہ بکھرے، وہ بیٹھے سُرمہ لگا رہے ہیں
ادھر تو مہتاب ہے گہن میں، اُدھر وہ جادو جگا رہے ہیں

امانت :۔ کبھی کاجل کبھی آنکھوں میں لگایا سُرمہ
رات تھا کون سا جادو، جو جگایا نہ گیا

ان تشبیہوں کی ہندیت ظاہر ہے۔

برسات میں دکھلاؤ کبھی رُخ کبھی گیسو
دو چار گھڑی سایہ ہو دو چار گھڑی دھوپ

زلف کی تشبیہ سانپ اور ناگن سے۔

امانت :۔ دیدۂ تر میں مرے پھرتی ہیں زلفیں یار کی
دیکھ لو پانی میں لہراتا ہے جوڑا سانپ کا

داجو کی اُس نازنیں نے زلف پُرفن آب میں
آشنا ہوئے کہ لہراتی ہے ناگن آب میں

آتش :- چھوا جو گیسوئے عنبریں کو، تو سانپ پھیلا فسوں سے گویا
لیا جو چشم سیہ کا بوسہ، شکار میں نے کیا ہرن کا

اثر :- نہیں یہ زلف اُڑ یا ناگن ہے
ہر خم و پیچ میں خدا من ہے

ناگن اور سانپ کی تشبیہ میں شعرا کی پوری پوری غزلیں موجود ہیں (امانت و امیر)۔

زلف کی تشبیہ جمنا کی موج سے۔

ولی :- زلف ہے تیری موج جمنا کی
تل نزدیک اس کے اک سناسی ہے

زلف کی سیاہی کی تشبیہ بھونرے اور پاؤں کی کنول سے۔

جبین چاند سی، زلف نگا ربھونرا سی
کنول سے پاؤں نگاریں ہیں پھول سے رخسار

جوڑے کی تشبیہ بس کی گانٹھ سے۔

اثر :- تو وہ طوفان قہر ہے جوڑا
گانٹھ بس کی ہے زہر ہے جوڑا

سیندور بھری مانگ کی تشبیہ دھنک سے۔

فلق :-

سیندور اس کی مانگ میں دیتا ہے یوں بہار
جیسے دھنک نکلتا ہے ابر سیاہ سے

موتی بھری مانگ کی تشبیہ بدلی میں بگلوں کی قطار سے۔

افقؔ:- مانگ موتی بھری وہ دے ہے بہار
جیسے بگلوں کی بدلی میں ہو قطار

انتہا یہ ہے کہ زلف، گیسو، کاکل سب ہندو کے معنی میں ہو گئے۔

ذوقؔ:- خط بڑھا، کاکل بڑھے، زلفیں بڑھیں گیسو بڑھے
حُسن کی سرکار میں جتنے بڑھے ہندو بڑھے

زلف کے بعد پیشانی انور کی صندلی بہار ملاحظہ فرمایئے۔

اثرؔ:- لطف گر یہ ہے بتاں صندلی پیشانی کا
حُسن کیا صبح کے پھر چہرۂ نورانی کا

منیرؔ:- صبح چمن کا جلوہ ہندی بتوں میں دیکھا
صندل بھری جبیں میں ہونٹوں کی لالیاں میں

آنکھ کی تشبیہ کنول کے پھول سے۔

آتشؔ:- آئینے میں عکس چشم یار کا عالم نہ پوچھ
دیکھیے آتش کنول پھولے ہوئے تالاب میں

کنول اور بھونرے سے۔

نیلوفر آنکھ ہے مرے دریائے حُسن کی
شبرنگ مردمک نہیں بھونرا کنول میں ہے

مرزا شوق :- آنکھیں بھونروں کی طرح کالی
قد لوچ میں ناروں کی ڈالی

ممولے کی اچپلاہٹ سے۔

شوخی ان کی عجب تماشا ہے اچپلاہٹ ممولے کی کیا ہے

آنکھ کی ایک بے مثل مرکب تشبیہ۔

مزا برسات کا چاہو تو ان آنکھوں میں آ بیٹھو
سپیدی بھی، سیاہی بھی، شفق بھی، ابر باراں بھی

خون آلود مژگاں کی تشبیہ پھولے ہوئے ڈھاک سے جو خاص ہندوستان کی صحرائی بہار ہے۔

محمد امان نثار :- خونِ جگر سے مژگاں یوں سُرخ ہو رہے ہیں
جنگل میں جیسے یارو، پھولا ہوا ہو ڈھا کا

اس بہار کے سلسلے میں آتش کا وہ مشہور شعر یاد آ گیا۔

آتش :- صحرا کو بھی نہ پایا رشک و حسد سے خالی
کیا کیا جلا ہے ساکھو پھولا جو ڈھاک بن میں

ناک کی تشبیہ طوطے کی چونچ سے۔

اکبر :- ناک ہے یا کہ ایک طوطا ہے
چونچ اب شہد میں ڈبوتا ہے

لب کی گلنار کی کلیوں سے۔

امان نثار :-

آتشیں لب کی ترے باتیں جو ہیں چلبلیاں
گریباں چاک جوں شعلہ ہوئیں گلنار کی کلیاں

رخسار کی تشبیہ شفق سے ۔

پھولے شفق تو زرد ہو گالوں کے سامنے
رخسار کی لالہ سے اور خال رخ کی سویدا سے ۔

برقؔ :۔ تیرہ بختوں نے بڑھایا حُسن دُونا یار کا
تل سے کاجل کے گلِ رخسار لالہ ہو گیا

تل کی تشبیہ پہ ایک اور شعر یاد آگیا جو خالص ہندوانہ تشبیہ ہے ۔

جان صاحب :۔ تل نہیں مانگ میں زنانخی کے
یہ کنھیا کھڑا ہے گوکل میں

دانت کی ہیرے کی کنی سے ۔

لب ہیں وہ لب کہ عقیق یمنی خون کرے
دانت وہ دانت کہ ہیرے کی کنی خون کرے

دنداں، مسی مالیدہ لب کی مختلف تشبیہیں ۔

مسی مالیدہ دنداں پیارے پیارے چمکتے تھے شب یلدا میں تارے
مسی مالیدہ لب پر رنگ پان ہے تماشا ہے، تہِ آتش دھواں ہے

وہ ہنستے ہیں ہماری چشم تر پر مسی ملتے ہیں
شب تاریک میں بجلی چمکتی ہے سمندر پر

سلہ یہ مصرع مشتبہ ہے ۔

ہندوستان میں مختلف آب و ہوا کے اثر سے مختلف مقامات کا رنگ جدا ہوتا ہے، سُرخ، سپید، گندمی، چمپئی، سانولا، اس لئے یہ تمام رنگ ہندوستان میں مرغوب ہیں، اُردو شعرا نے ان سب کو سراہا ہے۔

سُرخ و سپید رنگ۔

آتش:- سُرخ و سپید رنگ سے ہوتا ہے آشکار
وہ جسم نازنیں ہے عبیر و گلال کا

لیکن ہندوستان کا عام رنگ گندمی اور سانولا ہے۔

سو لٹک، اچپلاہٹ، شرارت، اُمنگ
دمکتا وہ کندن سا چمپک کا رنگ

امانت:- رنگ رخسار کا شعلہ جو بھڑک جاتا ہے
آتشِ حسن پہ کندن سا دمک جاتا ہے

نسیم:- ایسی پیدا کرے ہے رنگ جھلک
جیسے کندن پہ خوشنما ہو جھلک

امانت:- رنگِ رُخ وہ ہے طلائی رنگ نہیں جس کا نظیر
ہے بجا خاک عناصر کو جو کہدے اکسیر

ان سب رنگوں میں سانولے رنگ کو خاص مقبولیت اور محبوبیت حاصل ہے۔ چنانچہ "سانولیا" معشوق کا مرادف ہو گیا۔

امیر:- دور دور رہ ہو ترا سانولی صورت والے
تجھ کو دیتے ہیں دُعائیں یہ ترے متوالے

سانولی دیکھ کے صورت کسی متوالی کی
ہوں مسلمان مگر بول اُٹھوں جے کالی کی

گندمی رنگ۔

امانت:۔ ہوا ہے دل یہ رنگِ سبزہ لطف زندگانی ہے
مرے محبوب گندم گوں کی جو پوشاک دھانی ہے

مختلف تشبیہیں۔

امانت:۔ زرد چہرہ ہے مرا دیدۂ پُرآب کے پاس
کھیت سرسوں کا ہے پھولا ہوا تالاب کے پاس

نواب مرزا شوق:۔ سبزۂ خط نے بڑھا دی ترے عارض کی بہار
تھا جو لالہ کا چمن کھیت ہے اب دھانوں کا

اتنی مثالیں اُردو شاعری میں ہندی تشبیہوں کے ثبوت کے لیے کافی ہوں گی۔

بحروں اور اوزان پر اثر

اُردو شاعری، عرب اور فارسی کے قالب میں ڈھلی تھی، اس لیے اس کی بحریں اور اس کے اوزان عربی اور فارسی ہیں۔ لیکن ہندی کے اثرات سے کچھ اور بحریں بھی ایجاد ہوئیں۔ دکنی شعرا کا کلام ہندی سے قریب تر ہے، اس لیے اُن کے کلام میں ہندی یا اُس سے ملتی جلتی ہوئی بحریں ملتی ہیں۔ خالص اُردو شاعری کے دَور کے اساتذہ نے بھی ہندی بحروں میں اشعار کہے ہیں، قدیم بحروں میں تصرفات کیے ہیں اور نئی بحریں ایجاد کی ہیں۔ میر تقی میر، سودا، انشا اور ذوق کے یہاں اس قسم کی بحریں ملتی ہیں۔ اُس زمانے کے ایک نامور ناقد شاعر نے

میرؔ کی متعدد غزلوں کو بھاکھا اور سنسکرت کی بحروں میں سمجھا ہے۔ مثلاً[1] :-

اُلٹی ہو گئیں سب تدبیریں کچھ نہ دوا نے کام کیا
دیکھا اس بیماری دل نے آخر کام تمام کیا

پلکیں بھری ہیں کھنچی بھویں ہیں، ترچھی تیکھی نگاہیں ہیں
اُس اوباش کی سادگی دیکھو شوخی ہی ہم چاہے ہیں

دل جلنے کی کچھ بن نہیں آتی، حال بگڑتے جاتے ہیں
جیسے چراغِ آخر شب ہم لوگ نبڑتے جاتے ہیں

کیا کچھ ہم سے ضد ہے تم کو، بات ہماری اُڑا دو ہو
لگ پڑتے ہیں ہم تم سے، تو تم اوروں کو لگا دو ہو

جب کہتے تھے تب تم نے، گوش ہوش نہ کھولے کچھ
چپکے چپکے کسو کو چاہو، پوچھا بھی تو بولے ٹک

عالم علم میں ایک تھے ہم، دے جیسے ہاں ان کو گیان نہیں
اب کہتے ہیں غلط کیا، جان نہیں پہچان نہیں

انشاء اللہ خاں کی جدت پسند طبیعت نے زیادہ نیرنگیاں دکھائی ہیں، ایک مثال ملاحظہ ہو :-

میں پیا ند کے دیوار جو کل رات نہ جاتی
کنڈی نہ ہلاتی جا کر نہ جگاتی نیند اُس کو نہ آتی
جوبن کی وہ ماتی تو رہی نہ ملاتی

---

[1] شعر الہند۔

ذوق نے اپنی بحروں کی جدتوں کی داد خود دی ہے :-

اس بحر میں کیا برجستہ غزل، اے ذوق یہ تو نے لکھی ہے
ہاں وزن کو شش کر جس کے شادان، روحِ خلیل و اخفش ہو

لیکن یہ نہیں کہا جا سکتا کہ ان کو بھاشا کی بحروں سے کیا تعلق ہے محض بحروں کی جدتوں کے سلسلے میں ہم نے ان کو نقل کر دیا۔ مولانا طباطبائی نے اردو شعرا کو ہندی بحر "پنگل" میں اشعار کہنے کا مشورہ دیا ہے[1]۔

مضامین شاعری

شاعری کے مضامین ہر ترقی یافتہ زبان کی شاعری میں قریب قریب یکساں ہوتے ہیں، حسن و عشق، تصوف، اخلاق و موعظت، رزم و بزم قدرتی مناظر، جذبات و واقعہ نگاری، یہی ہندی شاعری میں بھی ہیں اور اردو شاعری میں بھی۔ اس لحاظ سے دونوں میں کوئی خاص فرق نہیں ہے۔

ویدانت کے مسائل

البتہ صوفیانہ شاعری میں اسلامی تصوف کے ساتھ ویدانت کے مسائل بھی ملتے ہیں، خصوصاً ہندو صوفی شعرا کا کلام ویدانت کے مسائل سے بھرا ہوا ہے۔ ان میں منشی سورج نرائن مہر اور پنڈت امرناتھ مدن ساحر دہلوی کے نام خاص طور پر لائق ذکر ہیں۔ ساحر دہلوی کا دیوان بھی شائع ہو چکا ہے، یہ دیوان گویا تصوف و ویدانت کی کتاب ہے۔

جذبات و طریقہ ادا

اردو اور ہندی شاعری کے جذبات اور طریقہ ادا میں تھوڑا سا فرق ضرور ہے اور ان دونوں اثرات کو اردو شاعری نے قبول کیا جذبات کا فرق یہ ہے کہ ہندی شاعری میں عورت عاشق ہوتی ہے اور مرد

---

[1] پنگل علم عروض کو کہتے ہیں، یہ کوئی بحر نہیں ہے۔

معشوق اور عاشقانہ جذبات کا اظہار عورت کی زبان سے ہوتا ہے اردو
شاعری میں اس اثر کی بہترین مثال احمد علی شوق کی مشہور نظم "عالم خیال"
ہے۔ اگر اس رنگ کی یہی ایک نظم اردو میں ہوتی تو بھی ہندی سے تاثر کی
مثال کے لیے کافی تھی۔ یہ نظم اتنی مشہور ہے کہ اس کا اقتباس پیش کرنے
کی ضرورت نہیں۔ ساون کی نظموں اور گیتوں میں بھی یہ اثر نمایاں نظر آتا ہے
اب اردو میں اس رنگ کی نظموں کا مذاق روز بہ روز بڑھتا جاتا ہے اور آئے
دن رسالوں میں نکلتی رہتی ہیں۔ اس کی دوسری مثال میں ہماری شاعری کی ایک
قدیم مگر مطعون صنف "ریختی" کو پیش کیا جا سکتا ہے۔ اس کے بعض پہلوؤں کے
ابتذال سے قطع نظر، عورت کی زبان سے اظہار جذبات کی خصوصیت کو
تو ماننا ہی پڑے گا۔

اردو شاعری میں ہندی شاعری کے طریقۂ ادا کی مثالیں بھی نظر آتی
ہیں۔ ہندی شاعری کے طریقۂ ادا میں ایک خاص نرمی، لوچ اور مستانہ پن
ہوتا ہے۔ اسے ہندی زبان کی فطری نرمی اور لچک کا نتیجہ کہا جائے یا اس کی
شاعری کی خصوصیت۔ اس کے لیے تنہا ہندی الفاظ کا جمع کر دینا کافی نہیں
ہے، بلکہ اس کے لیے نازک عاشقانہ الفاظ کی ادا شناسی بھی ضروری ہے
مثلاً فغاں کا یہ شعر ؎

سانولا مکھڑا، رسیلے نین، متوالی ہے چال
ایسے پیارے پر فغاں کیونکر نہ دیوانہ بنوں

اس قسم کے اشعار قدما کے یہاں بکثرت ہیں۔ اس دور کی شاعری بھی

اس سے خالی نہیں ہے۔ موجودہ دور کے ایک نامور شاعر آنکھوں کی تعریف میں کہتے ہیں :-

اثر لکھنوی

ہائے رے پیاری پیاری آنکھیں — متوالی رتناری آنکھیں
کیا ہے دل جب دل کو لبھائیں — بہکی باتیں خماری آنکھیں
غارتِ دل پر لوٹ پڑی ہیں — شیام نگر کی کماری آنکھیں

اصناف شاعری

اصناف شاعری میں اردو شاعری ہندوستانی اثر سے کم متاثر ہوئی۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ہر زبان کے اصناف شاعری کا ہیولے ایسا ہوتا ہے کہ بغیر اس زبان کو اختیار کئے ہوئے اس کی نقل نہیں کی جا سکتی اور ہندی کو اس باب میں ایک خاص امتیاز حاصل ہے۔ اس کے اصناف کی کامیاب نقل ہو ہی نہیں سکتی۔ اور جب نقل کی جائے گی تو وہ زبان ہندی یا ہندی نما ہو جائے گی۔ مثلاً بہت سے شعرا نے اردو میں دوہے اور ٹھمریاں کہی ہیں لیکن ہم انھیں واقعی اردو زبان نہیں کہہ سکتے۔ تاہم اردو شاعری اس اثر سے بھی خالی نہیں ہے، چنانچہ "بارہ ماسے" جو خاص ہندی زبان کی چیز ہیں، بعض شعرا نے اردو میں کہے تھے۔ مرزا سجاد بیگ دہلوی نے "الفہرست" میں اُن کے نام گنائے ہیں۔ بعض نام یہ ہیں :-

عبداللہ انور بخش۔ کاظم علی اور لطف الرحمٰن وغیرہ

ہندو قصوں اور افسانوں پر اردو مثنویاں

اردو شاعری میں تنہا لیلیٰ و مجنوں، شیریں فرہاد، اور وامق و عذرا کے عشق کی داستانیں نہیں ہیں، بلکہ اس بزم میں ہم کو نل اور دمن کی جادوگری بھی نظر آتی ہے۔ میر صاحب

فرماتے ہیں :۔

سنا ہو گا واتمق پہ جو کچھ ہوا
نل اس عشق میں کس طرح سے موا
جو لیلیٰ پہ گزری سو مشہور ہے
دمن کا بھی احوال مذکور ہے

تنہا ان کے نام ہی نہیں ہیں، بلکہ ہندو قصوں اور افسانوں پہ مستقل مثنویاں ہیں۔ میر صاحب نے ایک ہندو "پرسرام" کی داستان عشق نظم کی، جو اُن کی مثنویوں کے مجموعے میں موجود ہے۔ حافظ رحمت خاں روہیلہ نے "سسی اور پنوں" کی داستان میں مثنوی "اسرار محبت" لکھی۔ شاہ نصیر دہلوی کے شاگرد مرزا یار علی بیگ نکہت نے "نل دمن" کا افسانہ نظم کیا۔ شاہ تراب علی قلندر نے ایک "ہندو پسر" کے عشق کے حالات میں مثنوی "عاشق و صنم" لکھی۔ راجہ درگا پرشاد نے مثنوی "مہر تاباں" میں چندر اور مالتی کی داستان عشق نظم کی ایسی اور بھی بہت سی مثنویاں ہیں۔

ہندو مذہب اور سنسکرت اور ہندی کتابوں کے منظوم تراجم اور مستقل نظمیں

اُردو شاعری کا کوئی دور اکابر ہندو شعرا سے خالی نہیں رہا ہے۔ انھوں نے اُردو شاعری میں ہندو مذہب اور اس کے تعلقات کے نہایت گہرے اثرات چھوڑے، بہت سی ہندی اور سنسکرت کتابوں کو اُردو کا جامہ پہنایا، سیکڑوں ہندوانہ موضوعوں پہ مستقل نظمیں لکھیں پروفیسر سجاد مرزا بیگ دہلوی نے الفہرست میں ہندی اور سنسکرت کی بہت سی کتابوں کے منظوم اُردو تراجم کے نام لکھے ہیں۔ بعض کتابوں اور اُن کے مترجمین کے نام یہ ہیں :۔ (۱) راماین کا لکا پرشاد (۲) مہابھارت، منشی طوطا رام (۳) ست نرائن کتھا، لالہ جگناتھ سہائے (۴) پریم ساگر، شنکر دیال فرحت

(۵) مثنوی بلبھوچتر، منشی جواہر لال (۶) ناگر سبھا، کالی پرشاد (۷)، ہدم سماج، بھاری لال (۸) سنگھاسن بتیسی، رنگ لال جمن۔ یہ کتابیں ہماری نظر سے نہیں گذری ہیں، اس لئے یہ ہم نہیں کہہ سکتے کہ صاف اُردو میں ہیں یا بھاشا آمیز الفہرست میں ان کے ناموں کے اندراج سے معلوم ہوتا ہے کہ ایسی زبان میں ہوں گی جس پر اُردو کا اطلاق ہوتا ہے۔

منشی متن لال آفریں نے مقدس کاشی کے حالات میں ایک مثنوی "کاشی استت" لکھی۔ منشی سورج پرشاد صاحب تصور نے راماین کا منظوم ترجمہ کیا (دیکھیے رسالۂ زمانہ کانپور) پنڈت پربھو دیال تحسر لکھنوی اور پنڈت یوگی راج صاحب نظر سدھانوی نے "غذائے روح" اور "کلام ربانی" کے نام سے "گیتا" کے منظوم ترجمے کئے۔ اور بھی کتابوں کے ترجمے ہوئے لیکن یہاں اُن کا استقصا مقصود نہیں ہے۔ موجودہ دور کے ہندو شعرا میں اس کا مذاق زیادہ ہے۔ انھوں نے سیکڑوں ہندوانہ موضوعوں پر نظمیں لکھیں اور اپنی مذہبی کتابوں کے کلاً یا جزواً تراجم کئے۔ اقبال ورما سحر، نوبت رائے نظر، برج نرائن چکبست، تلوک چند محروم، درگا سہائے سرور، جگت موہن لال رواں، ترھبون ناتھ ہجر، پنڈت برج موہن دتا تریہ کیفی، کشن پرشاد شاد، شیام موہن لال جگر بریلوی اور ساحر دہلوی وغیرہ بہت سے شعرا نے اُردو شاعری کو ہندوانہ مضامین سے مالامال کر دیا۔ اُن سب کی مثالیں پیش کرنا طول عمل ہے۔ ان میں سے صاحب دیوان شعرا کے دواوین سے اور ماہانہ ادبی رسالوں خصوصاً زمانہ کانپور، صبح امید لکھنؤ،

اور ادیب الہ آباد وغیرہ کے پیمانے پرچوں سے اس کی تصدیق ہو سکتی ہے۔

مسلمان شعرا اور ہندو مذہب

ہندو شعرا کے علاوہ بہت سے مسلمان شعرا نے بھی ہندوانہ موضوعوں پر نظمیں لکھی ہیں۔ قدیم شعرا میں نظیر اکبر آبادی کو اس بابت میں ایک خاص امتیاز حاصل ہے۔ انھوں نے اس موضوع پر اس کثرت کے ساتھ نظمیں کہی ہیں کہ تنہا اُن کے کلام سے ہندو مذہب کے بہت سے رسوم و حالات معلوم ہو سکتے ہیں۔ یہ نظمیں بہت طویل اور مشہور عام ہیں، اس لیے صرف اُن کے نام لکھ دیے جاتے ہیں۔

(۱) کنھیا جی کی راس (۲) بلدیو جی کا میلہ (۳) کنھیا جی کا جنم، (۴) بالپن میں بانسری بجیا (۵) کنھیا جی کی شادی (۶) دسم کتھا، (۷) ہر کی تعریف (۸) درگا جی کے درشن (۹) مہادیو کا بیاہ (۱۰) شیو شنکر کی براتت (۱۱) بھیروں کی تعریف (۱۲) راکھی (۱۳) جوگی کا روپ وغیرہ۔

یہ تمام نظمیں ہندی الفاظ و اصطلاحات سے بھری ہوئی ہیں۔ ان سے ہندو مذہب کے متعلق "نظیر" کے معلومات اور ہندی زبان پر اُن کی قدرت کا بھی اندازہ ہوتا ہے۔ ان کے علاوہ ہندو تہواروں پر اُن کی بہت سی نظمیں ہیں۔ اُن میں سے بعض آئندہ نقل کی جائیں گی۔ نظیر کے علاوہ اور بہت سے مسلمان شعرا نے ہندوانہ موضوعوں سے دلچسپی لی ہے۔ میر ضیاءالدین عبرت شاہجہانپوری اور سید غلام مشہدی نے "پدماوت" کو اُردو نظم کے قالب میں ڈھالا۔ زمانۂ حال کے شعرا میں مسلسل نظموں کا مذاق زیادہ ہے، اس لئے ان کے یہاں اس قسم کی نظمیں بہت ملتی ہیں۔

خوشی محمد خاں ناظر نے ہندوانہ موضوعوں پر متعدد نظمیں لکھی ہیں۔ اور خوب لکھی ہیں ان میں "جوگی" درشن کے لائق ہے۔ یہ نظم بہت طویل ہے۔ لیکن ایک دو بند نقل کیے بغیر آگے بڑھنے کو دل نہیں چاہتا۔ ایک جوگی دنیا کے ہنگاموں سے الگ گوشہ نشین ہے، ایک دنیادار اس کے پاس پہونچتا ہے، جوگی اُسے دیکھ کر یوں مخاطب ہوتا ہے :۔

کیوں بابا ناحق جوگی کو تم کس لیئے آکے ستاتے ہو
ہیں پنکھ پکھیرو بن باسی تم جال میں اُن کو پھنساتے ہو
کوئی جھگڑا دال چپاتی کا کوئی دعویٰ گھوڑے ہاتھی کا
کوئی شکوہ سنگی ساتھی کا تم ہم کو آکے سناتے ہو
ہم حرص و ہوا کو چھوڑ کے اس نگری سے منہ موڑ چکے
ہم جو زنجیریں توڑ چکے تم لا کے وہی پہناتے ہو
تم پوجا کرتے ہو دھن کی ہم سیوا کرتے ہیں ساجن کی
ہم جوت لگاتے ہیں من کی تم اُس کو آکے بجھاتے ہو
سنسار سے یاں مکھ پھیرا ہے من میں ساجن کا ڈیرا ہے
یاں آنکھ لڑی ہے پیتم سے تم کس سے آنکھ ملاتے ہو

دنیادار اُس کو شہر میں چل کر رہنے کی ترغیب دلاتا ہے۔ جوگی جواب دیتا ہے :۔

ان چکنی چپڑی باتوں سے مت جوگی کو بہلا بابا
جو آگ بجھائی چتون سے پھر اس پہ نہ تیل گرا بابا

ہے شہروں میں غل شور بہت اور کام کرودھ کا زور بہت
بستے ہیں نگر میں چور بہت سادھو کی ہے بن میں جا بابا

ہے شہر میں شورش نفسانی جنگل میں ہے جلوہ روحانی
ہے نگری ڈگری کثرت کی بن وحدت کا دریا بابا

ہم جنگل سے پھل کھاتے ہیں چشموں سے پیاس بجھاتے ہیں
راجہ کے نہ دوارے جاتے ہیں پرجا کی نہیں پروا بابا

سر پر آکاش کا منڈل ہے دھرتی پہ سہانی مخمل ہے
دن کو سورج کی محفل ہے شب کو تاروں کی سبھا بابا

جب پنچھی مل کر گاتے ہیں پیتم کے سندیس سناتے ہیں
سب بن کے برچھ جھک جاتے ہیں تھم جاتے ہیں دریا بابا

ہے حرص و ہوا کا دھیان تمہیں اور یاد نہیں بھگوان تمہیں
سل پتھر اینٹ مکان تمہیں دیتے ہیں یہ راہ بھلا بابا

پرماتما کی وہ جا ہی نہیں اور روح کو دل میں راہ نہیں
ہر بات میں اپنے مطلب کے تم گڑھ لیتے ہو خدا بابا

تن من کو دھن میں لگاتے ہو ہری نام کو دل سے بھلاتے ہو
ماٹی میں لعل گنواتے ہو تم بندۂ حرص و ہوا بابا

دھن دولت آنی جانی ہے یہ دنیا رام کہانی ہے
یہ عالم عالم فانی ہے باقی ہے ذات خدا بابا

ہماری نظم میں ایسا ہی موقع اور دلپذیر مکالمہ ہے، اس لیے اس نظم کی

ہندویت کا اندازہ ہو گیا ہوگا۔ اس نظم کے علاوہ انھوں نے "ہیر و رانجھا" ایک مختصر مثنوی بھی لکھی ہے۔

ناظر کے جوگی کے ذکر کے سلسلے میں مثنوی "بدر منیر" کی جوگن یاد آ گئی لیکن ایک صاحب دل درویش کی زیارت کے روحانی اثرات کو ایک دنیا دار نوخیز اور حسین جوگن کا روپ دکھا کر زائل کرنا مناسب نہیں معلوم ہوتا۔ ناظرین اُس سے خود واقف ہوں گے۔

اس زمانے کے سب سے بڑے اسلامی شاعر سر "اقبال" نے گرو نانک سوامی رام تیرتھ اور شیوالہ وغیرہ پہ مستقل نظمیں لکھی ہیں اور اپنے کلام میں بزرگان اسلام کے ساتھ ساتھ ہندو مذہب کے اکابر کا نام بھی عقیدت کے ساتھ لیا ہے :-

"چشتی" نے جس زمیں میں پیغام حق سُنایا

"نانک" نے جس چمن میں وحدت کا گیت گایا

"گوتم" کا جو وطن ہے جاپان کا حرم ہے

"عیسیٰ" کے عاشقوں کا چھوٹا یروشلم ہے

نئے دور کے بہت سے مسلمان شعرا نے ہندوانہ موضوعوں پر نظمیں لکھی ہیں۔ لیکن اُن سب کا استقصا مقصود نہیں ہے۔ اس کی شہادت ماہانہ ادبی رسائل سے مل سکتی ہے۔ ہندوستان کے ہندو لیڈروں کی وفات پر ہندوؤں کے ساتھ مسلمان شعرا نے بھی پُر زور مرثیے لکھے۔ اس طرح نظم میں ہندو اکابر کا ایک منظوم تذکرہ ہو گیا ہے۔

ہندو تہوار | ہندو تہوار درحقیقت ہندو مذہب کا جزو ہیں۔ ان میں سے ہر تہوار خصوصاً بسنت، ہولی اور دسہرے پر بکثرت نظمیں موجود ہیں۔ بلکہ بسنت اور ہولی کی بہار تو اُردو شاعری کی تشبیہ اور استعارے میں داخل ہوگئی ہے۔

ناسخ:۔ ہجوم رکھتے ہیں جانباز یوں ترے آگے
جواریوں کا دِوالی میں جیسے جمگھٹ ہو

جانصاحب:۔ ہے جگائی ہوئی دِوالی کی
تھر ہے تیرے پاندان میں لونگ

آتش:۔ خاک شہید ناز سے اب ہولی کھیلئے
رنگ اس میں ہے گلال کا بو ہے عبیر کی

شاہ حاتم:۔ ہولی کے اب بہانے چھڑکا ہے رنگ کس نے
نام خدا تجھ اوپر اس آن عجب سماں ہے

یقین:۔ اُس بسنتی پوش سے اے خوش رنگیں کیجیے
جی میں ہے اک مصرعۂ رنگیں کو تضمیں کیجیے
دل مرا تم کو لنکا ہے دسہرہ کی بتاں
فتح ہے سال بھر اس کی جو اسے لوٹے گا

ہولی اور بسنت پر تو مستقل نظمیں ہیں۔

ہندوستان میں ہولی کی بہار بڑی جنوں خیز اور ولولہ انگیز ہوتی ہے اس موسم میں ہندو تو ہندو اچھے خاصے سنجیدہ مسلمان تک عبیر و گلال اُڑانے لگتے ہیں بعض رنگین مزاج مسلمان سلاطین تک ہولی کھیلتے تھے جس کے چھینٹے

شعرا کی زبان سے رنگین شعر بن کر اُڑتے تھے۔ چنانچہ میر جیسے خستہ دل اور خستہ جگر بھی، جن کی زبان سے آہ کے سوا واہ کم نکلتی ہے، آصفی دربار میں عبیر و گلال کے چھینٹوں سے نہ بچ سکے۔ ایک طرف اُن کے نشتر کدے کو دیکھئے، دوسری طرف یہ رنگینی ملاحظہ فرمائیے:۔

پھر لبالب ہیں آبگیرے رنگ	اور اُڑے ہے گلال کس کس ڈھنگ
پاس آتے ہیں مُرغ گلشن بھول	تھے وہ دلبر گلاب کے سے پھول
پگڑیاں جامے بھیگے سو سو ہیں	ان کو گلکارے تر کہیں تو کہیں
چھڑیاں پھولوں کی دلبروں کے ہاتھ	سیکڑوں پھولوں کی چھڑی ہے ساتھ
قمقمے بھر گلال جو مارے	مہ وشاں لالہ رُخ ہوئے سارے
خوان بھر بھر عبیر لاتے ہیں	گل کی پتی بنا اُڑاتے ہیں
جشن نوروز ہند ہولی ہے	راگ رنگ اور بولی ٹھولی ہے

میر کی اس ہولی پر دوسرے شعرا کی ہولیوں کی رنگینی قیاس کی جا سکتی ہے۔

اُردو شاعری میں بسنت کی بہار بھی قابلِ دید ہے۔ امانت اور انشا وغیرہ متعدد شعرا نے پوری پوری غزلیں بسنت پر کہی ہیں۔ امانت کے بسنت کی بہار ملاحظہ ہو:۔

ہیں جلوۂ تن سے در و دیوار بسنتی	پوشاک جو پہنے ہے مرا یار بسنتی
کیا فصلِ بہاری نے شگوفے ہیں کھلائے	معشوق ہیں پھرتے سر بازار بسنتی
گیندا ہے کھِلا باغ میں میدان میں سرسوں	صحرا وہ بسنتی ہے، یہ گلزار بسنتی

گیندوں کے درختوں میں نمایاں ہیں گیندے — ہر شاخ کے سر پہ ہے یہ دستار بسنتی
رُت پھر گئی عالم میں چلی بادِ بہاری — میخانوں کو سجواتے ہیں میخوار بسنتی
ہے لطف حسینوں کی دو رنگی کا امانت — دو چار گلابی ہوں تو دو چار بسنتی

دوالی کا تماشا نظیر اکبر آبادی کی زبان میں دیکھیے :-

جہاں میں یارو عجب طرح کا ہے یہ تیوہار
کسی نے نقد لیا اور کوئی کرے ہے اُدھار
کھلونے، کھیلوں، بتاسوں کا گرم ہے بازار
ہر اک دکاں میں چراغوں کی ہو رہی ہے بہار
مٹھائیوں کی دکانیں لگا کے حلوائی
پکارتے ہیں کہ "لالہ دوالی ہے آئی"
بتاسے لے کوئی، برفی کسی نے تُلوائی
کھلونے والوں کی اُن سے بھی زیادہ بن آئی

یہ نظم بہت طویل ہے ہم نے صرف چند شعر بطور نمونہ نقل کیے ہیں۔

شادی اور غمی کی ہندوستانی رسموں کے اثرات

مسلمانوں میں شادی غمی وغیرہ کی تقریبات میں جو ہندوانہ اور ہندوستانی رسمیں سرایت کر گئی ہیں اس کا اثر اردو شاعری میں اتنا گہرا ہے کہ مثنویوں اور متفرق اشعار سے ہندوانہ اور ہندوستانی مراسم کی پوری فہرست مرتب کی جا سکتی ہے بعض موٹی موٹی رسموں کی مثالیں پیش کی جاتی ہیں۔

ایک بادشاہ کے محل میں آثارِ حمل نمودار ہوتے ہیں، پنڈت پوتھی بچار کر کے مولودِ مسعود کی خبر دیتے ہیں۔

کہا پنڈتوں نے جو اپنا بچار — تو پھر انگلیوں پر کیا کچھ شمار
جنم پتر اس شاہ کا دیکھ کر — تولا اور برچھک پر کر نظر
کہا رام جی کی ہے بجھ پر دیا — چندرماں سا بالک ترے ہووے گا
نکلتے ہیں اب تو خوشی کے بچن — نہ ہو گر خوشی تو نہیں برہمن

(مثنوی بدر منیر)

ایک بادشاہ کے گھر لڑکا پیدا ہوتا ہے۔ نجومی زائچہ مرتب کر کے بتلاتے ہیں۔

جمع ہو کر نجومی و رمال — آئے پیشِ شہِ خجستہ خصال
غور کر کے جو ہم نے دیکھا ہے — اپنی پوتھی سے پایا جاتا ہے
کہ یہ لڑکا بڑا گنی ہے گا — سب طرح اس پہ رام کی ہے دیا
سکھ سے یہ راج پر براجے گا — سامنے اس کے ڈنکا باجے گا

(طلسم الفت)

دوسری مثال:۔

پھر بلا کر نجومی و رمال — پوچھا اُس رشکِ ماہ کا احوال
زائچہ کھینچ کر کہا سب نے — بے تکلف وزیرِ اعظم سے
کہ یہ بالک مہا منی ہو گا — تھوڑے ہی کال میں گُنی ہو گا
بے گماں اس نگر میں راج کرے — اور نہایت سکھ کا کاج کرے

نیگ ہو آپ کا یہ شتر ضرور
کشٹ دے آپ کو یہ تا مقدور

اس بلا کو نرت آپ کریں
اور بچن پر ہمارے کان دھریں

یہ بچن ست ست ہمارا ہے
نہیں متھا کا کچھ اشارا ہے

(مثنوی مہر تاباں)

چھٹی :-

اس تکلف سے کی چھٹی اُس نے
بے حقیقت تھا جشنِ جمشیدی

خلعت اُس کو دیا بہت بھاری
کی چھٹی کی کمال تیاری

(طلسم الفت)

تقریب کے لئے نیک ساعت ٹھہرانا :-

بلا سگنیوں کو بتا سال و سن
مقرر کیا نیک ساعت کا دن

(بدر منیر)

سیتارہ شناس کو بلایا
ساعت ٹھہرائی دن دکھایا

(گلزار نسیم)

دلہن مانجھے بیٹھتی ہے اور دولھا کو مانجھا جاتا ہے :-

گلشن آرا کو مانجھے بٹھلایا
اُدھر اُس کو بھی مانجھا بھجوایا

پھر تو ہر سو تھا تہنیت کا خروش
سب زن و مرد تھے بسنتی پوش

(طلسم الفت)

ساچق آتی ہے :-

ساچق اس دھوم دھام سے لایا
کہ پئے سیر سارا شہر آیا

(طلسم الفت)

(جان صاحب) جان صاحب آئی، لو شادی ہے بیگم جان کی
آج ساچق، کل ہے مہندی، پرسوں اُس کا بیاہ ہے

بارات کی آرائش :-

وہ دولھا کے اُٹھتے ہی اک غل پڑا | لگا دیکھنے اُٹھ کے چھوٹا بڑا
کوئی دوڑ گھوڑوں کی لانے لگا | کوئی ہاتھیوں کو بٹھانے لگا
کسی کو کسی نے پکارا کہیں | نہ لانے پہ میانے کے مارا کہیں
کوئی پالکی میں چلا ہو سوار | پیادوں کی رکھ اپنے آگے قطار
جو کثرت میں دیکھا کہ گاڑی نہیں | کوئی مانگے تانگے پہ بیٹھا کہیں
ٹکورے وہ نوبت کے اور ان کے بعد | گرجنا وہ دھونسوں کا مانند رعد
وہ شہنائیوں کی سہانی دھنیں | جنھیں گوش زہرہ مفصل سنیں
ہزاروں تماشی کے تختے رواں | اور اہل نشاط اُن پہ جلوہ کناں
وہ طبلوں کا بجنا، وہ ان کی صدا | وہ گانا کہ "اچھا بنا لاڈلا"
وہ نوشہ کا گھوڑے پہ ہونا سوار | وہ موتی کا سہرا جواہر نگار
ٹھنک کر وہ گھوڑے کا چلنا سنبھل | ہما کے وہ دونوں طرف مورچھل
چراغوں کے ترپولیے جابجا | اور اُن میں وہ بازاریوں کی صدا
کوئی پان بیچے، کھلونے کوئی | کوئی دال موٹھ اور سلونے کوئی
براتی ادھر اور اُدھر جوق جوق | وہ آواز قرنا وہ آواز بوق
وہ آرائش اور گل کئی رنگ کے | وہ ہاتھی تھے یا دیو تھے جنگ کے
وہ ابرق کی ٹٹی وہ مینے کے جھاڑ | کہے تو کہ تنکے کے اوجھل پہاڑ

دو دستہ برابر برابر درخت
کسی پر کنول اور کسی پر درخت

اناروں کا دغنا بھچپے کا زور
ستاروں کا چھٹنا پٹاخوں کا شور

اُڑایا ستاروں کو جو آگ نے
تو ہاتھی لگے بن سے پھر بھاگنے

(بدر منیر)

یہ نظم بڑی طویل ہے۔ ہم نے صرف چند شعر نقل کئے ہیں۔ ان کی ہندوستانیت ظاہر ہے۔

دُلہن کا سنگار۔ دُلھن ہر ملک میں سنواری جاتی ہے، کچھ ہندوستان کے ساتھ مخصوص نہیں ہے لیکن ہر ملک کا سنگار جدا جدا ہے۔ ہندوستانی دُلھن کا سنگار ملاحظہ ہو:—

عجب صورت سے کی بالوں میں تنگھی
کہ بکھرا دیکھ کر ہر ایک کا جی

کھجوری گوندھی وہ پاکیزہ چوٹی
کہ سب اہل نظر کی جان لوٹی

جب اُس کی موتیوں سے مانگ بھر دی
فلک نے کہکشاں قربان کر دی

جو ٹیکا اُس کے ماتھے پر لگایا
قمر نے اپنے دل پر داغ کھایا

وہ آنکھیں بند کرنا بھی ادا تھی
چھپی مژگاں میں پوشیدہ حیا تھی

جب اس کے کان میں جھمکا پنھایا
پریشاں ہو گیا عقدِ ثریا

پہن کر نتھ خوشی سے رنگ دمکا
وہ مکھڑا چاند سا گھونگھٹ میں دمکا

مسی آلودہ دنداں پیارے پیارے
چمکتے تھے شبِ یلدا میں تارے

بنایا خال کاجل کا ذقن پر
عجب جوبن تھا اس رشکِ قمر پر

چڑھی منھ پر دلھن کے ایسی سیلی
کہ پھیکی پڑ گئی نظروں میں شیریں

گلے میں پہنا جب موتی کی مالا
بنات النعش کو حیرت میں ڈالا

بہت اس کے سوا بھی اور گہنا — مناسب جس جگہ تھا اُس کو پہنا

شادی کا گانا :-

جوڑی جو ملی بنا بنی کی — سنگت ہوئی راگ راگنی کی
جو گائیں تھیں شہانے لائیں — لیتے ہوئے نیگ رنگ لائیں
حق پا کے جو رکھتی تھیں ندامت — بول اُٹھیں مبارک و سلامت
(گلزار نسیم)

مختلف رسمیں :-

وہ مبارک سلامت اور وہ رسوم — اور وہ میراثنوں کے گانے کی دھوم
گالیاں سمدھنوں کو دینا گاہ — ناز و غمزے سے بیل لینا گاہ
کوئی کہتی تھی نیگ دلواؤ — واری جاؤں مری نچھاور لاؤ
(طلسم الفت)

پھر وہ رسم و ریت کا ہونا — دل پہ نشتر زن اک اک ٹونا
دمبدم وہ نبات چُننا زہر — چھیڑنا سالیوں کا اک اور قہر
ریت رسموں سے جب فراغت پائی — پھر تو میراثنوں نے بدھائی گائی
(طلسم الفت)

دوسری مثال :-

رکھا مصحف اور آرسی کو نکال — دھرا بیچ میں سر پہ آنچل کو ڈال
وہ جلوے کا ہونا وہ شادی کی دھوم — وہ آپس میں دولہا دلھن کے رسوم
کسی نے لپاٹی سر رنج آن کر — کوئی گالیاں دے گئی جان کر
سہاگا گئی کان کو کوئی لگا — گئی کوئی دولہن کہ جوتی چھپا

ڈلی وہ جو ہونٹوں کی تھی لب ملی — وہ مصری کی مُنہ سے اُٹھائی ڈلی
وہ سب ہو چکیں جب کہ رسم و رسوم — سواری کی ہونے لگی پھر تو دھوم
سحر کا وہ ہونا وہ ٹونے کا وقت — وہ دُولہن کی رخصت وہ رونے کا وقت
وہ دولہن کا رُو رُو کے ہونا جُدا — وہ ماں باپ کا اور رونا جُدا
وہ دولہا نے دولہن کو گودی میں لا — بٹھایا محافے میں آخر کو لا

(بدر منیر)

سہرا — سہرا خاص ہندوستان کی رسم ہے۔ اس رسم نے اُردو شاعری میں ایک خاص صنف پیدا کر دی جو اسی نام سے موسوم ہے۔ غالب اور ذوق وغیرہ کے سہرے اتنے مشہور ہیں کہ اُن کے نقل کرنے کی ضرورت نہیں۔

موت کی رسومات — شادی کی رسومات کی طرح موت کی رسومات بھی ہیں رنڈسالہ، تیجہ، چالیسی، چھ ماہی اور برسی وغیرہ۔

کہیں یہ بیاہ کا دیکھا ہے معمول — کہ شہ کی چوتھی کے تیجے کے ہوں پھول

(منیر)

کیا سٹرن نے ہے چالیسواں بسنت کے روز — نکالی قیس کی لیلیٰ نے کس بہار میں روح

(جان صاحب)

رسم ہے مردہ کی چھ ماہی کی — خلق کا ہے اسی چلن پہ مدار
مجھ کو دیکھو تو ہوں بقید حیات — اور چھ ماہی ہو سال میں دو بار

(غالب)

رنڈاپا — بیوگی یا رنڈاپا ہر ملک کی عورت کے لئے بڑی مصیبت ہے۔ خصوصاً ہندوستان کی عورتوں کے لئے موت سے بھی بدتر ہے، کہ یہاں کی

عورتیں شوہر کی موت کے بعد زندہ درگور ہو جاتی ہیں۔ اس لئے قدیم زمانے میں وہ زندہ رہنے کے مقابلے میں شوہر کے ساتھ جل کر مر جانے کو ترجیح دیتی تھیں۔ اسی لئے ہندوستان میں رنڈاپے نے ایک رسم کی شکل اختیار کر لی ہے اور اس کے اثرات اُردو شاعری میں ملتے ہیں۔

چوڑیاں توڑیں نتھ بڑھا ڈالی ۔۔۔ مسی ہونٹوں سے بھی چھڑا ڈالی
سارا اوپنا اُتار کر گہنا ۔۔۔ جوڑا رنڈ سالے کا غرض پہنا

ستی ہونے کی رسم پر بھی اُردو میں نظمیں موجود ہیں جو خالص ہندوانہ رسم ہے۔

ہندو اور مسلمان بیواؤں کے مصائب اور ان رسوم کی اصلاح کے سلسلے میں اُردو میں بکثرت نظمیں لکھی گئیں اور اب تک رسالوں میں نکلتی رہتی ہیں، ان میں مولانا حالی کی مناجات بیوہ بہت مشہور و مقبول ہے۔

یہ رسمیں اُردو شاعری کا ایسا جز بن گئی ہیں کہ ان سے مراثی بھی جو ایک مسلمان طبقے کا مذہبی لٹریچر ہے، خالی نہیں۔ حضرت قاسم کے مرثیوں میں شادی اور غمی دونوں کے مراسم ملتے ہیں۔ سودا کے مراثی میں خاص طور سے یہ اثرات زیادہ نمایاں ہیں۔ بعض متفرق اشعار ملاحظہ ہوں۔

وہ بنرا جس کو سب کہتے تھے قاسم ۔۔۔ وہ بنرا تھے ملائک جس کے خادم
نہ دیں دولھا کو ہرگز قطرۂ آب ۔۔۔ اجل بھی نیگ لے شربت پلائی
منڈھے کا چاہنا کب ہو میسر ۔۔۔ نہیں چادر کسی سہاگن کے سر پر
دھری تھی بیاہ کے خوں سے لگن بھر ۔۔۔ کہیں کنگنا کے بندھتے ہی کلائی

کسی ساچق کا دیکھا ہے یہ آئیں — کٹم کے سر کٹا کے مٹکیاں کیں
بنائیں کھانچیاں تیروں پہ دھر لیں — چلے دولھا کے گھر سے یوں اٹھائی
ہوا برہم زن شادی تو یہ ذات — گئی اس بیاہ میں مہندی کی یوں رات
کیے مہندی کی شب عنبری نے یہ ہات — بنے کے خون سے بنجے حنائی
کہیں دیکھا کہ دولھن کی قضا نے — لیا ہو نیگ سر سہرا بندھائی
کہیں یوں بیاہ میں گائے بدھائے — کہ ہر اک نوحہ گر نوحہ کو آئے

شادی اور غمی کی رسموں میں یہ چند رسمیں بطور نمونہ دکھائی گئی ہیں، ورنہ کوئی رسم ایسی نہیں ہے جو مثنویوں میں موجود نہ ہو جناب واقف لکھنوی نے کنور دھنپت رائے کی شادی کے سلسلے میں ہندوانہ مراسم شادی پر ایک مستقل مثنوی "بہارستان شادی" لکھ ڈالی ہے۔ گو یہ مثنوی ایک ہندو نے لکھی ہے اور ایک ہندو کی شادی پر، لیکن بہرحال ہے وہ اردو زبان میں۔

مختلف موقعوں کے مراسم

ہر قوم میں مختلف موقعوں پر بطور شگون بعض مراسم ادا کیے جاتے ہیں۔ چنانچہ اس قسم کے ہندوانہ مراسم بھی مثنویوں میں موجود ہیں

مسافر کی رخصتی کے مراسم :-

کوئی چٹ چٹ بلائیں لیتی تھی — کوئی ٹیکا دہی کا دیتی تھی
کوئی ماتھے پہ کچھ چھواتی تھی — کوئی رو کر یہ لب پہ لاتی تھی

کوئی جا کر کہیں نکھرنے لگی — کوئی دروازہ بند کرنے لگی
بولی اک نیگ پہلے لوں گی — تب میں دروازہ کھولنے دوں گی
کوئی بولی سیاہ کوا منگاؤ — کوئی بولی کہ چوڑی والی بلاؤ
لوگوں کو تم نہ اتنا گھبراؤ — کوئی سوہا دوپٹہ لا کے اڑھاؤ
تاکہ اس وقت رسم تو ہو جائے — دل میں وسواس تو کسی کے نہ آئے
بولی اس سے پرے شگون اک حور — ناک میں نتھ تو ڈال لیجئے حضور

توہمات | کچھ نہ کچھ توہمات اور ٹونے ٹوٹکے ہر قوم میں ہوتے ہیں اور ہندوستان میں تو ان کی افراط قدم قدم پر ہے۔ بعض توہمات اور ٹونے ٹوٹکوں کی مثالیں درج ہیں۔

۱۔ سیب کا خلل :۔

کھو بیٹھے ہوئے ہو گیا حضرت — فال کھلوائیے ذرا حضرت
پوچھئے دونوں وقت ملتے ہوئے — کیا گیا تھا کسی شجر کے تلے
حاضراتیں ہوئیں اُتارے ہوئے — ٹوٹکے بھی جہاں کے سارے ہوئے
پھر تو صدقے اُتارے ہونے لگے — زر انعام لوگ ڈھونے لگے
جا بجا سے تصدق آنے لگے — عزباتیل مانشس پانے لگے

نہ شدھ بدھ کی کی لی اور نہ منگل کی لی
نکل شہر سے راہ جنگل کی لی

مسافر کے بخیریت واپس آنے کی منت :۔

میں اُسی وقت دل گھبرا دونا — پیر دیدار کا کر دل کو نڈا

مانتی تھی کوئی پری بیٹھک اور کوئی حور، رت جگا صحنک (قلق)

سیتلا پوجنا :-

باجی بُرا نہ مانو اس اولاد کے لئے
پوجی ہے سیتلا جو کبھی دانہ ہو گیا (جان صاحب)

دوالی کے بعض سحر :-

ہے جگائی ہوئی دوالی کی
قہر ہے اس کے پاندان میں لونگ (جان صاحب)

بھاگوان تل :-

مرے جو نکلا ہے تل بھاگوان، جلتی ہے
میں دل کو سوت کے کیوں کر کہوں پسند نہیں (جان)

اس قسم کے اشعار بکثرت ہیں۔ چونکہ توہم پرست زیادہ تر عورتیں ہی ہوتی ہیں، اس لئے ریختی میں اس کی مثالیں بہت ہیں۔

ہندوانہ زیورات — آج یہ فیصلہ کرنا مشکل ہے کہ کون سے زیورات ہندوانہ ہیں اور کون سے مسلمانوں کے؟ لیکن اگر ناموں کی ہندویت زیوروں کے ہندوانہ ہونے کا ثبوت ہو سکتی ہے تو اُردو شاعری میں پورا ہندوانہ سنگار دان موجود ہے۔

چوٹی یہ شجر کی دام رکھا ❊ چھپکا کہنے کو نام رکھا
دکھلاتا تھا لیس پھول سر پر ❊ جگنو شب تار میں شجر پر
ٹیکا زینت کا زیب سر تھا ❊ انساں کا ستارہ اوج پر تھا

گھنگرو چھن چھن بجائے اس نے — سوتے فتنے جگائے اس نے

(مرزا شوق)

میں کس کو دکھاؤں گی سنگار اب — جھومر نہ ہو میرے سر کا بار اب
گردن مری چھوڑ چپلڑی تو — کیوں ہو کے بلا گلے پڑی تو
ہاتوں کو ہیں چوہے دتیاں خار — تپے واللہ ہو گئے بار
زنجیر ہے سلسلہ فسوں کا — بجلی نے بدن تمام پھونکا
ہاتھ آج جو کنگنوں سے چھوٹیں — پھر میں پہنوں تو ہاتھ ٹوٹیں
اکون کو لگاؤں آگ جل جائیں — ٹھکراؤں کہ چھاگلیں نکل جائیں
بانکیں کیا ہیں کٹاریاں ہیں — بندے کہ سبک تھے اب گراں ہیں
آخر ماتھے سے میرے چھوٹا — ٹیکے کا نصیب اب تو پھوٹا
ستلڑی میں ہر ایک دریتیم — جس کی قیمت خراج ہفت اقلیم
گرد اُس کے ہر ہی زمرد کی — بیچ میں تختیاں زبرجد کی
ہاتھ وہ سمرنوں میں وہ پرتاب — جیسے ہالہ میں جلوۂ مہتاب
چھلّے پوروں پہ تھے کے نازک — وضع میں ساخت میں کمال سبک

غالباً سر سے لے کر پانوں تک کا کوئی زیور باقی نہیں رہ گیا ہے۔

موسیقی یعنی سانا ناچ اور گانا وغیرہ | اسلام کا سانا تو بے نغمہ ہے بلکہ اس میں سانا ہی نہیں۔ اسلامی تعلیم میں ناچ گانا وغیرہ حرام ہے

گانوں میں لے دے کر حدی اور رجز اور آلات موسیقی میں دف ہے لیکن اس کو موسیقی سے کیا نسبت!

اس موقع پر ایک لطیفہ یاد آگیا۔ ہندوستان کا ایک قوال حج کو گیا۔ اتفاق سے کسی بدو کو حدی پڑھتے سنا۔ سنتے ہی ہاتھ اٹھا کر کچھ بڑبڑانے لگا۔ لوگوں نے پوچھا یہ کیا؟ بولا پیغمبر صاحب سے عرض کر رہا تھا کہ قربان جاؤں، یہ گانا حرام ہی کرنے کے قابل تھا! خدا بھلا کرے صوفیائے کرام کا کہ انھوں نے گرمی قلب کا کچھ سامان پیدا کر دیا۔ ورنہ خوش مذاق فقہا نے تو اس فن لطیف کو ملیا میٹ کرنے میں اپنے مقدور بھر کوئی کسر اٹھا نہ رکھی تھی۔

بہر حال اگرچہ اسلام میں موسیقی حرام ہے لیکن عجمی مسلمانوں کو اس کا موروثی ذوق رہا ہے۔ اس ذوق کو وہ ہندوستان بھی ساتھ لائے۔ ہندوستان کو دنیا کا میوزک کالج کہنا چاہیے۔ آج بھی جب کہ ترقی یافتہ قوموں نے موسیقی کو معراج کمال تک پہونچا دیا ہے، غالبا دنیا کی کوئی قوم اس میں ہندوستان کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔ موسیقی تو ہندو مذہب میں جزو عبادت ہے، اس لئے ایرانی مسلمانوں نے عجمی نغموں کو ہندی گیتوں سے ملا کر ایسے سامعہ نواز نغمے پیدا کیے کہ آج تک اردو شاعری میں اس کی تانیں سنائی دیتی ہیں۔

آلات موسیقی :—

بین کاروں کا سردست مقدر چمکا — سر سے سارنگیوں کے نور برابر چمکا
آئے جو طبلہ نواز ان کا بھی اختر چمکا — جو مجیرہ تھا وہ مثل مہ انور چمکا
سامنے آئے وہ ناٹک جو کتنے سبھی ہمہ جا — حاضر بزم ہوئے کتنے پکھاوج والے

گانا:-

جان صاحب نے ایک طوائف "حسین باندی" کے گانے کی تعریف میں گانے کی بہت سی قسمیں اور اُن کے لوازم ایک غزل میں جمع کر دیے ہیں۔

عالم میں ہو رہا ہے کیا کیا حسین باندی
صوت حسن سے تیری شہرہ حسین باندی

ترووٹ، ترانہ، دھرپت، ٹپہ، خیال، ٹھمری
جو تو نے گایا، اچھا گایا، حسین باندی

مرکی گلے میں کھٹکا، ہے زمزمہ عجائب
ہے بلبل خوش الحاں گویا حسین باندی

لے، تال، سُر اور سم ہیں، لونڈی غلام تیرے
قابو میں تیرے پایا سب کو حسین باندی

امیر مینائی فرماتے ہیں:-

ٹپے والوں نے کیا بزم میں اظہار کمال
ٹھمریاں گائیں کسی نے تو ہوا مالامال
وہ بھی موجود ہوئے خوب جو گاتے تھے خیال
آئے وہ دھرپتی بھی جو کہ نہ رکھتے تھے مثال

ناچ:-

وہ ناچنے کیا کھڑی ہوئی تھی
خود راگنی آ کھڑی ہوئی تھی

رقص اُس کا اگرچہ خوشنما تھا
سنگت کا بھاو جی تھکا تھا

اُس نے جو پکھاوج اس کو دیدی
کیفیت، اتفاق نے دی

تھا سِم پہ، اُس پری کا نقشہ
سب آنکھ ملا کے کہتے تھے، آ

محفوظ کیا جو سب کو اک بار
بخشا راجہ نے نولکھا ہار

انداز سے اُس نے لے کے مالا
کاندھے پہ پکھاوجی کے ڈالا

(گلزارِ نسیم)

بزم رقص و سرود :-

کیا بھانڈ اور بھگتیوں نے ہجوم
ہوئی آ ہے آ ہے مبارک کی دھوم

جہاں تک کہ سازندے تھے ساز کے
دھنی دست کے اور آواز کے

جہاں تک کہ تھے گائت اور رہنکار
لگے گانے اور ناچنے ایک بار

لگے بجنے قانون و بین و رباب
بہا ہر طرف جوئے عشرت کا آب

لگی تھاپ طبلوں کی مردنگ کی
صدا اونچی ہونے لگی چنگ کی

کماچوں کو سارنگیوں کو بنا
خوشی سے ہر اک ان کی تربیں ملا

لگا موم تاروں پہ مُنھ چنگ کے
ملا سُر طنبوروں کے مردنگ سے

ستاروں لگے پردے بنا کر درست
بجانے لگے سب وہ چالاک و چست

خوشی کی دبس ہر طرف تھی بساط
لگے ناچنے اُس پہ اہلِ نشاط

کناری کے جوڑے چمکتے ہوئے
وہ پاؤں کے گھنگھرو چھنکتے ہوئے

وہ بالے چمکتے ہوئے کان میں
پھڑکنا وہ نتھنے کا ہر آن میں

وہ گھٹنا وہ بڑھنا اداؤں کے ساتھ
دکھانا وہ رکھ رکھ کے چھاتی پہ ہاتھ

کبھی دل کو پاؤں سے مل ڈالنا
نظر سے کبھی دیکھنا بھالنا

دکھانا کبھی اپنی چھب مسکرا　　کبھی اپنی انگیا کو لینا چھپا
کبھی منھ کے تئیں پھیر لینا ادھر　　کبھی چوری چوری سے کرنا نظر
ڈپٹے کو کرنا کبھی منھ کے اوٹ　　کہ پردے میں ہو جائے دل لوٹ پوٹ
کوئی فن سنگیت کے شعلہ رو　　پریم جوگ چھبی لیے بہ ملو
کوئی ڈھیٹ گت ہی میں پاؤں تلے　　کھڑی عاشقوں کے دلوں کو ملے
کوئی دائرے میں بجا کر بہ لن　　کوئی دمدمے میں جتا اپنا فن
کہیں دھرپت اور گیت کا شور و غل　　کہیں قول و قلبانہ و نقش و گل
کہیں بھانڈ اور لولیوں کا سماں　　کہیں ناچ کشمیریوں کا وہاں
مجیرا پکھاوج گلے ڈال ڈھول　　بجاتے تھے اس جا کھڑے باندھ غول
چھٹی تک غرض تھی خوشی ہی کی بات　　کہ دن عید اور رات تھی شب برات

ہندوستان کے جغرافی اثرات

اُردو شاعری جس طرح ہندوستان کی تہذیب و معاشرت کا آئینہ ہے اُسی طرح وہ ہندوستان کے جغرافی حالات کی بھی تصویر ہے۔ اس کا ایک رُخ آپ دیکھ چکے، اب دوسرا رُخ ملاحظہ فرمائیے۔

مسلمان، حکمراں کی حیثیت سے ہندوستان میں آئے، لیکن اجنبی حکمرانوں کی طرح انھوں نے اس کو تجارت کی منڈی نہیں سمجھا کہ ہزاروں کوس دور بیٹھے بیٹھے اُس کی دولت سمیٹتے، بلکہ اُس کو وطن بنا کر یہیں رس بس گئے۔ اکبر و شاہجہاں اسی خاک سے پیدا ہوئے اور اسی کی مٹی میں مل گئے۔ اس توطن کے ساتھ ایک حد تک انھوں نے یہاں کی تہذیب

بھی اختیار کرلی۔ اکبر کو جانے دیجئے۔ اورنگ زیب علیہ الرحمۃ جیسے مذہبی
فرمانروا کی تصویریں بھی اگر آپ غور کریں تو آپ کو ہندی تہذیب کے
نشانات نظر آئیں گے۔ اس تمہید کا منشا یہ ہے کہ مسلمان حکمرانوں نے
ہندوستان کو اپنا وطن بنالیا تھا۔ اس سے یہاں کی ہر چیز اُن کی اپنی
ہوگئی تھی۔ اور اُن کی پیدا کردہ تمام چیزوں میں اس کے اثرات نظر آتے
ہیں۔ چنانچہ اردو زبان میں بھی اس جنم بھوم کی بہاریں ہیں۔ اس کے کوہ
وصحرا، دشت وجبل، آب وہوا، موسمی کیفیتیں، باغ و بہار، پھل پھول،
چرند وپرند وغیرہ سب کی تصویریں ہم کو اُردو شاعری میں ملتی ہیں۔

یہ عجیب حیرت انگیز مغالطہ ہے، جس میں اچھے خاصے پڑھے
لکھے لوگ تک مبتلا ہیں کہ اُردو شاعری تمام تر فارسی کی نقالی ہے۔
غزل میں تو ایک فطری حد تک اس کو تسلیم کیا جاسکتا ہے۔ لیکن مستقل
اور مسلسل نظموں میں جو اس باب میں فیصلے کا معیار ہیں، ایرانی اثرات کا
نام ونشان نہیں مل سکتا۔ بلکہ یہاں تک کہا جاسکتا ہے کہ اُردو شاعری
میں ایران کے جغرافی حالات میں مشکل سے دو چار نظمیں مل سکیں گی، اور
اُن کی حیثیت ان نظموں سے زیادہ نہ ہوگی جو ہر زبان میں دوسرے
ملکوں کے متعلق پائی جاتی ہیں۔ اس کے مقابلے میں ہندوستان کی ہر چیز کے
متعلق اس کثرت سے نظمیں ہیں کہ اُن سے ہندوستان کا پورا جغرافیہ مرتب
کیا جاسکتا ہے۔

حُبِّ وطن کسی ملک کے ساتھ انس و تعلق کا ایک بڑا معیار حُبِّ وطن سے

اُردو شعرا کو ہندوستان کے ساتھ اس وقت سے شیفتگی ہے، اور اس زمانے سے وہ اس کی محبت کے ترانے گاتے چلے آ رہے ہیں، جب موجودہ قومی ترانے گانے والے پیدا بھی نہ ہوئے تھے، بلکہ وہ قومی ترانوں سے آشنا بھی نہ تھے۔ مولوی اسمٰعیل صاحب میرٹھی، مولانا حالی، نادر کاکوروی اور دوسرے بیسیوں شعرا کے حب وطن کے ترانے اس کے شاہد ہیں۔ موجودہ دور میں سر اقبال کا ترانہ بچے بچے کی زبان پر ہے۔ اس موقع پر ان کی نظم "نیا شوالہ" نقل کیے بغیر آگے بڑھنے کو جی نہیں چاہتا۔

سچ کہہ دوں اے برہمن گر تو بُرا نہ مانے
تیرے صنم کدوں کے بُت ہو گئے پُرانے
اپنوں سے بیر رکھنا تو نے بتوں سے سیکھا
جنگ و جدل سکھایا واعظ کو بھی خدا نے
پتھر کی مورتوں میں سمجھا ہے تو خدا ہے
خاکِ وطن کا مجھ کو ہر ذرہ دیوتا ہے
سونی پڑی ہوئی ہے مدت سے دل کی بستی
آ اک نیا شوالہ اس دیس میں بنا دیں
دنیا کے تیرتھوں سے اونچا ہو جس کا تیرتھ
دامانِ آسماں سے اُس کا کلس ملا دیں
ہر صبح اُٹھ کے گائیں منتر وہ میٹھے میٹھے
سارے پجاریوں کو مے ریت کی پلا دیں

شکتی بھی شانتی بھی بھگتوں کے گیت میں ہے
دھرتی کے باسیوں کی مکتی پریت میں ہے

دلی مرحوم کی تباہی پر جو ہندوستان کا قلب تھا ویسے ہی دردناک مرثیے لکھے گئے جیسے خلافت بغداد کی تباہی پر سعدی نے اور اسپین کی تباہی پر ابن بدرون نے لکھے تھے۔ اردو شاعری میں دلی کی تباہی سے اثرات، دلی کی حکومت ختم ہونے کے بہت پہلے سے پائے جاتے ہیں میر کا یہ شعر ؎

دلی جو ایک شہر تھا عالم میں انتخاب
ہم رہنے والے ہیں اسی اجڑے دیار کے۔

اسی تاثر کا نتیجہ ہے۔ مولانا حالی مرحوم فرماتے ہیں :۔

تذکرہ دلی مرحوم کا اے دوست نہ چھیڑ
نہ سنا جاوے گا ہم سے یہ فسانہ ہرگز

کسی اور نامعلوم شاعر نے نہایت دردانگیز مرثیہ لکھا، جس کا ایک شعر یہ ہے :۔

دے شہر دہلی یہ تھا چمن کہ تھا کہ سب طرح کا یہاں امن
وہ خطاب اس کا تو چھن گیا فقط اب تو اجڑا دیار ہے

اسی زمانے میں بہت سے شہر آشوب لکھے گئے۔ ان میں "سالک" دہلوی کا شہر آشوب لائق ذکر ہے۔

زمانہ حال کے سب سے بڑے شاعر سر اقبال کو "سواد رومۃ الکبری میں دلی یاد آتی ہے"

اس تفصیل کا یہ منشا ہے کہ اردو شعرا کو ہمیشہ سے ہندوستان کے ساتھ شیفتگی رہی ہے۔ اس سے اُن کے کلام میں فطرتاً اس کی بہاریں پائی جاتی ہیں۔

ہندوستان کے پہاڑ | ہندوستان کی عظمت کا ہمالیہ ہے۔ سر اقبال اس کی سربلندی اس طرح دکھاتے ہیں۔

پربت وہ سب سے اونچا ہمسایہ آسماں کا

وہ سنتری ہمارا وہ پاسباں ہمارا

انھوں نے تو ہندوستان کے پہاڑوں کو مقدس پہاڑ "کوہ سینا" کا ہم دوش بنا دیا۔

بندے کلیم جس کے، پربت جہاں کے سینا

نوح نبی کا ٹھہرا آ کر جہاں سفینہ

بہت سے شعرا نے ہندوستان کے پہاڑوں کے مناظر دکھائے ہیں مثلاً مولوی اسمٰعیل صاحب میرٹھی نے ہمالیہ، محمد حسین آزاد نے شملہ، چکبست نے دہرہ دون کے۔ کشمیر کی پر فضا پہاڑیوں کی بہاریں تو اتنے شعرا نے دکھائی ہیں کہ ان کا شمار مشکل ہے۔ مولانا حالی فرماتے ہیں۔

باغ جنت کا نہ انساں کو رہے کچھ انتظار | تھی بنانے سے غرض تیرے یہ اے باغ نعیم

تو نہیں دیتا بھٹکنے اپنے طالب کو کہیں | جنت اے کشمیر کوئی تجھ سی دنیا میں نہیں

سر اقبال نے بھی کشمیر کے مختلف مناظر دکھائے ہیں۔ اردو شعرا

تو اُردو شعرا، ایرانی نژاد فارسی شعرا تک کو کشمیر کی بہاروں نے ایسا بیخود کر دیا کہ وہ ایرانی مناظر کو بھول گئے۔ قدیم شعرا کے کلام میں بھی جابجا پہاڑوں کے نام ملتے ہیں۔ میر تقی میرؔ اور وزیر علی صباؔ کی صیدیہ مثنویوں میں جو انھوں نے سلاطین اور امرائے لکھنؤ کے شکار کے حالات میں لکھی ہیں، نیپال کی پہاڑیوں کے بکثرت مناظر ہیں۔

صحرا اب پہاڑوں سے اُتر کر صحرا کے دامن میں آئیے میرؔ اور صباؔ کی صیدیہ مثنویوں میں صحرا کی کیفیتیں بھی ہیں۔ نواب مرزا شوقؔ کی مثنویوں میں بھی کہیں کہیں یہ کیفیت نظر آتی ہے۔ موجودہ دور کے بہت سے شعرا، تلوک چند محروم، شوقؔ قدوائی اور بے نظیر شاہ نے صحراؤں کی کیفیت پر مستقل نظمیں لکھی ہیں۔

دریا اسی طرح ہم کو اُردو شاعری میں دریاؤں کی روانی بھی نظر آئے گی قریب قریب تمام بڑے دریاؤں کے نام اس میں ملتے ہیں۔ بعض دریاؤں پر تو مستقل نظمیں ہیں۔ گنگا، جمنا کو مذہبی تقدس کی وجہ سے دوسرے دریاؤں پر ایک خاص امتیاز حاصل ہے، اس لئے یہ دونوں تو اردو شاعری کا جزو بن گئے ہیں، اور اُن سے اُردو شاعری میں ضرب الامثال اور تشبیہ و استعارے پیدا ہو گئے۔ "آنکھوں سے گنگا جمنا بہنا" اُردو کا محاورہ ہے۔

ہے چشم تر میں اک بتِ مہرو کا شب کو عکس
کیا چاندنی کھلی ہوئی بالائے گنگ ہے

(امانت)

جہاں ہیں ایک دم مشکل ہے کشتے کے قدم جمنا
تری تلوار کی ہے دھار یا گنگا کا دھارا ہے

اکبر کا ایک شعر ہے۔

تین تربینی ہیں، دو آنکھیں مری
اب الہ آباد بھی پنجاب ہے

زلف ہے تیری کا موج جمنا کی

گھر پہ اشنان کریں سرو قدان گوکل
جا کے جمنا پہ نہانا بھی ہے اک طول امل

گنگا اور جمنا کے مختلف مناظر، گھاٹ اور اشنان وغیرہ کی نظمیں اتنی مشہور ہیں کہ ان کے نقل کرنے کی ضرورت نہیں۔ ان کے علاوہ اور دریاؤں پر بھی نظمیں ہیں، یا کم از کم اشعار میں اُن کے نام ملتے ہیں۔

شہر ان فطری مناظر کی سیر کرنے کے بعد اب شہر کا رُخ کیجیے۔ اکثر بڑے بڑے شہروں کے نام اُردو شاعری میں موجود ہیں۔ اور جنھیں کوئی تاریخی، مذہبی، تمدنی یا تجارتی اہمیت حاصل ہے اُن پر تو مستقل نظمیں ہیں۔ بلکہ ان کی خصوصیات تک پر مستقل نظمیں ہیں، جو گائڈ کا کام دے سکتی ہیں۔ دہلی، لکھنؤ، بنارس، متھرا، اجودھیا، الہ آباد، کانپور، بمبئی، احمد آباد، کلکتہ اور عظیم آباد وغیرہ کوئی ایسا بڑا شہر نہیں ہے جس کا ذکر اُردو شاعری میں موجود نہ ہو۔ دہلی پر منظومات کا ذکر اوپر گذر چکا ہے لکھنؤ کے زیر سایہ تو شاعری کا رنگ ہی نکھرا، اس لیے اُس کے ذکر سے اُردو شاعری بھری ہوئی ہے اور شعرا یہاں کی ہر ادا پر جان دیتے ہیں۔

لکھنؤ ہم پر فدا ہے، ہم فدائے لکھنؤ

بعض دوسرے شہروں کے نام ملاحظہ ہوں :۔

سمت کاشی سے چلا جانب متھرا بادل
برق کے کاندھے پہ لائی ہے صبا گنگا جل

ڈوبنے جاتے ہیں گنگا پہ بنارس والے
جا کے جمنا پہ نہانا بھی ہے اک طول امل

ابھی تازہ آئے ہیں برہمن جو یہ کاشی اور پراگ سے
کوئی چھینٹا پڑے تو داغ کلکتہ چلے جائیں
عظیم آباد میں ہم منتظر ساون کے بیٹھے ہیں

کلکتہ کا جو ذکر کیا تو نے ہم نشیں
وہ تیر دل پہ میرے ہے مارا کہ ہائے ہائے

پوچھا جو میں نے کون ہو تم آئی یہ صدا
ہم کشتگانِ معرکۂ کان پور ہیں

نہ چھوٹا درِ یار حسرت نہ چھوٹا
بہت ہم نے چاہا بنیں کان پوری

احمد آباد پر ولی دکنی کی مستقل نظم موجود ہے۔ الہ آباد کے نام کو حضرت اکبر کی شاعری نے دوام بخشا۔ تاج کے سلسلے میں اکبر آباد پر بکثرت نظمیں ہیں۔ سب شہروں کے ناموں کا شمار مقصود نہیں ہے۔ اتنے ناموں سے اردو شاعری میں ہندوستانی شہروں کے ذکر کا اندازہ ہو گیا ہو گا۔

باغ اور پھول اب ان شہروں کے باغوں کی بہار دیکھیے؟ اردو شاعری میں خالص ہندوستانی پھولوں کی اتنی بہاریں ہیں کہ پھولوں کے اتنے اقسام سے واقفیت بھی مشکل ہے۔ میر حسن کے باغ کی بہار:۔

چنبیلی کہیں اور کہیں موتیا — کہیں رائے بیل اور کہیں موگرا
کھڑے شاخ شبو کے ہر جا نشاں — مدن بان کی اور ہی آن بان
کہیں جعفری اور گیندا کہیں — سماں شب کو داؤدیوں کا کہیں
کھڑے سرو کی طرح چمپا کے جھاڑ — کہے تو کہ خوشبوئیوں کے پہاڑ
کہیں تخم پاشی کریں گود کر — پنیری جمائیں کہیں کھود کر
صبا جو گئی ڈھیریاں کر کے پھول — پڑے ہر طرف مولسریوں کے پھول

ایک دوسرے باغباں کی چمن آرائی ملاحظہ ہو:۔

گل عباس کی یہ رنگینی — خوشبو کی بھینی بھینی
کہیں ہے لالہ کہیں ہے خیری — کہیں ہے گیندا کہیں دوپہریا
مدن مست کی بو متوالی — مولسری کی باس نرالی
جاہی، جوہی اور چمبیلی — چمپا کی خوشبو البیلی
ساونی اپنے رنگ میں ماتی — ادھر مالتی ہے اتراتی
دونا، مروا اور ہزارا — رنگ اشرفی سب سے پیارا
نافرمان اور گل داؤدی — رنگت زرد، سنہری اودی
ٹیسو پھولا، جنگل دہکا — کیوڑے سے سارا بن مہکا
تالابوں میں کنول کھلا ہے — اور سنگھاڑا خوب پھلا ہے

(عندلیب گلشن ہندی)

بہت سے پھولوں پر مستقل نظمیں ہیں۔

پھل اور میوے | ان پھولوں کی بہار دیکھنے کے بعد ہندوستانی پھلوں اور میووں کا مزا چکھیے! ہندوستان کے مشہور میوے آم کی تعریف میں غالب کی مشہور نظم سے آپ سب حضرات اچھی طرح واقف ہوں گے جس کا ایک شعر یہ ہے:۔

انگبیں کے بحکم رب الناس — بھر کے بھیجے ہیں سربہ مہر گلاس

داغ کی زبان میں اس کا رنگ و مزہ دیکھیے:۔

سُرخ ہے لالہ رخوں کی بہار — سبز ہے سبزہ خطوں کی پھبن
زرد ہے، رنگ گل زعفران — کیسری پوشوں کی ہے اک انجمن
سونگھ کے ہو جائے معطر دماغ — مُنھ پہ مگر ان کے ہے مشک ختن
گر کبھی اُن آموں کا رس چوس لیں — ہونٹ ہی چاٹا کریں شیریں دہن

مثنویوں میں باغ کی بہار یا اور دوسرے سلسلوں میں پھلوں اور سبزیوں تک کے نام ہیں۔ نواب مرزا شوق لکھتے ہیں:۔

نارنج لگا کے رنج جھیلا — تقدیر سے کچھ پھلا نہ کیلا
پاجی ہیں یہ سب شریفے سڑ جائیں — بیری ہو ہے بیر کیڑے پڑ جائیں
اس نے بھی نہ خاک ادا کیا حق — پالا پالک کو میں نے ناحق

غالب کی مرغوب غذا کڑوے کریلے اور املی کے پھول سے آپ واقف ہوں گے!

وہ کڑوے کریلے وہ املی کے پھول

ککڑی، تربوز، خربوزے پر نظیر اکبرآبادی اور حفیظ جونپوری وغیرہ کی مستقل نظمیں موجود ہیں۔

غلّے غلّے کچھ ہندوستان کے ساتھ مخصوص نہیں۔ کم وبیش تمام ملکوں میں ہر قسم کے غلّے پیدا ہوتے ہیں۔ بہرحال اُردو شاعری کے خرمن میں غلوں کے انبار بھی ہیں۔ نظیر اکبرآبادی کی مشہور نظم (جب لاد چلے گا بنجارا) میں بہت سی قسموں کے نام ہیں۔

کیا گیہوں، چاول، موٹھ، مٹر، کیا آگ، دھواں اور انگارہ
کیا داکھ، منقی، سونٹھ، مرچ، کیا کیسر، مونگ، سپاری ہے
کیا شکر، مصری، قندگری، کیا سانبھر، میٹھا کھاری ہے

شعرا نے دھان اور سرسوں کے کھیتوں کی لہلہاہٹ بھی دکھائی ہے۔

حیوانات ہندوستان میں چرند و پرند اور حشرات الارض کی اتنی قسمیں ہیں کہ ان کے ناموں کا شمار بھی مشکل ہے۔ ان میں قریب قریب تمام مشہور حیوانات کے نام اشعار میں ملتے ہیں۔ خصوصاً جن کا تعلق کسی جہت سے شاعری سے ہے، اُن پر تو مستقل نظمیں ہیں۔ مثلاً پپیہا، کوئل، چکور، سارس، ہنس، طوطا، شاما، جگنو، بھونرا، تتلی، ہرن، ہاتھی وغیرہ۔ برسات کی بہار میں جو نظمیں لکھی گئی ہیں ان میں بہت سے اُن جانوروں کے نام ہیں جن کا تعلق برسات سے ہے۔ اُن میں سے بعض نظمیں آئندہ برسات کے ذکر میں نقل کی جائیں گی۔ ان کے علاوہ قصیدہ و مثنویوں میں تمام صحرائی وحوش و طیور کے نام ملتے ہیں۔

ہندوستان کے موسم | ہندوستان کے تین موسم ہیں :۔ جاڑا، گرمی، برسات اگر بہار بھی مان لی جائے تو ایک موسم اور بڑھ جائے گا، حالانکہ ہندوستان کی بہار درحقیقت برسات ہے۔ ایک موسم یعنی بسنت کا ذکر اوپر گزر چکا ہے جاڑے، گرمی اور برسات تینوں موسموں پر اُردو میں نہایت کثرت سے نظمیں ہیں اور ایسی کامیاب کہ ہر موسم کے جملہ خصوصیات و جزئیات کی تصویر کھینچ دی ہے۔ یہ نظمیں اس قدر عام ہیں کہ ان کے نقل کرنے کی ضرورت نہیں۔ لیکن اس موقع پر ہم برسات پر شوق قدوائی کی ایک نظم کے کچھ اشعار نقل کرتے ہیں۔ ان میں ہندوستان کی برسات کی مختلف کیفیتوں کی تصویر کھینچ دی گئی ہے۔ ان کے علاوہ ان میں بہت سے چرند و پرند کے نام بھی آ گئے ہیں۔

خوش زراعت پیشہ ہیں ہلچل مچی ہے آج کل
اپنے اپنے کھیت پر پہونچے ہیں سب لے کے ہل

کل ادھر سے اپنی بھینسوں کو چراتا ہے کوئی
دوب بیلوں کے لیے جنگل سے لاتا ہے کوئی

دُم اُٹھائے دوڑتی پھرتی ہیں گائیں چار سمت
چرتی ہیں گھاس اور کھاتی ہیں ہوائیں چار سمت

دودھ کی کثرت سے گھی ارزاں ہے ہندُستان میں
لوگ اکثر شوق سے مصروف ہیں بلکہ ان میں

کیا مزہ دینے لگے پانی سے ہو کر سرد آم
دیکھنا کچھ سبز ہیں کچھ سُرخ ہیں کچھ زرد آم

رنگ لاتی ڈالیوں میں اُن کے پکنے کی بہار
لطف دکھلاتی ہے کیا اُن کے ٹپکنے کی بہار
جامنیں خوشوں میں آتی ہیں نظر پانی سے تر
نور برساتا ہے بادل اودے اودے رنگ پر
کونپلیں شاخوں میں، ظاہر جن سے منقاروں کی شکل
ساونی پھولی ہوئی کیسی ہے انگاروں کی شکل
پھٹ گئے کانوں کے پردے جھینگروں کے شور سے
بج رہی ہیں ہر طرف شہنائیاں کس زور سے
شاد ہیں مینڈک بجاتے ہیں سرود آواز سے
رقص کرتی ہیں بطیں تالاب میں کس ناز سے
مختلف چڑیاں اُڑیں، کوّے اُڑے چیلیں اُڑیں
اپنے اپنے آشیانوں سے ابابیلیں اُڑیں
بولتے تیتر نظر آتے ہیں دیکھو جس طرف
پھرتے ہیں چگتے ہوئے وہ اُس طرف وہ اس طرف
ہے نرالی سب سے خرگوشوں کے چلنے کی ادا
کیا بھلی معلوم ہوتی ہے اچھلنے کی ادا
سبز میدانوں میں پھرتے ہیں ہرن چرتے ہوئے
دیکھ لیتے ہیں مگر چاروں طرف ڈرتے ہوئے
یہ ادھر جنگل سے نکلے ہیں چکارے دیکھنا
وہ ادھر چیتل ہیں دریا کے کنارے دیکھنا

جا بجا جھاڑی میں وہ طاؤس ناچ کر بازسے
وہ ٹٹیری دے رہی ہے کچھ خبر آواز سے
بھاگ کر میدان میں نیل اور سامر آ گئے
شیر نے جنگل میں نکی دی تو یہ گھبرا گئے
وہ اُڑے پیڑوں سے "شب پر" کھا کے دھوکا شام کا
وہ لب دریا بجا منڈر میں گھنٹا شام کا
کیا اندھیرا ہے کہ جگنو لطف دکھلانے لگے
ٹوٹتے ہر سمت سے تارے نظر آنے لگے
ہنس تنتے ہیں کھڑے سینے ابھارے ریت پر
رقص میں سارس ہیں دریا کے کنارے ریت پر
وہ ہیں دابل پانوں کالے چونچ کالی پر سپید
جیسے کوئی پھول ہو کمتر سیہ اکثر سپید
وہ جو اصل پیرتے ہیں مچھلیاں کھلتے ہوئے
بس اسی موسم میں دیکھا ہے انھیں آتے ہوئے

دیکھا آپ نے! صحرا اور میدان کی برسات کی کیسی مکمل تصویر ہے! برسات میں بھی ساون کا مہینا مختلف حیثیتوں سے خاص خصوصیت رکھتا ہے۔ اس لئے شعراء نے ساون کی بہاریں خوب دکھائی ہیں۔

رند کہتے ہیں:-

جھوم جھوم آتی ہے گھنگھور گھٹا ساون کی
ٹھنڈی ٹھنڈی چلی آتی ہے ہوا ساون کی

خونِ عشاق میں پھر بسنے لگی گندھنے لگی
رنگ لائی ترے ہاتھوں کی حنا ساون کی

کوکے اس سمت پپیہا، کہیں کوئل کرے شور
مور چلاتے ہیں رُت آئی ہے کیا ساون کی

لہلہانے لگے جنگل، ہوئے پھر کھیت ہرے
روپ دکھلانے لگی نشو و نما ساون کی

فرقتِ یار میں یوں لگتی ہے ساون کی جھڑی
زور سے جیسے برستی ہے گھٹا ساون کی

کان میں دیس کی آواز چلی آتی ہے
تا میں لیتی ہے کوئی حور لقا ساون کی

امیر مینائی اور داغ اور دوسرے متعدد شعراء نے ساون کی بہاریں دکھائی ہیں۔

یہ موسم ہندوستان کی نوجوان شادی شدہ امنگ بھری عورتوں کے لئے گوناگوں کیفیتیں رکھتا ہے۔ چنانچہ ہندی شاعری میں "ساون" کے نام سے ایک صنف ہی پیدا ہو گئی ہے، جس میں عورتوں کی زبان سے اس موسم کے اثرات کا اظہار ہوتا ہے۔ اردو شعراء نے بھی یہ کیفیتیں دکھائی ہیں۔ شوق قدوائی کہتے ہیں:-

عورتیں گاتی ہیں ساون کچھ عجب انداز سے
کھینچ لیتی ہیں دلوں کو راگ کی آواز سے

اُن سے پوچھے کوئی، شوہر جن کے ہیں پردیس میں
چاہتی ہیں یہ کہ وہ آجائیں کھنچ کر دیس میں

جو صدا آتی ہے اُن کی درد اُس کے ساتھ ہے
تان لیتی ہیں تو آہِ سرد اُس کے ساتھ ہے

وہ ملیں مہندی تو کس کا دل لُبھانے کے لیے
وہ چلیں اٹھلا کے تو کس کو دکھانے کے لئے

لب ہیں خالی، وہ مسی منھ کو لگاتی ہی نہیں
پان کھاتی ہی نہیں، لاکھا جماتی ہی نہیں

جن کے شوہر پاس ہیں وہ ہنس رہی ہیں شاد ہیں
اُن کی امیدیں ہیں پوری اُن کے گھر آباد ہیں

اُن کے ہاتھوں اور پاؤں میں ہے مہندی کی بہار
بن سنور کر شوہروں کو دیکھتی ہیں بار بار

ایک فراق رسیدہ عورت جس کا شوہر پردیس میں ہے، ساون کی گھٹاؤں اور ہجولیوں کی خوش فعلیوں کو دیکھ کر اپنے محروم دل سے یوں باتیں کرتی ہے۔

ساون اور یہ گھٹائیں کہیں ہوں وہ کہیں
حُسن یہ اُنھیں کا ہے اور وہ دیکھتے نہیں

ساتھ والیوں کے ساتھ جھولنے کو جاؤں کیا
دل وہاں ہے وہ جہاں، بے دلی سے گاؤں کیا

پینگ آرے جائیں گے اور ملے گا دل مرا
مل سکے کیا میں گاؤں گی، کیا ملے گا دل مرا
کھل پڑے گی خود بخود چاہ سر صدا کے ساتھ
منھ سے باہر آئے گی آہ ہر صدا کے ساتھ
گرتی ہیں جگر کا خوں ہم نشیں جو ساتھ ہیں
وہ لگا رہی ہیں آگ لال جن کے ہاتھ ہیں
اور بھی لگائی آگ ساون نے بھول کر
پیڑ پر مری نظر اب پڑے نہ بھول کر
یہ شباب کی اُمنگ اب کسے دکھاؤں میں
رخ کا لال لال رنگ اب کسے دکھاؤں میں
لال یہ کہاں رہا زرد ہو کے رہ گیا
رنگ اب کہاں ہے رنگ گرد ہو کے رہ گیا

ان نظموں سے اُردو شاعری پر ہندی شاعری کے اثرات کا بھی اندازہ ہوتا ہے ہندوستان کے متعلق اس قسم کی اور بھی بہت سی چیزیں اردو شاعری سے نقل کی جا سکتی ہیں۔ لیکن ان سب کا استقصا نہ مقصود ہے اور نہ اس مختصر مضمون میں ممکن ہے۔ صرف بعض پہلوؤں کو دکھانا تھا۔ اُن سے اردو شاعری پر ہندو کلچر اور ہندوستان کے جغرافی اثرات کا کسی نہ کسی حد تک اندازہ ہو گیا ہوگا۔ اگر اس نقطۂ نظر سے تفصیل کے ساتھ اُردو شاعری کا جائزہ لیا جائے تو ایک نہایت دلچسپ اور مفید کتاب تیار ہو سکتی ہے۔

کیا اقبال فرقہ پرست شاعر تھے؟

اقبال کی شاعری کا موضوع بہت پامال ہو چکا ہے اور اس پر اتنا لکھا جا چکا ہے کہ اس کا کوئی پہلو مشکل سے تشنہ باقی ہو گا، اور اب اس پر لکھنے کی بہت کم گنجائش ہے، لیکن جن لوگوں کی نظر ان کے پورے کلام اور اس کی غرض و غایت پر نہیں ہے، اُن کی جانب سے اُن پر ایک بڑا اعتراض یہ کیا جاتا ہے کہ وہ فرقہ پرست شاعر تھے، ان کا دل اپنی قوم اور اپنے وطن کی محبت سے خالی تھا، انھوں نے قومیت اور وطنیت کی مخالفت کی ہے، اُن کی تعلیمات اور اُن کے پیام میں عالمگیریت نہیں ہے، انھوں نے عالم انسانیت یا کم از کم ہندوستانی قوم کو مخاطب بنانے کے بجائے، صرف مسلمانوں سے خطاب کیا ہے، اور اپنی شاعری میں صرف اسلام کی تبلیغ و اشاعت کی ہے، وہ اسلامی حکومت کے قیام کے داعی اور صرف مسلمانوں کا غلبہ و اقتدار چاہتے تھے، ان کی فرقہ پرستی کے ثبوت میں اور بھی اسی قبیل کے اعتراضات کئے جاتے ہیں۔

لیکن یہ تمام اعتراضات اقبال کے افکار و تصورات، اُن کے نصب العین اُن کے مقصد شاعری، یورپ کی سیاست، مذہب اسلام، مشرقی قوموں خصوصاً مسلمانوں کے زوال کی تاریخ سے ناواقفیت اور کلام اقبال پر

قصور نظر کا نتیجہ ہیں۔ اگر ان سب کی روشنی میں اقبال کے کلام کا مطالعہ کیا جائے تو یہ سارے اعتراضات خود بخود رفع ہو جائیں گے۔

اقبال کے دل میں قوم و وطن کی محبت بھی تھی، لیکن اُن کی قومیت و وطنیت کا تصور محدود نسلی اور جغرافی قومیت و وطنیت کے بجائے عالمگیر انسانی اخوت تھا، اور وہ نسل و وطن کے محدود دائرہ دل کو توڑ کر تمام انسانوں کو اخوت کے رشتہ میں منسلک کرنا چاہتے تھے اور اس کے لئے نسلی اور وطنی قومیت اور وطنیت کے موجودہ تصور کی اصلاح ضروری تھی، گو انھوں نے جا بجا مسلمانوں کو مخاطب کیا ہے۔ لیکن اس کے باوجود ان کا پیام عالمگیر تھا، ان دونوں میں کوئی تضاد نہیں ہے، انھوں نے جارحانہ جنگ و مقابلہ کی کہیں تعلیم نہیں دی ہے، وہ موجودہ اصطلاح کے لحاظ سے اسلام اور مسلمانوں کا سیاسی غلبہ و اقتدار نہیں چاہتے تھے اور نہ ان معنوں میں اسلامی حکومت کے داعی تھے، بلکہ اسلامی تعلیمات کی تبلیغ و اشاعت سے ان کا مقصد انسانیت کی فلاح و سعادت تھی، آئندہ سطور میں ان مسائل پر تفصیلی نگاہ ڈالی جائے گی۔

اقبال اور حب قوم و وطن قوم و وطن کی محبت ایک فطری جذبہ ہے، جس سے انسان کیا حیوان بھی خالی نہیں ہیں، اس لئے اسلام نے بھی اس کی تعلیم دی ہے، جس پر عرب کے فضائل کی حدیثیں اور خود رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کا عمل شاہد ہے، بعض ضعیف روایتوں میں تو وطن کی محبت کو ایمان کی نشانی قرار دیا گیا ہے، آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم نے عربوں کی

ہدایت و اصلاح کے لئے جو کوششیں فرمائیں، اور اس راہ میں جو جو سختیاں جھیلیں، اس سے ہر تاریخ داں واقف ہے، اس سے بڑھ کر آپ کے حُبِّ قوم و وطن کا ثبوت اور کیا ہو سکتا ہے کہ عربوں کے انتہائی جور و ستم پر بھی اُن کے لئے آپ کی زبان سے یہی دعا نکلتی تھی، کہ "خدایا میری قوم کو راہ راست دکھا کہ وہ اپنا اچھا بُرا نہیں سمجھتے" قوم و وطن سے رسول اکرمؐ اور صحابۂ کرام کی محبت کے بہت سے واقعات حدیثوں میں موجود ہیں، یہ ایک ایسا مسلّم مسئلہ ہے، جس کے لئے ثبوت کی ضرورت نہیں، اس لئے اگر اقبال کو اسلامی شاعر مان لیا جائے، تو ان کا کلام اور بھی قوم و وطن کی محبت سے خالی نہیں ہو سکتا، ورنہ پھر انھیں اسلامی شاعر کہنا صحیح نہ ہوگا۔

ابتدائی دور میں تو ان پر قومیت اور وطنیت کا اتنا غلبہ تھا کہ انھوں نے "نیا شوالہ" اور "ترانہ ہندی" جیسی حُبِّ قوم و وطن میں ڈوبی ہوئی نظمیں کہیں لیکن پھر موجودہ زمانہ کی نیشنلزم کے نتائج بد دیکھنے کے بعد جس کی تفصیل آئندہ آرہی ہے، اُن کے خیالات بدل گئے، اور انھوں نے نسلی اور جغرافی قومیت و وطنیت کے بجائے افکار و تصورات کی وحدت اور انسانی اخوت کی بنیاد پر عالمگیر قومیت و وطنیت کی دعوت شروع کی۔

لیکن اس کا یہ مقصد نہیں تھا کہ ان کی نگاہ میں نسلی اور جغرافی قوم و وطن کی کوئی حیثیت نہیں رہ گئی، اور ان کا دل اس کی محبت سے خالی ہو گیا اور انھوں نے اس کے حقوق نظر انداز کر دیے، بلکہ انھوں نے اس کے حدود

مقرر کردیے، اور اس حد کے اندر ان کے دل میں اپنے ملک و قوم کی پوری عظمت و محبت تھی، اور وہ ہندوستان کی غلامی پر ویسا ہی دردمند اور اس کی آزادی کے لیے تڑپتا تھا جس قدر ایک بڑے سے بڑے قوم پرور کا دل تڑپ سکتا ہے، اور یہ محبت و عظمت ہر دور میں یکساں قائم رہی، نسلی اور جغرافی وطنیت کے بارہ میں ان کے خیالات ۱۹۰۸ء کے بعد بدل چکے تھے، جیسا کہ ان کی مشہور نظم وطن سے ظاہر ہوتا ہے۔

اس دور میں مے اور ہے جام اور ہے جم اور
ساقی نے بنا کی روش لطف و ستم اور
مسلم نے بھی تعمیر کیا اپنا حرم اور
تہذیب کے آذر نے ترشوائے صنم اور
ان تازہ خداؤں میں بڑا سب سے وطن ہے
جو پیرہن اس کا ہے وہ مذہب کا کفن ہے

ہندوستان کی عظمت و محبت

لیکن اس کے بعد بھی قوم و وطن کی محبت ان کے دل میں پوری طرح موجود تھی، جس کا ثبوت ان کے آخری دور کا کلام ہے اس دور کا کلام بھی حب قوم و وطن سے خالی نہیں ہے، چنانچہ جاوید نامہ میں جو ان کی اہم تصنیف ہے، اور ان کی وفات سے چند سال پہلے لکھی گئی ہے، ہندوستان کے متعلق بکثرت نظمیں ہیں، جن کے لفظ لفظ سے وطن کی محبت ٹپکتی ہے، ذیل کی نظم میں ہندوستان کی عظمت و محبت کا کس موثر الفاظ میں اظہار کرتے ہیں۔

باز گو از ہند و از ہندوستاں
آنکہ با کاہش نیرزد آسماں
آنکہ اندر مسجدش ہنگامہ مرد
آنکہ اندر دیر او آتش فسرد

آنکہ دل از بہر او خوں کردہ ایم — آنکہ یادش را بجاں پروردہ ایم

از غمِ ما کن غمِ او را قیاس
آہ از معشوقِ عاشق ناشناس

ان اشعار میں پہلے اور دوسرے اشعار خاص طور سے قابل توجہ ہیں، جن میں ہندو مسلمانوں دونوں کی زبوں حالی کا ماتم ہے۔

ہندوستان کی غلامی کا ماتم

ایک دوسری نظم میں ہندوستان کی عظمت کے ذکر کے ساتھ کس درد سے اس کی غلامی پر آنسو بہائے ہیں۔

می ندانی خطۂ ہندوستاں — آں عزیزِ خاطرِ صاحب دلاں
خطۂ ہر جلوہ اش گیتی فروز — درمیانِ خاک و خوں غلطد ہنوز
در گلش تخمِ غلامی را کہ کشت — ایں ہمہ کردار آں ارواحِ زشت

اسی نظم میں یہ مشہور شعر ہے۔

جعفر از بنگال و صادق از دکن — ننگِ آدم ننگِ دیں ننگِ وطن

جاوید نامہ میں عالم بالا میں جو تمثیلی مناظر دکھائے گئے ہیں، ان میں ہندوستان کی روح یا مادرِ وطن کی تصویر ان الفاظ میں کھینچی ہے۔

آسماں شق گشت و حورے پاک زاد — پردہ را از چہرۂ خود برکشاد
در جبینش نار و نورِ لایزال — در دو چشم او سرورِ لایزال
حلّہ در بر سبک تر از سحاب — تار و پودش از رگِ برگِ گلاب
با چنیں خوبی نصیبش طوق و بند — بر لب او نالہ ہائے دردمند

کیا مادرِ ہند کی اس سے زیادہ پاکیزہ اور محزون تصویر کھینچنا ممکن ہے

اس کے بعد مادرِ ہند کی زبان سے ہندوستان کی غلامی اور غدارانِ وطن کی غداری کا ماتم ہے۔ یہ نظم طویل ہے، اس لیے صرف چند شعر نقل کیے جاتے ہیں، مادرِ ہند نالہ کرتی ہے۔

مرد کی نامحرم از اسرارِ خویش — زخمۂ خود کم زند بر تارِ خویش

بر زمانہ رفتہ می بندد نظر — ز آتشِ افسردہ می سوزد جگر

بندہا بر دست و پائے من ازوست — نالہائے نارسائے من ازوست

خویشتن را از خودی پرداختہ — از رسومِ کہنہ زنداں ساختہ

کہ شبِ ہندوستاں آید بروز — مرد جعفر زندہ روحِ او ہنوز

تا ز قیدِ یک بدن وا می رہد — آشیاں اندر تنِ دیگر نہد

دینِ او آئینِ او سوداگری است — عنتری اندر لباسِ حیدری است

تا جہانِ رنگ و بو گردد دگر — رسمِ او آئینِ او گردد دگر

از نفاقش وحدتِ قومے دو نیم — ملتِ او از وجودِ او لئیم

ملتے را ہر کجا غارتگری است — اصلِ او از صادقے یا جعفری است

الاماں از روحِ جعفر الاماں

الاماں از جعفرانِ ایں زماں

ہندوستان کی غلامی کے ماتم میں ان کی بہت سی نظمیں ہیں: ان سب کا نقل کرنا مشکل ہے، اس لیے صرف چند مثالوں پر اکتفا کیا گیا۔

ہندو مسلم اختلاف کا غم

اقبال پر فرقہ پروری کا الزام لگایا جاتا ہے، حالانکہ وہ ہندو مسلم اتحاد کے دل سے متمنی تھے اور ان کے اختلاف پر

ان کا دل غمگین تھا، ایک مستقل نظم میں ہندو مسلمانوں کے اختلاف پر آنسو بہائے ہیں، اور اس کو ہندوستان کی غلامی کا سبب قرار دیا ہے، چند اشعار یہ ہیں:-

اے ہمالہ اے اٹک اے رودِ گنگ — زیستن تا کے چناں بے آب و رنگ
پیر مردان از فراست بے نصیب — نوجواناں از محبت بے نصیب
شرق و غرب آزاد و ما نخچیرِ غیر — خشتِ ما سرمایۂ تعمیرِ غیر
زندگانی بر مرادِ دیگراں — جاوداں مرگ است نے خوابِ گراں
نیست ایں مرگے کہ آید زآسماں — تخمِ او می بالد از اعماقِ جاں
تا فرنگی قومے از مغرب زمیں — ثالث آمد در نزاعِ کفر و دیں
کس نداند جلوۂ آب از سراب — انقلاب اے انقلاب اے انقلاب

کشمیر اور دوسرے خطوں کی مدح

ہندوستان اور اس کے مختلف خطوں کے فضائل اور تعریف میں بہت سی نظمیں ہیں، ایک نظم میں یہ دعویٰ کیا گیا ہے کہ ہندوستانیوں کو آزادی کی دعوت سب سے پہلے کشمیریوں نے دی۔

ہند را ایں ذوقِ آزادی کہ داد — صید را سودائے صیادی کہ داد
آں برہمن زادگانِ زندہ دل — لالۂ احمر ز روئے شاں خجل
تیز بین و پختہ کار و سخت کوش — از نگاہِ شاں فرنگ اندر خروش
اصلِ شاں از خاکِ دامنگیرِ ماست
مطلعِ ایں اختراں کشمیرِ ماست

گو اقبال خود نو مسلم کشمیری برہمن تھے[۱]، لیکن موتی لال اور جواہر لال بھی کشمیری برہمن ہیں، ان کے ہوتے ہوئے اس دعوے کی صداقت میں کیا شبہہ کیا جا سکتا ہے۔

ہندوستان کے مسلمان شعرا کو یہ طعنہ دیا جاتا ہے کہ ان کی نگاہ ہمیشہ جیحون و فرات کی روانی پر رہتی ہے، لیکن اقبال کی نگاہ میں دریائے کاویری، جیحون و فرات سے زیادہ عزیز تھا، سلطان ٹیپو کی زبان سے کہتے ہیں۔

رود کاویری یکے نرمک خرام — خستۂ شاید کہ از سیر دوام
در کہستاں عمر ہا نالیدۂ — راہ خود را بر مژہ کاویدۂ
اے مرا خوشتر ز جیحون و فرات — اے دکن را آب تو آب حیات

ہندوستان کے صلحا و اخیار سے عقیدت

اقبال کے دل میں ہندوستان کے صلحا و اخیار کی بھی پوری عظمت و عقیدت تھی، جس پر رام چندر جی گوتم بدھ اور گرو نانک کی شان میں ان کی نظمیں شاہد ہیں، رام چندر جی کی عظمت ملاحظہ ہو۔

لبریز ہے شراب حقیقت سے جام ہند — سب فلسفی ہیں خطۂ مغرب کے رام ہند
یہ ہندیوں کی فکر فلک رس کا ہے اثر — رفعت میں آسماں سے بھی اونچا ہے بام ہند
اس دیس میں ہوئے ہیں ہزاروں ملک سرشت — مشہور جن کے نام سے ہے دنیا میں نام ہند

۱؎ نو مسلم سے مراد یہ ہے کہ ان کے آبا و اجداد کسی زمانہ میں مسلمان ہوئے، انکو اپنی برہمنیت کا خود اعتراف ہے

مرا بنگر کہ در ہندوستاں دیگر نمی بینی — برہمن زادۂ دانائے رمز روم و تبریز است

ہے رام کے وجود پہ ہندوستاں کو ناز | اہلِ نظر سمجھتے ہیں اس کو امامِ ہند

اعجاز اس چراغِ ہدایت کا ہے یہی | روشن تراز سحر ہے زمانہ میں شامِ ہند

تلوار کا دھنی تھا شجاعت میں فرد تھا

پاکیزگی میں جوشِ شجاعت میں فرد تھا

جاوید نامہ میں دوسرے پیغمبروں اور مصلحین و اخیار کی تعلیمات کے ساتھ گوتم بدھ کی تعلیمات کو بھی اُن کی زبان سے پیش کیا گیا ہے، وہ ایک زنِ رقاصہ کو نصیحت کرتے ہیں۔

مے دیرینہ و معشوقِ جواں چیزے نیست | پیشِ صاحب نظراں حورِ جناں چیزے نیست

ہرچہ از محکم و پائندہ شناسی، بگذرد | کوہ و صحرا و بر و بحر و کراں چیزے نیست

دانشِ مغربیاں فلسفۂ مشرقیاں | ہمہ بتخانہ و در طوفِ بتاں چیزے نیست

از خود اندیش و ازیں بادیہ ترساں بگذر | کہ تو ہستی و وجودِ دو جہاں چیزے نیست

در طریقے کہ بنوکِ مژہ کاویدم من | منزل و قافلہ و ریگِ رواں چیزے نیست

بگذر از غیب کہ ایں وہم و گماں چیزے نیست | در جہاں بودن و رستن زجہاں چیزے ہست

آں بہشتے کہ خدائے بتو بخشد ہمہ ہیچ | تا جزائے عملِ تست جناں چیزے نیست

راحتِ جاں طلبی؟ راحتِ جاں چیزے نیست | در غمِ ہمنفساں اشکِ رواں چیزے ہست

چشمِ مخمور و نگاہِ غلط انداز و سرود | ہمہ خوب است ولے خوشتر ازاں چیزے ہست

حسنِ رخسار دمے ہست و دمے دیگر نیست

حسنِ کردار و خیالاتِ خوشاں چیزے ہست

قدیم ہندوستان کے تاریک دور میں یہاں کی افسوسناک حالت کا نقشہ

اور گوتم بدھ اور گرو نانک کی اصلاحی کوششیں اور ان کی روحانی تعلیمات ملاحظہ ہوں۔

قوم نے پیغامِ گوتم کی ذرا پروا نہ کی
قدر پہچانی نہ اپنے گوہرِ یک دانہ کی

آہ بدقسمت رہے آوازِ حق سے بے خبر
غافل اپنے پھل کی شیرینی سے ہوتا ہے شجر

آشکار اس نے کیا جو زندگی کا راز تھا
ہند کو لیکن خیالی فلسفہ پر ناز تھا

شمعِ حق سے جو منور ہو یہ وہ محفل نہ تھی
بارشِ رحمت ہوئی لیکن زمیں قابل نہ تھی

آہ شودر کے لیے ہندوستاں غم خانہ ہے
دردِ انسانی سے اس بستی کا دل بیگانہ ہے

برہمن سرشار ہے اب تک مئے پندار میں
شمعِ گوتم جل رہی ہے محفلِ اغیار میں

بتکدہ پھر بعد مدت کے مگر روشن ہوا
نورِ ابراہیم سے آزر کا گھر روشن ہوا

پھر اٹھی آخر صدا توحید کی پنجاب سے
ہند کو اک مردِ کامل نے جگایا خواب سے

سوامی رام تیرتھ کی عظمت۔

ہم بغل دریا سے ہے اے قطرۂ بیتاب تو
پہلے گوہر تھا، بنا اب گوہرِ نایاب تو

آہ کھولا کس ادا سے تو نے رازِ رنگ و بو
میں ابھی تک ہوں اسیرِ امتیازِ رنگ و بو

مٹ کے غوغا زندگی کا شورشِ محشر بنا
یہ شرارہ بجھ کے آتش خانۂ آزر بنا

نفیِ ہستی اک کرشمہ ہے دلِ آگاہ کا
لا کے دریا میں نہاں موتی ہے الا اللہ کا

چشمِ نابینا سے مخفی معنیِ انجام ہے
تھم گئی جس دم تڑپ، سیماب سیمِ خام ہے

توڑ دیتا ہے بتِ ہستی کو ابراہیمِ عشق
ہوش کا دارو ہے گویا مستیِ تسنیمِ عشق

۱۵ گرو نانک۔

جاوید نامہ میں کائنات کے مختلف مسائل وحقائق کے متعلق مولانا روم سے ایک عارف ہندی (جوگی) کے سوالات اور مولانا کے جوابات کا ذکر ہے، یہ مکالمہ بہت طویل ہے، لیکن کم سے کم عارف ہندی کے جمال کا درشن کر لیجئے۔

زیرِ نخلے عارف ہندی نژاد   دیدہ ہا از سرمہ اش روشن سواد

موے بر سر بستہ و عریاں بدن   گرد او مارے سفیدے حلقہ زن

آدمی از آب و گل بالا ترے   عالم از دیر خیالش پیکرے

وقت او را گردشِ ایام نے

کار او با چرخِ نیلی فام نے

ان اسرار وحقائق کے متعلق عارف ہندی کے سوالات اور مولانا روم کے جوابات بڑے حکیمانہ ہیں، لیکن طوالت کے خیال سے ان کو قلم انداز کیا جاتا ہے۔

ہندوستان کے مشہور فلسفی شاعر برتری ہری کی زبان سے اس کا یہ فلسفۂ عمل بیان کیا گیا ہے۔

اے خدایان تنک مایہ ز سنگ اندو زخشت

برترے ہست کہ دور است ز دیر و ز کنشت

سجدہ بے ذوقِ عمل خشک و بجائے نہ رسد

زندگانی ہمہ کردار و چہ زیبا و چہ زشت

فاش گویم بہ تو حرفے کہ نہ داند ہمہ کس

اے خوش آں بندہ کہ بر لوحِ دل او را بنوشت

این جملہ نے کہ تو بینی اثر یزداں نیست
چرخ از تست دہم آں رشتہ کہ بر دوک تو رشت
پیش آئینِ مکافاتِ عمل سجدہ گزار
زانکہ خیزد ز عمل دوزخ و اعراف و بہشت

یہ واضح رہے کہ یہ تمام نظمیں اس دور کی ہیں جب وطنیت اور قومیت کے متعلق اقبال کے خیالات بدل چکے تھے، اور جس کے متعلق کہا جاتا ہے کہ ان کا دل قوم و وطن کی محبت سے خالی تھا، لیکن کیا ان نظموں کے بعد بھی یہ کہنا صحیح ہوگا؟

اقبال اور مشرق

اقبال کو نہ صرف ہندوستان بلکہ پورے ایشیا سے محبت تھی، اور ان کا دل اس کی زبوں حالی پر بھی تڑپتا تھا، انھوں نے ایک مثنوی بھی "پس چہ باید کرد اے اقوام شرق" کے نام سے لکھی ہے، جس میں مشرقی قوموں کو خطاب کیا ہے، اس نظم میں کس جوش و خروش سے ایشیا کے شاندار ماضی، اس کے فضائل و مناقب اور کارناموں اور عالم انسانیت پر اس کے احسانات کا ذکر کیا ہے اور اس کو دنیا کی ہدایت و رہنمائی کرنے کی دعوت دی ہے۔

سوز و ساز و درد و داغ از آسیاست
ہم شراب و ہم ایاغ از آسیاست
عشق را ما دلبری آموختیم
شیوۂ آدم گری آموختیم
ہم ہنر ہم دیں ز خاکِ خاورست
رشکِ گردوں خاکِ پاکِ خاورست
وانمودیم آنچہ بود اندر حجاب
آفتاب آمد دلیل آفتاب

هر صدف را گوهرِ نیساں ز ماست — شوکتِ هر بحر از طوفانِ ماست
روحِ خود در سوزِ بلبل دیده ایم — خونِ آدم در رگِ گل دیده ایم
فکرِ ما جویائے اسرارِ وجود — زد نخستیں زخمه بر تارِ وجود
داشتیم اندر میانِ سینه داغ — بر سرِ راہے نهادیم ایں چراغ
اے زمینِ دولتِ تهذیب و دیں — آں یدِ بیضا بر آر از آستیں
خیز و از کارِ اُمم بکشا گره — نشّهٔ افرنگ را از سر بنه

نقشے از جمعیت خاور فگن
داستاں خود را ز دستِ اهرمن

ذیل کی نظم میں یورپ کی مادیت، لادینی، پُر فریب سیاست اور انسانیت پر اس کے جور و ستم کا پردہ فاش کیا ہے، اور ایشیا کی بیداری اور آزادی کا مژدہ سُنایا ہے۔

آدمیت زار نالید از فرنگ — زندگی هنگامه برچید از فرنگ
پس چه باید کرد اے اقوامِ شرق — باز روشن می شود ایامِ شرق
در ضمیرش انقلاب آمد پدید — شب گزشت و آفتاب آمد پدید
یورپ از شمشیرِ خود بسمل فتاد — زیرِ گردوں رسمِ لادینی نهاد
گرگے اندر پوستینِ برّه ؛ — هر زماں اندر کمینِ برّه
مشکلاتِ حضرتِ انساں ازوست — آدمیت را غمِ پنهاں ازوست

در نگاهش آدمی آب و گل است
کاروانِ زندگی بے منزل است

مشہور جرمن شاعر گوئٹے کے مغربی دیوان کے جواب میں جس میں مشرق کو خطاب کیا گیا تھا، مدتوں کوئی صدا نہ اُٹھی، اور بالآخر ایک صدی کے بعد اسی فرزند مشرق نے اس کا جواب دیا، اور بتایا۔

زجانِ بے قرار آتش کشادم
دلے در سینۂ مشرق نہادم

گلِ او شعلہ زار از نالۂ من
چو برق اندر وجودِ او فتادم

اُن کا دل جس طرح عالم اسلامی اور ہندوستان کی غلامی پر دردمند تھا، اسی طرح ابی سینیا کی غلامی پر رنجیدہ اور پُرغم تھا، چنانچہ اٹلی کو اس کے ظلم پر اس طرح ملامت کرتے ہیں۔

یورپ کے کرگسوں کو نہیں ہے ابھی خبر
ہے کتنی زہرناک ابی سینیا کی لاش

ہونے کو ہے یہ مردۂ دیرینہ قاش قاش

تہذیب کا کمال شرافت کا ہے زوال
غارت گری جہاں میں ہے اقوام کی معاش

ہر گرگ کو ہے برۂ معصوم کی تلاش

اے وائے آبروئے کلیسا کا آئینہ
روما نے کر دیا سر بازار پاش پاش

اُن کی اُن نظموں میں بھی جو خالص ملی ہیں، مشرق کی محبت کی چنگاریاں نظر آتی ہیں، چنانچہ سمرنا کی فتح اور ترکوں کی نشأۃ ثانیہ کو وہ تنہا ایک اسلامی حکومت کی کامیابی نہیں سمجھتے بلکہ اس میں ان کو مشرق کی بیداری کے آثار نظر آتے ہیں۔

عروقِ مردۂ مشرق میں خونِ زندگی دوڑا
سمجھ سکتے نہیں اس راز کو سینا و فارابی

پھر اٹھی ایشیا کے دل سے چنگاری محبت کی
زمیں جولانگہِ اطلس قبایانِ تتاری ہے

وہ یورپ کی جمعیت اقوام کی طرح مشرقی قوموں کی جمعیت بنانے کی تعلیم دیتے ہیں، اور اس میں دنیا کی فلاح سمجھتے ہیں۔

پانی بھی مسخّر ہے ہوا بھی ہے مسخّر
کیا ہو جو نگاہِ فلکِ پیر بدل جائے
دیکھا ہے ملوکیتِ افرنگ نے جو خواب
ممکن ہے کہ اس خواب کی تعبیر بدل جائے
طہران ہو اگر عالمِ مشرق کا جنیوا
شاید کرۂ ارض کی تقدیر بدل جائے

ان اشعار سے ظاہر ہے کہ اُن کے دل میں نہ صرف اپنے ملک اور قوم بلکہ پورے ایشیا اور مشرق کی محبت تھی، اور وہ نہ صرف مسلمانوں بلکہ ایشیائی قوموں کی آزادی اور ترقی کے آرزومند تھے۔

یورپ کی نیشنلزم کی مخالفت کے اسباب

البتہ وہ یورپ کی پیدا کردہ نیشنلزم کے جس کی بنیاد نسلی اور جغرافی قومیت و وطنیت بلکہ قوم و وطن پرستی پر ہے، ضرور خلاف تھے، اس لئے کہ یہ قومیت اور وطنیت عالم انسانیت کی دشمن ہے، اور اس سے انسانی وحدت کے بجائے ان میں تفریق اور گروہ بندی پیدا ہوتی ہے، خواہ اس کی ظاہری شکل کتنی ہی دلفریب ہو، لیکن اس کی بنیاد نسلی احساس برتری اور قومی خودغرضی پر ہے، جس کا لازمی نتیجہ کمزور قوموں کے حقوق کی پامالی ان کی تباہی اور جنگ و خونریزی ہے، یہ اسی کا نتیجہ ہے کہ ہر طاقتور اور ترقی یافتہ قوم اپنے مقابلہ میں دوسری کمزور قوموں کو حقیر اور اس پر

حکومت کرنا اپنا حق سمجھتی ہے، اس نسلی قومیت کے جو خونین تماشے صدیوں سے دنیا میں ہو رہے ہیں، اُن سے ہر شخص واقف ہے، گزشتہ ہولناک جنگ، جس کی تباہیوں سے اب تک دنیا کو نجات نہیں ملی ہٹلر کے نسلی برتری ہی کے نعرہ کا نتیجہ تھی، اس نسلی برتری کے جذبہ اور قوم پرستی نے نہ صرف مختلف ملکوں اور قوموں بلکہ ایک ہی قوم میں اشرف و اعلیٰ اور پست و بلند طبقات قائم کر دیے ہیں، یورپ اپنے کو ایشیا سے افضل سمجھتا ہے، ایشیا والوں کو افریقہ کے مقابلہ میں برتری کا احساس ہے، ایک ہی ملک اور ایک ہی قوم میں مختلف پست و بلند طبقوں کی سب سے بڑی مثال ہندوستان ہے۔

دوسرا نتیجہ بین الاقوامی اقتصادی کشمکش ہے، آج ہر طاقتور قوم اپنی اقتصادی اور سیاسی برتری قائم رکھنے کے لئے کمزور قوموں کو غلام رکھنا چاہتی ہے، گزشتہ ساری لڑائیاں اسی کا نتیجہ تھیں اسی کے بدولت ایشیا صدیوں تک یورپ کا غلام رہا، اور آج بھی جب کہ یورپ کی سیاسی گرفت ڈھیلی پڑ گئی ہے اس کو یورپ کی اقتصادی غلامی سے نجات نہیں ملی ہے، اور یہ کشمکش نہ صرف یورپ، ایشیا اور افریقہ کے درمیان بلکہ خود ان براعظموں کے مختلف ملکوں اور قوموں کے درمیان بھی اسی طرح جاری ہے، گزشتہ جنگ عظیم میں یورپ اور امریکہ کی حکومتیں جس طرح آپس میں ٹکرائیں، اور جاپان نے اپنے پڑوسی چین اور برہما کے ساتھ جو کچھ کیا، اور آج یورپین طاقتوں میں جو

کشمکش برپا ہے، جس نے دنیا کے امن وامان کو خطرہ میں ڈال رکھا ہے وہ سب کی نگاہ کے سامنے ہے، اقبال نے اسی دشمن انسانیت قومیت اور وطنیت کی مخالفت کی ہے۔

اقوام جہاں میں ہے رقابت تو اسی سے — تسخیر ہے مقصود تجارت تو اسی سے
خالی ہے صداقت سے سیاست تو اسی سے — کمزور کا گھر ہوتا ہے غارت تو اسی سے

اقوام میں مخلوق خدا بٹتی ہے اس سے
قومیت اسلام کی جڑ کٹتی ہے اس سے

وحدت واخوت کی عالمگیر دعوت

اس بنا پر انہوں نے نسلی وجغرافی قومیت اور وطنیت کے بجائے عالمگیر انسانی وحدت اور اخوت ومحبت کی دعوت دی، جس سے ان کی کوئی کتاب بھی خالی نہیں ہے، مختلف نظموں کے مختلف اشعار ملاحظہ ہوں۔

ہوس نے ٹکڑے ٹکڑے کر دیا ہے نوع انساں کو
اخوت کا بیاں ہو جا محبت کی زباں ہو جا
یہ ہندی وہ خراسانی یہ افغانی وہ تورانی
تو اے شرمندۂ ساحل اچھل کر بے کراں ہو جا

تمیز بندہ و آقا فساد آدمیت ہے
حذر اے چیرہ دستاں سخت ہیں فطرت کی تعزیریں
حقیقت ایک ہے ہر شے کی نوری ہو کہ خاکی ہو
لہو خورشید کا ٹپکے اگر ذرہ کا دل چیریں

نہ افغانیم و نے ترک و تتاریم
چمن زادیم و از یک شاخساریم

تمیز رنگ و بو بر ما حرام است
کہ ما پروردۂ یک شاخساریم

اس سے ظاہر ہے کہ ان کا پیام عالمگیر تھا، اور یہ اعتراض دور ہو گیا کہ ان کے پیام میں عالمگیریت نہیں ہے اور انھوں نے صرف مسلمانوں کو مخاطب بنایا ہے۔ اس میں شبہہ نہیں کہ اُن کے کلام میں جابجا مسلمانوں سے خصوصیت کے ساتھ خطاب ہے، لیکن اس سے اُن کی تعلیم کی عالمگیریت میں فرق نہیں آتا، اس لیے کہ بعض مخصوص نظموں کے علاوہ جو خاص مسلمانوں کے لئے لکھی گئی ہیں، اور جن کی تعداد بہت کم ہے، ان کی وہ نظمیں بھی جن میں مسلمانوں سے خطاب ہے، اپنے فائدہ کے لحاظ سے عام ہیں، مثلاً اُن کی شاعری کا ایک بڑا حصہ قوموں کے عروج زوال، ترقی و تنزل اور موت و حیات کے فلسفہ پر مشتمل ہے، اس میں اگرچہ مسلمانوں سے خطاب کیا گیا ہے، لیکن وہ اصول سب قوموں کے لئے یکساں ہیں، انھوں نے خود بھی اس حقیقت کا اظہار کیا ہے۔ ع مسلم آئین ہوا کافر تو ملے حور و قصور۔ یعنی ان اصولوں پر جو بھی عمل کرے گا وہ کامیاب ہو گا، اس میں مسلم و کافر کی تخصیص نہیں۔

اس قسم کی عام تعلیمات سے ان کا کلام معمور ہے اور اس سے ان کے کلام پر نگاہ رکھنے والے پوری طرح واقف ہیں، اس لیے اس کی مثالوں کے نقل کرنے کی ضرورت نہیں ہے، تاہم اس سے انکار نہیں کہ ان کی بعض تعلیمات مسلمانوں کے لئے مخصوص ہیں، اس کے دو سبب ہیں

ایک یہ کہ گزشتہ چند صدیوں میں نہ صرف ہندوستان بلکہ دنیائے اسلام کے مسلمانوں پر عام زوال طاری ہوگیا تھا، ان کی حکومتیں مٹ گئی تھیں، جو باقی تھیں، وہ بھی باحال زبوں یورپین طاقتوں کے ہاتھوں میں اسیر تھیں، سیاسی زوال کے ساتھ اُن سے مذہبی روح بھی رخصت ہوگئی تھی، اور ان کی حیثیت ایک پسماندہ قوم کی ہو کر رہ گئی تھی، اس لئے اقبال نے ان کو مذہبی تجدید و اصلاح اور سیاسی حیثیت سے اُبھارنے کی بھی کوشش کی، جو نہ کوئی اخلاقی جرم ہے" اور نہ عالمگیر انسانی اخوت کے خلاف ہے۔ گاندھی جی سب قوموں کے دوست تھے، ان کا پیام اخوت عالمگیر تھا لیکن اس کے باوجود وہ ہندو قوم اور ہندو مذہب کے سب سے بڑے محسن تھے، اور انھوں نے ان دونوں میں دوبارہ جان ڈالی، اس لئے اقبال کی مسلمانوں کی مذہبی و سیاسی تجدید و اصلاح کی کوشش کیوں فرقہ پرستی پر محمول کیا جائے جب کہ ان کے کلام میں عالمگیر انسانی اخوت کی دعوت بھی موجود ہے، دوسرا سبب آخر میں بیان کیا جائے گا۔

کیا اقبال نے مسلمانوں کے حصول قوت اور جنگ و خونریزی کی تعلیم دی،

یہ اعتراض بھی کہ اقبال نے اس زمانہ میں جب کہ دنیا امن و سکون کو ترستی ہے، مسلمانوں کو حصول قوت اور جنگ و خونریزی کی تعلیم دی بالکل غلط یا کم از کم غلط فہمی پر مبنی ہے، ان کے بعض اشعار سے جو خاص مقصد کے ماتحت کہے گئے ہیں کلیہ قاعدہ بنا لینا صحیح نہیں، اگرچہ کچھ اشعار میں

حصولِ قوت اور جنگ و مبارزت کی تعلیم ہے، تو سیکڑوں اشعار میں اخوت و محبت اور امن و صلح کی بھی دعوت ہے۔ اولاً حصول قوت اور جنگ و مبارزت دو الگ الگ چیزیں ہیں، حصول قوت کے معنی جنگ کے نہیں ہیں، انھوں نے مسلمانوں کو حصول قوت کی ضرور تعلیم دی ہے، لیکن اس کا سبب مسلمانوں کا زوال اور ان کی تباہی ہے، جس کے اور اسباب میں سے ایک بڑا سبب ان کا ضعف بھی ہے، اس لیے حصول قوت کی تعلیم جنگ و مبارزت کے لیے نہیں بلکہ بقائے حیات کے لیے ہے؛ اس کو جارحانہ قوت پر محمول کرنا صحیح نہیں صدیوں کے زوال سے مسلمانوں کے قوائے عمل بالکل شل ہو گئے تھے، ان میں جان ڈالے بغیر مسلمان زندہ نہیں رہ سکتے تھے، یہ تو نہ صرف سیاسی بلکہ طبعی مسلمات میں سے ہے، کہ کوئی قوم، بلکہ دنیا کی کوئی ہستی قوت کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتی۔

تقدیر کے مفتی کا یہ فتوے ہے ازل سے ہے جرم ضعیفی کی سزا مرگ مفاجات

دوسرے ہر شر اور بدی کا مقابلہ ہمیشہ وعظ و پند اور نیکی و اخلاق سے نہیں کیا جا سکتا، اور کبھی کبھی علاج بالمثل ناگزیر ہو جاتا ہے، بدی کے بدلہ میں نیکی اور دشمنی کے بدلہ میں محبت کا اصول کتنا ہی دلفریب اور روحانی کیوں نہ ہو، ہر موقع پر کامیاب نہیں ہو سکتا، دنیا میں کتنے انسانوں نے حضرت مسیح علیہ السلام کی تعلیم پر عمل کیا، آج بھی امن و صلح کی زبانی تجویزوں کا حشر سب کو معلوم ہے، درحقیقت جب شر اور بدی اور ظلم و جور کی طاقتیں، اخلاقی وعظ و پند سے نہ رکیں تو ان کا مقابلہ قوت سے ضروری ہو جاتا ہے،

ورنہ دنیا میں حق و انصاف اور امن و امان قائم نہیں رہ سکتا، شر کے مقابلہ کے لئے شر کی جو ظاہری شکل اختیار کی جاتی ہے وہ شر نہیں بلکہ درحقیقت خیر بن جاتی ہے۔ تندرست انسانی جسم میں سوئی چبھونا بھی جرم ہے، لیکن جب جسم کا کوئی حصہ ماؤف ہو جائے، تو پوری جسم کی حفاظت کے لئے ماؤف حصہ میں نشتر دینا بلکہ بعض اوقات اس کو کاٹ کر الگ کر دینا ضروری ہو جاتا ہے، اور یہ شر انسان کے لئے خیر بن جاتا ہے، یہی اصول اقوام کے خیر و شر کے لئے بھی ہے، اس لئے اگر بدی اور ظلم و جور کی طاقتیں آمادہ فساد ہوں تو انسانیت کی بھلائی کے لئے اس کا مقابلہ طاقت سے ضروری ہے، ہٹلر اور مسولینی کو دنیائے مسیحیت کا ایک وعظ بھی شر و فساد سے نہ روک سکا، اور بالآخر قوت ہی سے ان کو زیر کرنا پڑا، اس لئے حصول قوت اور خاص اور ناگزیر حالات میں جنگ و مقابلہ کی تعلیم امن و صلح کے خلاف نہیں، بلکہ اس کے لئے ضروری ہے، اس لئے اقبال نے اخوت اور محبت اور امن و صلح کی بھی تعلیم دی ہے، اور حصول قوت کی بھی اور شر اور ظلم و جور کے مقابلہ میں جنگ و مقابلہ کی بھی، دونوں دو مختلف حالتوں کے لئے ہیں، دوستوں امن پسندوں اور نیکی اور بھلائی کے مقابلہ میں مہر و محبت اور امن و صلح کی تعلیم دی ہے۔

یہی مقصود فطرت ہے یہی رمز مسلمانی
اخوت کی جہانگیری محبت کی فراوانی



اس دور کی ظلمت میں ہر قلب پریشاں کو
وہ داغ محبت دے جو چاند کو شرما دے

بے لوث محبت ہو بے باک صداقت ہو
سینوں میں اُجالا کر دل صورت مینا دے

ان کے کلام میں اس قسم کے بکثرت اشعار ہیں لیکن ظلم و جور کے مقابلہ میں جنگ و مقابلہ کی بھی تعلیم ہے۔

اٹھو مری دنیا کے غریبوں کو جگا دو
کاخ اُمرا کے در و دیوار ہلا دو

گرماؤ غریبوں کا لہو سوز یقیں سے
کنجشک فرو مایہ کو شاہیں سے لڑا دو

جس کھیت سے دہقاں کو میسر نہ ہو روزی
اس کھیت کے ہر خوشۂ گندم کو جلا دو

سلطانیِ جمہور کا آتا ہے زمانہ
جو نقش کہن تم کو نظر آئے مٹا دو

انھوں نے جہاں کہیں جنگ و مقابلہ کی تعلیم دی ہے وہ ہمیشہ ظلم و جور کے مقابلہ میں ہے، امن و صلح کے مقابلہ میں نہیں ہے، مہر و محبت، امن و صلح اور جنگ و مبارزت کے بارہ میں ان کا اُصول حسب ذیل اشعار سے واضح ہوگا۔

ہو حلقۂ یاراں تو بریشم کی طرح نرم
رزم حق و باطل ہو تو فولاد ہے مومن

گزر جا بن کے سیلِ تند رو کوہ و بیاباں سے
گلستاں راہ میں آئے تو جوئے نغمہ خواں ہو جا

مصافِ زندگی میں صورتِ فولاد پیدا کر
شبستان محبت میں حریر و پرنیاں ہو جا

جس سے جگرِ لالہ میں ٹھنڈک ہو وہ شبنم		دریاؤں کے دل جس سے دہل جائیں وہ طوفاں

اس توازن کے بغیر حق و انصاف، امن و امان بلکہ دنیا کا نظام قائم نہیں رہ سکتا، حضرت مسیح علیہ السلام کی مطلق امن و صلح اور مہر و محبت کی تعلیم کی سب سے زیادہ مخالفت خود ان کی امت کر رہی ہے، اس لئے کہ یہ تعلیم خلاف فطرت ہے۔

لیکن جس طرح مطلق مہر و محبت کی تعلیم خلاف فطرت ہے، اسی طرح مطلق قوت بھی مضر ہے، اس لئے اقبال اس کے لئے اخلاقی قیود کا پابند ہونا ضروری سمجھتے ہیں، اور مطلق طاقت کو وہ چنگیزی اور زہر ہلاہل سے تعبیر کرتے ہیں۔

اسکندر و چنگیز کے ہاتھوں سے جہاں میں		سو بار ہوئی حضرت انساں کی قبا چاک
تاریخ امم کا یہ پیام ازلی ہے		صاحب نظراں نشۂ قوت ہے خطرناک
اس سیل سبک سیر و زمیں گیر کے آگے		عقل و نظر و علم و ہنر ہیں خس و خاشاک

اس لئے وہ قوت کو مذہب و اخلاق کا پابند بنانا چاہتے ہیں، چنانچہ مسلمانوں کو شجاعت کے ساتھ عدل و صداقت کی بھی تعلیم دیتے ہیں۔

سبق پھر پڑھ صداقت کا عدالت کا شجاعت کا
لیا جائے گا تجھ سے کام دنیا کی امامت کا

اس سے ظاہر ہوا کہ ان کے نزدیک شجاعت کے ساتھ عدل و صداقت ضروری ہے، اور ایسی شجاعت و قوت دنیا کے لئے سراسر خیر و برکت ہے، ان کے نزدیک اصل قوت ایمان عمل اور محبت کی قوت ہے۔

ان کی تعلیم قوت کے سلسلہ میں اُن کے تمثیلی پرند شاہین پر بھی اعتراض کیا جاتا ہے کہ انھوں نے نوجوانوں کو شاہین بننے کی تلقین کی ہے، جو ایک شکاری پرندہ ہے، لیکن درحقیقت اس تمثیل کا مقصد راحت طلبی و تن آسانی عیش و تنعم اور جمود و تعطل کی مخالفت اور جہد و عمل، سادگی و جفاکشی، اور بلند حوصلگی کی تعلیم ہے، جیسا کہ خود اُن کی نظم شاہین سے ظاہر ہے۔

کیا میں نے اُس خاکداں سے کنارا
جہاں رزق کا نام ہے آب و دانہ

بیاباں کی خلوت خوش آتی ہے مجھ کو
ازل سے ہے فطرت مری راہبانہ

نہ باد بہاری نہ گلچیں نہ بلبل
نہ بیماریٔ نغمۂ عاشقانہ

خیابانیوں سے ہے پرہیز لازم
ادائیں ہیں اُن کی بہت دلبرانہ

حمام و کبوتر کا بھوکا نہیں میں
کہ ہے زندگی باز کی زاہدانہ

جھپٹنا پلٹنا پلٹ کر جھپٹنا
لہو گرم کرنے کا ہے اک بہانہ

یہ پورب یہ پچھم چکوروں کی دنیا
مرا نیلگوں آسماں بے کرانہ

پرندوں کی دنیا کا درویش ہوں میں
کہ شاہیں بناتا نہیں آشیانہ

یہ اشعار خود اپنے مقصد کے ترجمان ہیں، ان کے بعد اور کسی دلیل کی ضرورت باقی نہیں رہ جاتی یہ تو اقبال کے کلام سے اس اعتراض کا جواب ہوا، انھوں نے ایک خط میں بھی اس کا جواب دیا ہے، مولوی ظفر احمد صاحب صدیقی کو کسی اعتراض کے جواب میں لکھتے ہیں۔

"معترض کا یہ کہنا کہ اقبال اس دور ترقی میں جنگ کا حامی ہے،

غلط ہے، میں جنگ کا حامی نہیں ہوں، نہ کوئی مسلمان شریعت کے حدود معینہ کے ہوتے ہوئے اس کا حامی ہو سکتا ہے، قرآن کی تعلیم کی رو سے جہاد یا جنگ کی صرف دو صورتیں ہیں، محافظانہ اور مصلحانہ، پہلی صورت میں یعنی اس صورت میں جب کہ مسلمانوں پر ظلم کیا جائے، اور ان کو گھروں سے نکالا جائے، تو مسلمانوں کو تلوار اٹھانے کی اجازت ہے، نہ کہ حکم، دوسری صورت جس میں جہاد کا حکم ہے آیہ ۹-۴۹ میں بیان ہوئی ہے، ان آیات کو غور سے پڑھئے تو آپ کو معلوم ہوگا کہ وہ چیز جس کو سموئیل ہور جمعیت اقوام کے اجلاس میں (COLLECTIVE SECURITY) کہتا ہے، قرآن نے اس کا اصول کس سادگی اور فصاحت سے بیان کیا ہے، اگر گزشتہ زمانہ کے مسلمان مدبرین اور سیاسیین ان آیات پر تدبر کرتے تو اسلامی دنیا میں جمعیت اقوام کو بنے ہوئے آج صدیاں گزر گئی ہوتیں، جمعیت اقوام جو زمانہ حال میں بنائی گئی ہے، اس کی تاریخ بھی یہی ظاہر کرتی ہے، کہ جب تک اقوام کی خودی قانون الٰہی کی پابند نہ ہو، امن عالم کی کوئی سبیل نہیں نکل سکتی، جنگ کی مذکورہ بالا صورتوں کے سوا میں اور کسی جنگ کو نہیں جانتا، جوع الارض کی تسکین کے لئے جنگ کرنا اسلام میں حرام ہے، علیٰ ہذا دین کی اشاعت کے لئے تلوار اٹھانا بھی حرام ہے، شاہین کی تشبیہ محض شاعرانہ نہیں، اس جانور میں اسلامی فقر کے تمام خصوصیات پائے جاتے ہیں، خود دار اور غیرت مند ہے کہ اور کے ہاتھ کا مارا ہوا شکار نہیں کھاتا، بے تعلق ہے، کہ آشیانہ نہیں بناتا، بلند پرواز ہے، خلوت پسند ہے، تیز نگاہ ہے" (مکاتیب اقبال جلد اول ص ۲۰۴، ۲۰۵)

ان تصریحات سے حصول قوت اور جنگ و مقابلہ کے بارہ میں اقبال کا نقطۂ نظر پوری طرح واضح ہو جاتا ہے۔

اسلامی تعلیمات کی تبلیغ و اشاعت اور اسلامی نظام کی دعوت سے اقبال کا مقصد

آخر میں سب سے بڑا یہ اعتراض رہ جاتا ہے کہ اقبال نے اسلامی تعلیمات کی تبلیغ و اشاعت کی ہے، اور دنیا کو اس کے قبول کرنے اور اسلامی نظام اور اسلامی حکومت کے قیام کی دعوت دی ہے، اور اس سے یہ نتیجہ نکالا جاتا ہے کہ وہ اسلام اور مسلمانوں کا غلبہ و اقتدار چاہتے تھے۔

یہ اعتراض موجودہ مذاق کے لحاظ سے بظاہر وقیع معلوم ہوتا ہے، لیکن اس سے جو نتیجہ نکالا جاتا ہے وہ صحیح نہیں، اس بارہ میں اقبال کے نقطۂ نظر اور ان کے مقصد و منشا کو سمجھنے کے لئے کس قدر تفصیل کے ساتھ بحث کرنے کی ضرورت ہے۔

اس میں شبہ نہیں کہ انھوں نے اسلامی تعلیمات کی تبلیغ و اشاعت بھی کی ہے اور دنیا کو اسلامی نظام قبول کرنے کی دعوت بھی دی ہے۔ لیکن اس لئے نہیں کہ وہ خود مسلمان تھے، اور ان کا مذہب اسلام تھا، اس لئے وہ ساری دنیا سے اس کو منوانا ...... اور اس کے ذریعہ مسلمانوں کا غلبہ و اقتدار چاہتے تھے، بلکہ اس لئے اسلامی اصولوں کی دعوت دیتے تھے کہ ان کے نزدیک انہی کے ذریعہ انسانیت کی فلاح اور موجودہ دور کی تمام مشکلات و مسائل کا حل ہو سکتا تھا

اس سے دوسرے مذہبوں کی تنقیص لازم نہیں آتی، اس لئے کہ جیسا کہ

قرآن مجید میں بار بار کہا گیا ہے، اسلام کوئی نیا مذہب نہیں ہے، بلکہ وہی دین فطرت ہے جس کی تعلیم خدا کے تمام سچے پیغمبر شروع سے اب تک دیتے چلے آئے ہیں، اور محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کا لایا ہوا اسلام، ان مذاہب کی اصلاح شدہ اور ان کی آخری تکمیلی شکل ہے، اسی لیئے اسلام نے خدا کے تمام سچے پیغمبروں اور ان کی لائی ہوئی الہامی کتابوں کی تصدیق کو ایمان کا جز قرار دیا ہے، اس کے بغیر کوئی شخص مسلمان ہی نہیں ہو سکتا، گویا اسلام تمام سچے مذاہب کا مصدق اور ان کی اچھی تعلیمات کا مجموعہ ہے، مذاہب کی اصلاح سے یہ مراد ہے کہ پرانے مذاہب کی تعلیمات میں امتدادِ زمانہ اور انسانی تصرفات سے جو تبدیلیاں ہوگئی تھیں، جن سے ان کی ہدایت کی روشنی مدھم پڑ گئی تھی، اسلام نے ان آمیزشوں اور تغیرات کو دور کر کے ان کی تعلیمات کو اصلی شکل میں جلوہ گر کر دیا اور تکمیل کا یہ مطلب ہے کہ تمام گزشتہ مذاہب اپنے زمانہ کے انسانوں کے درجۂ ارتقا اور ان کی ضروریات وحالات کے مطابق تھے، اس لیئے ان کی تعلیمات بھی سادہ اور محدود اور عموماً صرف موٹی موٹی اخلاقی و روحانی امور پر مشتمل تھیں، جو ترقی یافتہ انسانی زندگی کی ہدایت کے لیئے کافی نہیں، اسلام نے گزشتہ مذاہب کی اصلاح کے ساتھ، انسانوں کے لیئے ایک جامع اور مکمل دستور العمل بھی بنا دیا، اس کو تمثیل سے یوں سمجھا جا سکتا ہے کہ مذہب، انسانیت کی تعلیم وتہذیب کا خدائی نصاب ہے اور نصاب پڑھنے والے کی عمر اور عقل وفہم کے مطابق ہوتا ہے اور اس میں تغیر و ترقی کے

ساتھ بدلتا رہتا ہے، اس لئے مذاہب کا نصاب بھی انسانی عقل و شعور کی ترقی اور اس کی ضروریات کے لحاظ سے بدلتا رہا اور مذہب اسلام انسانی عقل و فہم کے بلوغ اور اس کی ترقی کا آخری تکمیلی نصاب ہے، اس لیے وہ تمام گزشتہ مذہبی نصابوں سے زیادہ جامع اور مکمل ہے، پرانے نصاب یعنی گزشتہ سچے مذاہب بھی برحق اور اپنے اپنے زمانہ کے لیے ضروری اور مفید تھے، لیکن وہ انسانی ترقی کی ضروریات کا ساتھ نہیں دے سکتے تھے اور اسلام کے بعد ان کی ضرورت اس لیے باقی نہیں رہی کہ اسلام ان سب کی اچھی تعلیمات کا جامع ہے۔

یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ جو مذاہب جس قدر قدیم ہیں، ان کی تعلیمات اتنی ہی محدود ہیں، اور جس قدر انسانیت ترقی کرتی گئی ہے، اتنی ہی نئے مذاہب کی تعلیمات میں وسعت اور گہرائی آتی گئی ہے، اس کی وجہ یہ ہے کہ انسانیت کے ابتدائی دور میں انسانوں کی عقلیں سادہ اور ضروریات محدود تھیں، اس لیے ان کی ہدایت و رہنمائی کے لئے جو مذاہب آئے وہ بھی سادہ اور محدود تھے، ان کو زیادہ تر خدا اور بندے کے تعلق یعنی عقائد و عبادات سے بحث تھی، یا کچھ موٹی موٹی اخلاقی تعلیمات تھیں، ان کو انسانوں کی دنیاوی زندگی سے بہت کم علاقہ تھا، اس لئے تمام پرانے مذاہب میں یا دنیاوی اور مادی زندگی کے قوانین سرے سے ہی نہیں ہیں، اور اگر کسی مذہب میں ہیں بھی تو بہت محدود، اور نامکمل شکل میں، ان کے مقابلہ میں اسلام چونکہ انسانی عقل و شعور اور تہذیب و تمدن کی ترقی کے

زمانہ کا مذہب ہے، اس لیئے اس کی تعلیمات تمام گزشتہ مذاہب سے زیادہ جامع اور مکمل ہیں، مثلاً گزشتہ مذاہب خاص خاص قوموں کی ہدایت و رہنمائی کے لیئے آئے تھے، ایک خاص زمانہ تک کے لیئے تھے، ان کا مقصد عموماً صرف اخلاقی اصلاح تک محدود تھا، اس لیئے ان کی تعلیمات بھی اُن ہی تک محدود تھیں، ان کے مقابلہ میں اسلام کا دعوےٰ ہے کہ وہ ساری دنیا کی ہدایت و رہنمائی اور ابد تک کے لیئے آیا ہے، اور اس کا مقصد زندگی کے کسی خاص شعبہ اور خاص پہلو کی نہیں۔ بلکہ پورے نظام زندگی کی ہدایت و اصلاح ہے، جس سے دین و دنیا کا کوئی شعبہ بھی مستثنےٰ نہیں اس لیئے اس کی تعلیمات دنیوی اور اُخروی تمام ضروریات پر حاوی ہیں یہ جامعیت و ہمہ گیری اسلام کے علاوہ کسی مذہب کی تعلیمات میں نہیں ہے ان پر تفصیلی بحث نہ ہمارا مقصد ہے، اور نہ اس مختصر مضمون میں اس کی گنجائش ہے، لیکن اس کے بغیر اسلامی تعلیمات کی تبلیغ و اشاعت اور اسلامی نظام کے قیام کی دعوت کے بارہ میں اقبال کا نقطۂ نظر معلوم نہیں ہو سکتا، اور اصل اعتراض باقی رہ جاتا ہے، اس کے علاوہ اسلامی نظام اور اسلامی حکومت کے متعلق عام طور سے بڑی غلط فہمی پھیلی ہوئی ہے، اس کا ازالہ بھی ضروری ہے، مگر..... اس پر تفصیلی بحث طویل ہو گی اس کے لیے مستقل کتاب کی ضرورت ہے، اس لیئے صرف اُن پہلوؤں کو پیش کیا جاتا ہے جو عالم انسانیت کے لیئے ضروری ہیں اور جن پر امن کا مدار ہے۔

اخلاقی اور روحانی تعلیمات سے دنیا کا کوئی سچا مذہب بھی خالی نہیں ہے

اور ان میں بہت سی تعلیمات مشترک ہیں، گو اسلام کی ان تعلیمات کو بھی ایک خاص امتیاز حاصل ہے، اور جو اعتدال و توازن اسلام کی اخلاقی و روحانی تعلیمات میں ہے، وہ کسی مذہب میں نہیں ہے، لیکن اس زمانہ میں کسی نظام اور کسی قانون کے نقص و کمال اور عیب و ہنر کا خواہ وہ دنیاوی ہو یا مذہبی، معیار یہ سمجھا جاتا ہے، کہ اس نے انسان کی دنیاوی زندگی کے مسائل اور مشکلات کا کیا حل پیش کیا ہے، دنیا کی موجودہ مشکلات نے اس سوال کو اور زیادہ اہم بنا دیا ہے، اس لئے آئندہ سطور میں اسی پہلو اور نقطۂ نظر سے اسلامی نظام پر تبصرہ کیا جائے گا۔

اسلام کا دعوٰی ہے کہ وہ دین کامل ہے، اور ابد تک کے لئے آیا ہے، اور اس کا بنانے والا علیم و خبیر ہے، جس کی نگاہ سے حال و مستقبل کوئی زمانہ بھی پوشیدہ نہیں ہے، لیکن اصول ارتقا بھی اسی کا بنایا ہوا ہے، اور یہ اس کے علم میں تھا کہ زمانہ کی رفتار اور ترقی کے ساتھ ساتھ انسانوں کی ضروریات بدلتی اور بڑھتی رہیں گی، اور نئے نئے مسائل پیدا ہوتے رہیں گے، اس لئے اپنے جامع اور مکمل قانون کے باوجود اسلام نے نئے مسائل میں علمار کو اجتہاد کی اجازت دی، یعنی ان مسائل میں جو عہد رسالت میں موجود نہیں تھے، اور جن کے متعلق قرآن و حدیث میں احکام نہیں ہیں، اسلام کی بنیادی روح کو قائم رکھتے ہوئے نئے قوانین کے بنانے اور پرانے فقہی جزئیات میں ضرورت کے مطابق ترمیم کرنے کا اختیار دیا ہے چنانچہ عہد فاروقی میں اور اس کے بعد بھی جب اسلامی مملکت کی توسیع کے ساتھ نئے مسائل پیدا ہوئے

تو اس قسم کے بہت سے نئے قوانین بنائے گئے، اس اصول سے اسلام کا دامن ہر ہر زمانہ کی ضروریات کی تکمیل کے لئے وسیع ہو گیا، لیکن یہ کام ان ہی علما کا ہے جن میں علم و اجتہاد کے ساتھ تقوے و دیانت کا بھی اجتماع ہو، اس تمہید کے بعد نئے دور کے اہم مسائل پر نگاہ ڈالی جاتی ہے، اس زمانہ میں سب سے زیادہ اہم، پیچیدہ اور مشکل مسئلہ سیاسی اور معاشی کشمکش کا ہے، جس نے دنیا کا امن و امان خطرہ میں ڈال دیا ہے، ان دونوں مسئلوں کا اصل اور بنیادی سبب نسلی اور جغرافی قوم و وطن پرستی اور لادینی سیاست ہے، یعنی ہر قوم تمام اخلاقی پابندیوں سے آزاد ہو کر صرف اپنی قوم کی سیاسی اور معاشی برتری چاہتی ہے، جس کا لازمی نتیجہ قوموں کی کشمکش اور بدامنی ہے، اس کا حل اسلام نے ایک تو یہ کیا ہے کہ نسلی اور جغرافی گروہ بندی کو مٹا کر عالمگیر انسانی اخوت و محبت کی تعلیم دی ہے، حدیثوں میں اس قسم کی بکثرت تعلیمات ہیں، مثلاً۔

"آپس میں ایک دوسرے سے کینہ اور حسد نہ کرو اور نہ ایک دوسرے سے روگردانی کرو، اور خدا کے سب بندے مل کر بھائی بھائی بن جاؤ"۔ (بخاری)

"ساری مخلوق خدا کا کنبہ ہے"۔ (ابوداؤد)

"عربی کو عجمی پر اور عجمی کو عربی پر، سرخ قوموں کو سیاہ قوموں پر اور سیاہ قوموں کو سرخ قوموں پر کوئی فضیلت نہیں مگر خدا ترسی کی بنا پر"۔ (مسند احمد بن حنبل)

تمام انسانوں کو ایک دوسرے کے ساتھ لطف و محبت اور رحم و کرم کی

تلقین ہے "کہ تم (انسان) زمین والوں پر رحم کرو، تو آسمان والا (خدا) تم پر رحم کرے گا" (مستدرک حاکم) اسی مفہوم کی دوسری حدیث ہے کہ "جو بندوں پر رحم نہیں کرتا، اس پر خدا رحم نہیں کرتا" (بخاری)

ترمذی میں ہے کہ "جو اپنے لیئے پسند کرتے ہو وہی دوسروں کے لیئے پسند کرو تب مسلمان بنو گے"

ان تعلیمات میں مسلم اور غیر مسلم کی کوئی تخصیص نہیں اور اس میں کا فرد مسلمان سب برابر ہیں، قرآن مجید نے دشمنوں کے ساتھ بھی عدل و انصاف کے قائم رکھنے کا حکم دیا ہے۔

کسی قوم کی عداوت تم کو اس پر آمادہ نہ کرے کہ تم عدل نہ کرو، ہر حال میں انصاف کرو کہ یہ بات تقوے کے قریب ہے۔ (سورہ بقر)

اس سے زیادہ عالمگیر انسانی اخوت و محبت کی اور کیا تعلیم ہو سکتی ہے؟۔

اس کی دوسری تدبیر یہ کی کہ انسانی اخوت کی بنیاد نسل اور وطن کے بجائے افکار و تصورات کے اشتراک پر رکھی، اس حقیقت کو اب بڑے بڑے مفکرین و مدبرین مانتے ہیں کہ عالمگیر انسانی اخوت کا ذریعہ ان میں افکار و تصورات کا اشتراک اور مقاصد اور نصب العین کی وحدت ہے، جس کو ان الفاظ میں بھی کہا جا سکتا ہے، کہ جب تک انسانی فلاح و سعادت کے اساسی اصولوں اور ان کے بنیادی حقوق کو تمام قومیں نہ مان لیں گی، اس وقت تک نہ ان میں اتحاد ہو سکتا ہے اور نہ امن و امان کا قیام ممکن ہے، اس کی

تدبیریں بھی ہوتی رہتی ہیں، پرانی جمعیۃ الاقوام اور نیا ادارہ اقوام متحدہ (یو، این، او) سب اسی کی تدبیریں ہیں، لیکن ان میں سے کوئی بھی قومی اور وطنی خود غرضی سے پاک نہیں، اور وہ صرف بڑی قوموں کا آلہ کار ہیں، اس لئے ان کے ذریعہ اصل مقصد میں کامیابی نہیں ہوسکتی، لیگ آف نیشنز کا حشر سب کو معلوم ہے، جغرافی و نسلی قومیت اور وطنیت کے تصور کے ساتھ انسانی فلاح کی کوئی تدبیر کبھی کامیاب نہیں ہوسکتی، اس کا صحیح علاج عالمگیر انسانی اخوت و مساوات ہے، جس کی اسلام نے تعلیم دی ہے، بقول اقبال۔

تفریقِ ملل حکمتِ افرنگ کا مقصود | اسلام کا مقصود فقط ملتِ آدم
مکہ نے دیا خاکِ جنیوا کو یہ پیغام | جمعیتِ اقوام کہ جمعیتِ آدم

جب تک قوموں میں قومی اور وطنی تفریق قائم رہے گی، اس وقت تک قومی اور نسلی تفوق و برتری کا جذبہ بھی باقی رہے گا۔

معاشی کشمکش کا اصل سبب بھی دراصل یہی تفریق ہے، اس لئے اس کا علاج بھی انسانی اخوت و مساوات ہے، جب ہر قوم دوسری قوم کو اپنے برابر سمجھنے لگے گی اور اپنے تفوق و امتیاز کے لئے دوسروں کے حقوق غصب نہ کرے گی، تو معاشی کشمکش بھی نہ پیدا ہوگی، اس اصولی علاج کے علاوہ اسلام نے اپنا معاشی نظام ایسا متوازن بنایا ہے کہ اگر اس پر صحیح طریقہ سے عمل کیا جائے، تو نہ غیر معمولی ثروت ایک شخص یا ایک طبقہ کے پاس جمع ہوگی جسے سرمایہ داری سے تعبیر کیا جاتا ہے، اور نہ غربت و افلاس پیدا ہوگا، جو معاشی کشمکش کا اصل سبب ہے، اس لئے اسلامی نظام معاشیات میں غیر معمولی

ناہمواری کا امکان ہی نہیں ہے کہ ایک شخص تو قارون بن جائے، اور دوسرے کو پیٹ بھر کر کھانا بھی نصیب نہ ہو، اس موقع پر اس کی تصریح کر دینا ضروری ہے، کہ اسلام نے ذاتی املاک اور جائز طریقہ سے حاصل کی ہوئی دولت کو منع نہیں کیا ہے، بلکہ اس کی خرابیاں دور کر کے اس کی اصلاح کر دی ہے، اسلام میں صرف وہ سرمایہ داری حرام ہے، جس میں خدا اور بندوں کے حقوق نہ ادا کیے گئے ہوں، لیکن اگر ان حقوق کو ادا کیا جائے تو غیر معمولی سرمایہ داری پیدا ہی نہیں ہو سکتی۔

سرمایہ داری کی اصلاح اور اس کی خرابیوں کو دور کرنے کی اسلام نے قانونی اور اخلاقی دونوں شکلیں اختیار کی ہیں، ان پر تفصیلی بحث بہت طویل ہے، اس کا خلاصہ یہ ہے کہ اس نے دولت میں خدا، رسول، ذوی القربیٰ، یتامیٰ مساکین، پڑوسی اور دوسرے تمام ضرورت مند اور اہل حاجت کا حق رکھا ہے اور اس کی مصلحت یہ بیان کی ہے کہ

کی لا یکون دولۃ بین الاغنیاء منکم۔

یعنی تا کہ دولت محض چند دولت مندوں میں گھر کر نہ رہ جائے بلکہ گردش کرتی رہے۔

اقتصادی ناہمواری اور معاشی کشمکش کا سب سے بڑا سبب یہی ہے کہ موجودہ سرمایہ دارانہ نظام میں دولت چند دولت مندوں میں خواہ وہ اشخاص ہوں یا طبقات گھر کر رہ جاتی ہے، اگر وہ تمام طبقوں میں پھیلا دی جائے تو خود بخود اقتصادی ناہمواری ختم ہو جائے گی، اس لیے اسلامی مالیات کے اس بنیادی اصول پر عمل کرنے سے ساری دنیا کی اقتصادی گتھی سلجھ سکتی ہے، اسلامی

تعلیمات کی دو حیثیتیں یا دو مدارج ہیں، ایک قانونی جس کو اصطلاح میں شریعت کہتے ہیں، دوسرے اخلاقی جس کو احسان سے تعبیر کرتے ہیں، شریعت کے قوانین کی پابندی ہر مسلمان پر ضروری ہے، یعنی جو اس سے سرتابی کرے گا حکومت اس سے بجبر منوائے گی لیکن کچھ اخلاقی تعلیمات ایسی ہیں جن کی حیثیت قانون کی تو نہیں ہے، یعنی حکومت اُن کی پابندی پر مجبور نہ کرے گی، لیکن ان پر عمل کے بغیر کوئی مسلمان مومن کامل نہیں ہو سکتا، اسلام نے ان دو طریقوں سے سرمایہ داری کی خرابیوں کی اصلاح کی ہے، اور اس کے لئے قانونی شکلیں یہ اختیار کیں۔

(۱) ہر مسلمان کی املاک میں اس کے مرنے کے بعد وراثت جاری کی، جس سے اشخاص کی دولت ہمیشہ تقسیم ہوتی رہے گی (۲) زمین کو حکومت کی ملک قرار دیا، جس سے جاگیرداری کا انسداد ہو گیا (۳) سونا چاندی نقد سکہ سونا چاندی اور ان کے زیورات اور ہر قسم کے تجارتی مال پر مسلمانوں کے لئے زکوٰۃ فرض کی، جس کی شرحیں مختلف ہیں (۴) زرعی پیداوار میں مسلمانوں پر زکوٰۃ جس کو عشر کہتے ہیں، فرض کی، اور غیر مسلموں پر خراج مقرر کیا (۵) تجارتی مال کی برآمد پر عشور یعنی چنگی اور ڈیوٹی لگائی (۶) معدنیات اور زمین کے تمام دفینوں میں پانچواں حصہ حکومت کا قرار دیا (۷) اسی طریقہ سے مال غنیمت میں خمس مقرر کیا، (۸) سود کو جو سرمایہ داری کا بڑا ذریعہ ہے، حرام مطلق قرار دیا (۹) احتکار یعنی ذخیرہ اندوزی، سٹہ بازی، اور اس قسم کی تمام دوسری ناجائز تجارتوں کو جن سے سرمایہ داری کو ترقی ہوتی ہے، اور عوام کو نقصان پہونچتا ہے

حرام قرار دیا۔

یہ وہ قوانین ہیں جن کی پابندی پر ہر مسلمان قانوناً مجبور ہے اور ان ٹیکسوں کو حکومت وصول کرے گی، اس میں سے صدقات و زکوٰۃ کی آمدنی کے مصارف میں بڑا مصرف غربا و مساکین ہیں، صدقات کا مصرف خود قرآن پاک نے متعین کر دیا ہے، جن میں فقراء و مساکین بھی ہیں انما الصدقات للفقراء والمساکین الخ، زکوٰۃ کے متعلق بخاری میں ہے کہ

توخذ من اغنیاءھم و — یعنی دولت مندوں سے وصول کی جائے گی

ترد علی فقراءھم۔ — اور غربا میں تقسیم کی جائے گی۔

چنانچہ بیت المال کی زکوٰۃ و صدقات کی آمدنی کا ایک حصہ غربا و مساکین کے لئے مخصوص ہوگا، جو بلا امتیاز مسلم و غیر مسلم تمام حاجت مندوں پر صرف کیا جائے گا، حضرت عمرؓ نے اپنے زمانہ میں معذور و مجبور یہودیوں اور عیسائیوں کے روزینے بھی بیت المال سے مقرر کر دیئے تھے، کیونکہ ان کے نزدیک کلام مجید کی اس آیت انما الصدقات للفقراء والمساکین الخ میں فقراء سے مراد مسلمان اور مساکین سے مراد اہل کتاب ہیں (کتاب الخراج امام ابو یوسف) یہ طریقہ بنی امیہ کے زمانہ میں بھی جن کی حکومت خالص دنیاوی تھی، جاری رہا، چنانچہ ولید بن عبدالملک کے زمانہ میں پوری اسلامی قلمرو کے معذور، ناکارہ اور اپاہج لوگوں کے روزینے اور اندھوں کی رہنمائی، اور اپاہجوں کی خدمت کے لئے آدمی مقرر تھے[1]، اسلامی بیت المال میں نادار لوگوں کے قرض کی ادائگی کی

---

[1] تاریخ الخلفاء ص ۲۲۴ و طبری ج ۸ ص ۱۲۷۱۔

بھی ایک مد ہے۔

یہ تو سرمایہ داری کی اصلاح کی قانونی شکلیں اور سرمایہ داروں کی دولت میں غریبوں کے قانونی حقوق ہیں، اس کے علاوہ اسلام نے اس کے اخلاقی طریقے بھی اختیار کیے، چنانچہ ایک طرف تو اس نے جائز طریقے سے کسب دولت کی ممانعت نہیں کی بلکہ اس کی حوصلہ افزائی کی ہے، دوسری طرف دولت کی محبت اور اس کو خزانہ بنانے کی سخت مذمت کی ہے، چنانچہ کلام مجید اور احادیث نبوی میں اس کی بڑی مذمت اور انفاق فی سبیل اللہ اور صدقات اور خیرات کی بڑی تاکید کی ہے، اور دولتمندوں پر اتنی اخلاقی ذمہ داریاں عائد کردی ہیں، کہ اگر وہ ان کو پوری کریں، تو دولت مشکل ہی سے جمع ہوسکتی ہے، یا کم از کم کوئی انسان ننگا بھوکا نہیں رہ سکتا، ایک حدیث میں یہاں تک ہے کہ "جو شخص خود شکم سیر ہوکر سوئے، اور اس کا پڑوسی اس کے پہلو میں بھوکا رہے تو وہ مومن نہیں ہے[1]" اس کے علاوہ دولت کی برائیوں کی اصلاح اور افلاس و غربت کو مٹانے کے متعلق بہت سے احکام اور تعلیمات ہیں، جن کے تفصیلی ذکر کی اس مختصر بحث میں گنجائش نہیں ہے۔

اسی کے ساتھ گداگری اور مفت خوری کے تدارک کے لئے اسلام نے تندرست آدمیوں کو گداگری کی ممانعت اور قوت بازو کے ذریعہ معاش پیدا کرنے کی تاکید کی ہے، اور توانا و تندرست آدمیوں کے لئے صدقہ لینا ناجائز قرار دیا، ترمذی میں ہے کہ "صحیح و تندرست اور غیر محتاج کے لئے صدقہ

---

[1] مشکوٰۃ و ادب المفرد امام بخاری۔

لینا جائز نہیں ہے[1]"

مختلف پیرایوں میں صدقہ و خیرات سے بچنے کی تعلیم دی ہے ایک حدیث میں ہے کہ "صدقہ لوگوں کے ہاتھ کا میل ہے[2]" ایک دوسری حدیث میں ہے کہ "اوپر کا ہاتھ یعنی دینے والا نیچے کے ہاتھ یعنی لینے والے سے بہتر ہے[3]"

گداگری کی سخت مذمت کی ہے کہ "جو شخص ہمیشہ مانگتا پھرتا ہے وہ قیامت کے دن اس طرح آئے گا کہ اس کے چہرہ پر گوشت کا ایک ٹکڑا بھی نہ ہوگا[4]، یعنی وہ دنیا میں گداگری کر کے اپنے چہرہ کی رونق، اور آبرو کھو چکا ہے"

اور محنت مزدوری کر کے پیٹ پالنے والے کو صدقہ لینے والے سے بہتر قرار دیا ہے، آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ "قسم ہے اُس ذات کی جس کے قبضۂ قدرت میں میری جان ہے تم میں سے کسی کا رسی لے کر لکڑی کا بوجھ اٹھانا اس سے کہیں بہتر ہے کہ وہ کسی سے بھیک مانگے، جس کو اختیار ہے کہ دے یا نہ دے[5]"

ایک مرتبہ ایک حاجت مند صحابی نے آپ سے خیرات مانگی۔ آپ نے اُن سے پوچھا تمہارے پاس کچھ ہے، انھوں نے جواب دیا، ایک ٹاٹ اور ایک پیالہ ہے، آپ نے اس کو منگا کر خود نیلام فرمایا، اور اُس کی قیمت سے سائل کو ایک کلھاڑی خرید دی۔ اور فرمایا کہ جاؤ جنگل سے لکڑیاں کاٹ کر بیچو۔

---

[1] ترمذی، کتاب الزکوٰۃ۔ [2] مسلم، کتاب الزکوٰۃ، باب ترک استعمال آل النبی الصدقہ۔ [3] بخاری، کتاب الزکوٰۃ، باب اتقوا النار ولو بشق تمرۃ۔ [4] ایضاً من سئل الناس تکثرا۔ [5] ایضاً کتاب الزکوٰۃ، باب کراہۃ المسئلہ۔

انھوں نے اس پر عمل کیا، اُن کی محنت میں خدا نے اتنی برکت دی کہ اُن کو پھر کبھی احتیاج نہیں ہوئی[1]۔

لیکن اگر ان تدبیروں کے بعد بھی کچھ معذور و مجبور اشخاص صدقہ و خیرات کے مستحق باقی رہ جائیں، تو ان کو بھی عزت نفس و خودداری قائم رکھنے کی تعلیم ہے، حدیث میں ہے مسکین وہ نہیں ہے جس کو ایک لقمہ دو لقمے دے کر لوٹا دیتے ہیں، بلکہ مسکین وہ ہے جو احتیاج کے باوجود سوال کرنے سے حجاب کرتا ہے اور لوگوں سے گڑ گڑا کر نہیں مانگتا[2]۔

غیور و خوددار محتاجوں کی خود قرآن نے مدح کی ہے، کہ وہ ایسے ہوتے ہیں کہ ناواقف لوگ اُن کی خودداری اور سوال کی ذلت سے بچنے کے سبب سے اُن کو دولت مند سمجھتے ہیں، اور تم (آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم) اُن کو بشرہ سے پہچانتے ہو، یہ لوگوں سے لپٹ کر نہیں مانگتے، (بقرہ - ۳۷)

غریبوں کو ذلت نفس سے بچانے کے لئے دولت مندوں کو حکم دیا، کہ اگر تم علانیہ صدقہ دو تو بھی بہتر ہے، لیکن فقرا کو چھپا کر دینا تمھارے لئے زیادہ بہتر ہے۔ (بقرہ - ۳۷)

حدیث میں مخفی صدقہ کے بڑے فضائل ہیں، مسلم میں ہے کہ "بہترین صدقہ وہ ہے، جو اس طرح دیا جائے کہ داہنے ہاتھ سے دیا جائے، اور ہاتھ کو خبر نہ ہو[3]۔

---

[1] ابوداؤد، کتاب الزکوٰۃ ۔ [2] بخاری، کتاب الزکوٰۃ، باب قول اللہ عزوجل لا یسئلون الناس الحافا ۔ [3] مسلم، کتاب الزکوٰۃ، باب فضل اخفاء الصدقہ ۔

نمائش کے لئے صدقہ دینے، صدقہ دینے کے بعد احسان جتانے، طعنہ دینے، ایذا پہونچانے اور ان تمام طریقوں کی جس سے غریبوں کی خودداری مجروح ہوتی ہو، بڑی مذمت ہے۔

غرض اسلام نے ہر پہلو سے سرمایہ اور غربت دونوں کی اصلاح اور برائیاں دور کرنے کی کوشش کی ہے، اگر ان تمام قوانین اور تعلیمات پر پورا عمل کیا جائے، تو نہ غیر معمولی سرمایہ داری پیدا ہو سکتی ہے اور نہ کوئی غریب ننگا بھوکا رہ سکتا ہے، خلفائے راشدین کے مقدس دور کا ذکر نہیں، حضرت عمرؓ بن عبدالعزیز کے زمانہ میں جنھوں نے اسلامی نظامِ حکومت کے احیاء کی کوشش کی تھی، اور ان کو کل دو سال میں اس کا موقع ملا تھا، ملک میں اتنی آسودہ حالی پیدا ہو گئی تھی کہ اسلامی مملکت میں صدقہ لینے والے نہیں ملتے تھے، اور غربا و مساکین خود صدقہ ادا کرنے کے لائق ہو گئے تھے۔[1]

لیکن بہتر سے بہتر قوانین اور اعلیٰ سے اعلیٰ تعلیم بغیر عمل کے بالکل بیکار ہے، اور عمل کی دو ہی صورتیں ہو سکتی ہیں، ایک یہ کہ وعظ و پند اور تعلیم و تلقین کے ذریعہ لوگوں میں عمل کی روح پیدا کی جائے، دوسرے یہ کہ نہ ماننے والوں کو جبر و قوت سے منوایا جائے، پہلی صورت صالح اور سلیم الفطرت انسانوں کے لئے ہے، عام لوگوں کے لئے قانونی مواخذہ کا خوف ضروری ہے ورنہ دنیا کا کوئی نظام بھی قائم نہیں رہ سکتا، اس لئے اسلام نے ان دونوں طریقوں کو اختیار کیا، اور دوسرے طریقہ کے لئے قوت نافذہ یعنی حکومت

---

[1] سیرۃ عمر بن عبدالعزیز ابن جوزی ص ۸۵۔

ضروری ہے، اقبال نے اسی نقطۂ نظر سے حکومت الٰہیہ کے قیام کی دعوت دی ہے، مسلمانوں کو بھی انھوں نے اسی لئے مخاطب کیا ہے، کہ پہلے خود ان میں عمل کی روح پیدا کی جائے، پھر ان کو نمونۂ عمل بنا کر ان کے ذریعہ اسلامی نظام کا احیا کیا جائے۔

لیکن جیسا کہ اوپر لکھا جا چکا ہے کہ اقبال کی حکومت الٰہیہ کا تصور زمین کے کسی خطہ میں مسلمان قوم کی سیاسی حکومت نہیں، بلکہ صحیح اسلامی حکومت ہے، جس کا نظام قرآنی قوانین و احکام اور احادیث نبوی پر مبنی ہو ورنہ دنیا میں مسلمانوں کی سیاسی حکومتوں کی تو آج بھی کمی نہیں، اس کے لئے نئی دعوت کی کیا ضرورت تھی، اقبال نے اسلامی حکومت کے اصلی تصور کو خود اپنی نظم حکومت الٰہیہ میں واضح کیا ہے۔

بندۂ حق بے نیاز از ہر مقام   نے غلام او را نہ او کس را غلام

بندۂ حق مرد آزاد است و بس   ملک و آئینش خداداد است و بس

رسم و راہ و دین و آئینش ز حق   زشت و خوب و تلخ و نوشینش ز حق

عقل خود بیں غافل از بہبود غیر   سود خود بیند نہ بیند سود غیر

وحی حق بینندۂ سود ہمہ   در نگاہش سود و بہبود ہمہ

عادل اندر صلح و ہم اندر مصاف   وصل و فصلش لا یراعی لا یخاف

بندۂ حق یعنی حکومت الٰہیہ کا حکمراں یا خلیفہ دنیا کی ہر چیز سے بے نیاز ہوتا ہے، نہ خود وہ کسی کا غلام ہوتا ہے، اور نہ کسی دوسرے کو غلام بناتا ہے، وہ ایک آزاد انسان ہوتا ہے، اس کا ملک اور

اس کے آئین و قوانین سب خدا کا عطیہ ہوتے ہیں، اس کی رسم و راہ اس کا دین و مذہب اس کے آئین و قوانین، اس کی برائی و بھلائی، اس کی تلخی و شیرینی، سب منجانب اللہ ہوتی ہے، اس لئے کہ عقل خود بیں میں یہ خرابی ہے، کہ اس کی نظر ہمیشہ اپنے فائدہ پر رہتی ہے، خواہ وہ شخصی ہو یا قومی، اس کے مقابلہ میں خدا کی وحی کی نظر سارے انسانوں کے فائدہ پر رہتی ہے اور وہ سب کے سود و بہبود کو دیکھتی ہے (اس لئے وحی الٰہی کے ذریعہ جو قانون اور نظام حکومت بنے گا اس میں ساری دنیا کی بھلائی کا لحاظ ہوگا) وہ صلح ہو یا جنگ، ہر حالت میں عدل و انصاف پر قائم رہتی ہے، اس کے میل جول اور جدائی میں کسی کا خوف اور کسی کی رعایت نہیں ہوتی۔

ان اشعار خصوصاً پانچویں شعر سے ظاہر ہے کہ اقبال کی حکومت الٰہیہ کا مقصد قرآنی احکام کے مطابق حکومت ہے۔

مذہبی حکومت کے متعلق غلط فہمی کا سبب

مذہبی حکومت کے متعلق ایک عام غلط فہمی ہے اور اس کے معنی یہ سمجھے جاتے ہیں کہ جس میں دوسرے مذہب والوں کے کوئی حقوق اور ان کے لئے عزت و آبرو کے ساتھ رہنے کی کوئی گنجائش نہ ہو، کم از کم اسلام کی مذہبی حکومت کے متعلق یہ خیال بالکل غلط ہے، اس کی تفصیل آئندہ بیان کی جائے گی۔

درحقیقت یہ غلط فہمی یورپ کی پھیلائی ہوئی ہے، اس کا ایک سبب تو یہ ہے کہ عیسائی مذہب کی بنیاد ترک دنیا پر ہے، جس میں حکومت کی کوئی گنجائش نہیں ہے، اس لئے اس میں حکومت کا کوئی آئین بھی نہیں ہے

اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے اس قول کی غلط تفسیر نے کہ جو قیصر کا حصہ ہے سو قیصر کو دو، اور جو خدا کا ہے سو خدا کو دو، عیسائی مذہب میں اور بھی دین و دنیا میں علیحدگی پیدا کر دی، لیکن سیاست سے مذہب کی بے دخلی کا اصل سبب یہ ہے کہ گو عیسائی مذہب میں حکومت کی گنجائش نہیں ہے، لیکن قرون وسطے میں کلیسا کا اقتدار اتنا بڑھ گیا تھا، کہ حکومت پر بھی غالب آ گیا تھا، اور اس کی حیثیت کنگ میکر کی ہو گئی تھی، ارباب کلیسا جس کو چاہتے تھے، تخت پر بٹھلاتے تھے، اور جس کو چاہتے تھے اتار دیتے تھے، اور چونکہ اُن کے پاس حکومت کا کوئی مذہبی قانون نہیں تھا، اور وہ خالص دنیادار اور مذہبی روح سے بالکل خالی تھے، اس لیے اپنا اقتدار قائم رکھنے لیے وہ سب کچھ کرتے تھے، جو دنیاوی بادشاہ اپنی حکومت کی بقا کے لئے کر سکتے ہیں، بلکہ ان کی سفاکیاں اور عیش پرستیاں اُن سے بھی بڑھ گئی تھیں، جس پر یورپ کے قرونِ وسطےٰ کی تاریخ شاہد ہے، اس سے ہر تاریخ داں واقف ہے اس کا نتیجہ کلیسا کے خلاف بغاوت کی شکل میں ظاہر ہوا اور بڑی خونریز معرکہ آرائیوں کے بعد کلیسا کی قوت اور اس کا اقتدار ختم ہو گیا، یہ وہ زمانہ تھا جب یورپ میں علم و عقل کی روشنی پھیلنا شروع ہو گئی تھی، اس لیے کلیسا کا اقتدار ختم ہونے کے بعد ارباب کلیسا کی غلطیوں اور ان کی زیادتیوں کی سزا میں نہ صرف مذہب کو سیاست سے خارج کر دیا گیا، بلکہ سرے سے مذہب ہی کی وقعت جاتی رہی، لیکن اسلام میں جیسا کہ اوپر بھی لکھا گیا ہے، دین و دنیا الگ الگ نہیں، بلکہ ایک دوسرے کی تکمیل کا ذریعہ ہیں، اور اس کے نزدیک جسم و روح

سے مل کر کامل انسان بنتا ہے، اس لیئے اس کی تعلیمات بھی ان دونوں کی ضروریات پر حاوی ہیں، اور اس میں دینی و اخلاقی تعلیمات کے ساتھ حکومت کا بھی پورا آئین موجود ہے، اقبال نے ان واقعات کو بڑی خوبی کے ساتھ نظم کیا ہے۔

کلیسا کی بنیاد رہبانیت تھی — سماتی کہاں اس فقیری میں میری
خصومت تھی سلطانی و راہبی میں — کہ وہ سربلندی ہے یہ سربزیری
سیاست نے مذہب سے پیچھا چھڑایا — چلی کچھ نہ پیر کلیسا کی پیری
ہوئی دولت و دیں میں جس دم جدائی — ہوس کی امیری ہوس کی فقیری
دوئی ملک و دیں کے لیئے نامرادی — دوئی چشم تہذیب کی نابصیری
یہ اعجاز ہے ایک صحرا نشیں کا — بشیری ہے آئینہ دار نذیری

اسی میں حفاظت ہے انسانیت کی
کہ ہوں ایک جنیدی و اردشیری

سیاست سے مذہب کی علیحدگی کے بعد اگرچہ حکومتیں کلیسا کے اقتدار سے آزاد ہو گئیں، لیکن ان میں شخصی حکومتوں کی تمام خرابیاں موجود تھیں، اور ارباب کلیسا مذہب کے نام پر جو مظالم کرتے تھے، وہ اب سیاست کے نام سے ہونے لگیں، جب یہ شخصی استبداد حد سے بڑھ گیا، تو اس کے خلاف بھی عوامی اور جمہوری تحریکیں شروع ہوئیں، جس کا نتیجہ انقلاب فرانس کی شکل میں ظاہر ہوا، اس وقت سے یورپ میں شخصی حکومتوں کے بجائے جمہوری نظام کا آغاز ہوا، گو جمہوری اور عوامی حکومت کی اصطلاح بظاہر بڑی دلفریب ہے، اور اس میں شبہ نہیں کہ جمہوریت نے شخصی استبداد کا

خاتمہ کر دیا، لیکن جمہوریت کے قیام کے بعد شخصی استبداد کے بجائے جماعتی اور قومی و وطنی استبداد شروع ہو گیا، اور شخصی حکمراں اپنے ذاتی مفاد کے لئے جو بے عنوانیاں کرتے تھے، وہی برسرِ حکومت طبقہ اپنے اقتدار اور اپنے قومی و وطنی مفاد کے لئے دوسری قوموں کے ساتھ کرنے لگا اور اس کے جواز کے لئے وطنیت اور قومیت کے بُت تراشے گئے، چنانچہ اسی زمانہ میں ایشیا پر یورپ کی یلغار شروع ہوئی، اور ان ہی جمہوری حکومتوں نے اس کے بڑے حصہ کو اپنا غلام بنا لیا، اور اپنے سیاسی و اقتصادی مفاد کے لئے انھوں نے جس طرح مشرقی ملکوں کو لوٹا، اور اہل مشرق کو ذلیل و خوار کیا اس سے ہر تاریخ داں واقف ہے۔

لیکن اہل مغرب اپنے جلو میں ایک دلفریب تمدن اور نئے علوم کی فوج بھی لائے تھے، اس سے مشرقی ممالک اس قدر مرعوب و مسحور ہوئے کہ وہ ہر شعبۂ زندگی میں فخریہ اُن کی تقلید کرنے لگے، چنانچہ جمہوریت کی برکتوں کا غلغلہ بھی سارے مشرق میں پھیل گیا، اور اس کے بعد یہاں بھی جو نئے نظامِ حکومت قائم ہوئے ان کی بنیاد جمہوریت پر رکھی گئی، لیکن درحقیقت موجودہ جمہوری حکومتیں جمہوریت کی روح سے بالکل خالی ہیں، ان میں اور شخصی حکومتوں میں صرف یہ فرق ہے کہ شخصی حکمراں اپنے ذاتی فائدہ اور اقتدار کے لئے اپنی رعایا پر جو زیادتیاں کرتے تھے، جمہوری حکومتیں وہی زیادتیاں اپنے قومی مفاد کے لئے دوسری قوموں پر کرنے لگیں، جس پر مشرق کی تاریخ شاہد ہے، اقبال نے مختلف پیرایوں میں اس نام نہاد جمہوریت کی پردہ دری کی ہے۔

ہے وہی سازِ کہن مغرب کا جمہوری نظام
جس کے پردوں میں نہیں جز از نوائے قیصری
دیوِ استبداد جمہوری قبا میں پائے کوب
تو سمجھتا ہے یہ آزادی کی ہے نیلم پری
مجلسِ آئین و اصلاح رعایات حقوق
طبِ مغرب میں مزے میٹھے اثر خواب آوری
گرمیِ گفتار اعضائے مجالس الاماں
یہ بھی اک سرمایہ داروں کی ہے جنگِ زرگری
اس سرابِ رنگ و بو کو گلستاں سمجھا ہے تو
آہ اے ناداں قفس کو آشیاں سمجھا ہے تو

ایک دوسری نظم میں جمہوریت کے چہرہ سے اس طرح نقاب اٹھائی ہے۔

وائے بر دستورِ جمہورِ فرنگ — مردہ تر شد مردہ از صورِ فرنگ
حقہ بازاں چوں سپہرِ گرد گرد — از امم بر تختۂ خود چیدہ نرد
شاطراں ایں گنج ور آں رنج بر — ہر زماں اندر کمینِ یک دگر
فاش باید گفت سرِ دلبراں
ما متاع و ایں ہمہ سوداگراں

ان اشعار کی صداقت پر ایشیا و افریقہ کی گزشتہ دو تین صدیوں کی تاریخ شاہد ہے، ایشیائی ملکوں اور قوموں کی غلامی اور ان کی تباہی اسی

دورِ جمہوریت کا زریں کارنامہ ہے، جمہوریت کے بانی اول فرانس کے ہاتھوں شمالی افریقہ کے مسلمانوں پر اور جمہوریت کے امام برطانیہ کے ہاتھوں تمام ایشیائی ملکوں پر جو کچھ گزری، اور اب تک گزر رہی ہے، اس سے ہر شخص واقف ہے۔

اس کا ایک سبب تو وہی نسلی اور جغرافی قومیت اور وطنیت ہے، جس کی تفصیل اوپر گزر چکی ہے، دوسرا سبب لادینی سیاست ہے، درحقیقت جو سیاست مذہب یعنی اخلاق روحانیت اور خوف خدا سے خالی ہوگی، وہ کبھی دوسروں کے ساتھ انصاف نہیں برت سکتی۔

غیرِ حق چوں ناہی و آمر شود | زور ور بر ناتواں قاہر شود
زیرِ گردوں آمری از قاہری است | آمری از ماسوی اللہ کافری است
قاہرِ آمر کہ باشد پختہ کار | از قوانیں گرد خود بندد حصار
جرّہ شاہیں تیز چنگ و زود گیر | صعوہ را در کار ہا گیرد مشیر
قاہری را شرع و دستورے دہد | بے بصیرت سرمہ با کورے دہد
حاصل آئین و دستورِ ملوک | دہ خدایاں فربہ و دہقاں چو دوک

اس کا علاج صرف قوانین خداوندی کے مطابق حکومت ہے، جو قانون محض انسانی عقل و تجربہ پر مبنی ہوگا، وہ ذاتی مفاد اور قومی غرض سے خالی نہیں ہو سکتا، اس لئے اس سے تمام انسانوں کے ساتھ عدل و انصاف کی توقع نہیں کی جا سکتی، جس کا تجربہ صدیوں سے ہو رہا ہے، اور حکومت الٰہیہ کا نظام اسلام کے علاوہ اور کسی مذہب نے نہیں پیش کیا ہے، جس کی

بنیاد تمام تر عدل و انصاف پر ہے، اور جس میں نہ صرف محکوم قوموں بلکہ عالم انسانیت کے حقوق متعین اور محفوظ ہیں۔

لیکن جیساکہ اوپر گزر چکا ہے، کلیسا کی استبدادی اور تنگ نظر حکومت نے سارے یورپ کو مذہبی حکومت کا مخالف بنا دیا، اور پھر اس کے ذریعہ یہ مخالفت ساری دنیا میں پھیل گئی اور مغربی قوموں خصوصاً انگریزوں نے اسلام کی مذہبی حکومت کو اپنے سیاسی مصالح کی بنا پر خصوصیت کے ساتھ زیادہ بدنام کیا، اور بعض مسلمان بادشاہوں بالخصوص عجمی فرمانرواؤں کے غیر اسلامی اعمال نے ان کو بدنام کرنے کا اور زیادہ موقع دے دیا، لیکن جو لوگ اُن کے اعمال و افعال سے اسلام پر اعتراضات کرتے ہیں، وہ اس فرق کو بھول جاتے ہیں کہ اسلامی حکومت اور مسلمان حکومت اور مسلمان فرمانروا دو الگ چیزیں ہیں[1]، مسلمان فرمانرواؤں کے ذاتی اعمال سے اسلامی قوانین کا قیاس کرنا صحیح نہیں، اور اُن کے بُرے اعمال کی ذمہ داری اسلام پر نہیں ہے، ایسے سلاطین و حکمراں نہ اسلام کے صحیح نمائندے تھے، اور نہ ان کا نظام حکومت اسلامی تھا، ان کا مذہب ضرور اسلام تھا لیکن ان کی تہذیب و تمدن اور سیاست و حکومت میں ان کی ملکی اور قومی روایات اور آئین و قوانین کا زیادہ اثر تھا، اور مسلمانوں کے پرسنل لا اور بعض دوسرے ظاہری اسلامی اثرات کو چھوڑ کر ان کا نظام حکومت خالص دنیاوی تھا، ایسی حالت میں ان کو

---

[1] مسلمان حکومتوں کو مجازاً تو اس لحاظ سے اسلامی کہہ سکتے ہیں، کہ ان کے فرماں روا مسلمان ہیں، لیکن اُن پر حقیقی اسلامی حکومت کا اطلاق صحیح نہیں ہو گا۔

اسلامی حکومت کہنا اور ان کے اعمال کی ذمہ داری اسلامی قوانین پر ڈالنا
کسی طرح صحیح نہیں ہے، بلکہ جن ملکوں میں عجمی قوموں کے ذریعہ اسلام پہونچا
وہ بھی اصلی شکل میں نہیں تھا، اور اس میں بہت سے عجمی خیالات و عقائد شامل
ہو گئے تھے، ایسی حالت میں ان سے خالص اسلامی قوانین پر عمل کی توقع
بھی نہیں کی جا سکتی تھی، یہ بھی اسلام کا بڑا احسان ہے کہ اُس نے بہت سی
پرانی خونخوار قوموں کو مہذب بنا دیا، اس سلسلہ میں یہ امر بھی قابل غور ہے
کہ ایسے بادشاہوں کا طرز عمل خود مسلمانوں کے ساتھ کیا تھا، جہاں ان کے
اقتدار اور حکومت کے مفاد کا سوال آجاتا تھا، وہ اُن کے لئے بھی ایک
جابر و ظالم فرمانروا بن جاتے تھے، ایسے حکمرانوں کی تاریخ خود مسلمانوں
کے ساتھ جنگ و خونریزی اور وحشت و بربریت سے بھری ہوتی ہے، چنانچہ
اسلامی ملکوں اور ان کی حکومتوں کے زوال کا ایک بڑا سبب ان کی خانہ جنگی
بھی ہے، تاریخی بحث میں پڑنے کا یہ موقع نہیں، اس سے ہر پڑھا لکھا شخص
واقف ہے، کیا اسلام کی تعلیم یہی ہے، کہ مسلمان مسلمان کا گلا کاٹتے، اور
ان کو محکوم بناتے رہیں، درحقیقت یہ سب کے سب دنیاوی بادشاہ تھے
اور ان کی حکومتیں بھی خالص دنیاوی تھیں، اور اُن کے پیش نظر ذاتی مفاد
تھا اور وہ اسلام کے نام کو بھی اپنے مقصد کے حصول کے لئے استعمال کرتے
تھے، اگر ان میں اسلامی تعلیم کا کچھ بھی اثر ہوتا، تو وہ آپس میں لڑ لڑ کر اس طرح
مسلمانوں کو تباہ نہ کرتے، لیکن ہر حکومت میں بعض فرمانروا ذاتی حیثیت
سے صالح اور دیندار بھی تھے، اور انھوں نے بڑے عدل و انصاف کے

ساتھ حکومت کی، اور علم وفن، تہذیب وتمدن اور انسانیت اور بعض حیثیتوں سے مذہب کی بھی خدمت انجام دی، خود ہندوستان کے بہت سے صالح مسلمان سلاطین کے زرّیں کارنامے ہماری نگاہوں کے سامنے ہیں، لیکن ان کی حکومت بھی خالص اسلامی نہیں تھی۔

بلکہ عجمی فرمانرواؤں کے مقابلہ میں عرب حکمراں نسبتہً بہتر تھے، گو خلافت راشدہ کے بعد اُن کی حکومت بھی خالص اسلامی نہیں رہ گئی تھی پھر بھی ان میں اسلامی تعلیمات کا کچھ نہ کچھ اثر باقی تھا، اس لئے جب تک خلافت کی باگ عرب خلفاء کے ہاتھوں میں رہی اور وہ عجمی قوموں کے اثرات سے بالکل مغلوب نہیں ہوگئے، ان کی دنیاوی حکومت بھی اسلامی اثر سے یکسر خالی نہیں ہوئی، بنی امیہ دمشق خلافت عباسیہ کا ابتدائی دور اور اسپین کی اموی حکومت اس کی شاہد ہیں، جنھوں نے انسانیت کی بڑی خدمت انجام دی، اور جن کے ذریعہ یورپ میں علم وفن اور تہذیب وتمدن کی روشنی پھیلی۔

اس کی وجہ یہ ہے کہ چونکہ اسلامی تعلیمات کے اصل حامل ومبلغ عرب تھے، اس لئے عجم کی نومسلم اقوام کے مقابلہ میں ان میں اسلامی تعلیم کا زیادہ اثر تھا، یہی وجہ ہے کہ جن ملکوں میں ان کی حکومت رہی، یا جہاں اُن کے ذریعہ اسلام پہونچا، اُن ملکوں کی کایا پلٹ گئی اور وہ اُن کے حسنِ عمل اور ان کے عدل ومساوات کو دیکھ کر مسلمان ہوگئے، چنانچہ جن ملکوں میں اسلام کی حکومت کبھی قائم نہیں ہوئی اور صرف عرب مبلغین کے قدم پہونچ گئے، وہاں

بھی اسلام کی روشنی پھیل گئی، جزائر شرق الہند یعنی انڈونیشیا اور چین میں کبھی اسلام کی تلوار نہیں پہونچی، لیکن آج پورا انڈونیشیا مسلمان ہے اور چین میں چھ کروڑ مسلمان ہیں، خود ہندوستان میں مالابار کے سارے ساحلی علاقہ میں عرب مبلغین کے ذریعہ اسلام پھیلا۔

یہ ایک ضمنی بات تھی جو درمیان میں آگئی، اصل مقصود یہ کہنا تھا کہ جن حکومتوں کو اسلامی کہا جاتا ہے، اور جن حکمرانوں کے ذاتی اعمال کو اسلامی سمجھ کر اعتراض کیا جاتا ہے، وہ حکومتیں اور وہ حکمران در اصل اسلامی نہیں بلکہ خالص دنیاوی ہیں، اُن کو اسلامی نظام حکومت اور اس کے قوانین پر عمل سے کوئی تعلق نہیں تھا، اس لیئے اُن کے اعمال کی ذمہ داری اسلام پر نہیں ہے، اسلامی حکومت وہ ہے جس کا نظام قرآن و حدیث کے احکام کے مطابق ہو، جس کی بنیاد عدل و انصاف پر ہے، جس میں بلا امتیاز مذہب و ملت رعایا کے ہر طبقہ اور ہر فرد کے ساتھ انصاف برتا جائے، اُن کے تمام حقوق محفوظ ہوں، اور وہ اپنے کو اپنی ملکی و قومی حکومت سے زیادہ محفوظ سمجھیں، اور نہ صرف حکومت بلکہ ہر مسلمان ان کے حقوق کا محافظ و نگہبان ہو یہ کوئی خیالی آئیڈیل نہیں، بلکہ تاریخی واقعہ ہے، خلفائے راشدین کے زمانہ میں شام کے یہودیوں اور عیسائیوں، مصر کے قبطیوں، شمالی افریقہ کے بربر اور ایران کے مجوسیوں کو اسلامی حکومت پر اپنی ملکی حکومت سے زیادہ اعتماد تھا، جس کے واقعات تاریخوں میں موجود ہیں۔

اسلامی حکومت نے غیر مسلموں کو جو حقوق دیے ہیں، اس سے زیادہ

اس دورِ ترقی میں بھی تصور میں نہیں آسکتے، ان کی تفصیل کی اس مختصر مضمون میں گنجائش نہیں ہے، مختصر یہ ہے کہ اسلام میں غیر مسلم رعایا کو وہ تمام حقوق حاصل ہیں، جن کو آج کل شہری حقوق کہا جاتا ہے، چند بنیادی حقوق یہ ہیں۔

ان کی جان و مال خواہ وہ کسی شکل میں ہو، عزت و آبرو، مذہب، عبادت گاہیں، محفوظ رہیں گی، اُن کو اپنے مذہبی مراسم کے ادا کرنے اور اپنے معاشرتی قوانین پر عمل کرنے کی پوری آزادی حاصل رہے گی، اُن کے مذہبی نظام میں کوئی مداخلت نہ کی جائے گی، اُن کی جان و مال اور عزت و آبرو کو مسلمانوں کی جان و مال، اور عزت و آبرو کے برابر سمجھا جائے گا، اگر کوئی مسلمان کسی ذمی کو قتل کردے گا، یا اس کے مال اور آبرو کو کوئی نقصان پہونچائے گا تو قصاص میں قتل کیا جائے اور مالی نقصان اور بے عزتی کرنے کی سزا پائے گا۔

حکومت کے عہدوں میں تو اُن کے حقوق کی تصریح نہیں ہے، لیکن دولتِ بنی اُمیہ، بنی عباس، دولتِ فاطمیہ مصر اور اسپین کی اموی حکومتوں میں چند بڑے ذمہ دار عہدوں مثلاً صوبہ داری، فوج کی سپہ سالاری اور قضارت کو چھوڑکر جن میں علم دین سے واقفیت ضروری ہے، باقی دوسرے ملازمانہ عہدوں خصوصاً مالیات کے شعبہ میں ذمی بڑے بڑے عہدوں پر مامور تھے، اور اور ان کو ہر قسم کی ترقی کے مواقع حاصل تھے۔

فقہ کی تمام کتابوں میں اسلام کے دوسرے قوانین کی طرح حقوق الذمیین کا بھی باب ہوتا ہے، خصوصاً قاضی ابو یوسف کی کتاب الخراج میں اُن کے حقوق کی پوری تفصیل درج ہے، علامہ شبلی نے بھی اردو میں اس موضوع پر

لہ حاشیہ آئندہ صفحہ پر۔

ایک مفصل مضمون لکھا ہے جس میں ذمیوں کے حقوق کی پوری تفصیل ہے، اور ان اعتراضات کا بھی جواب دیا گیا ہے، جو اس سلسلہ میں کئے جاتے ہیں۔

ممکن ہے نئے مسائل و حالات کی روشنی میں ان قوانین میں ترمیم اور بعض نئے قوانین کی ضرورت ہو تو جیسا کہ اوپر گزر چکا ہے، اس کا دروازہ بند نہیں ہے، اور علمائے مجتہدین اس کام کو کر سکتے ہیں۔

اس بحث میں جو باتیں لکھی گئی ہیں، اُن کے جواب میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ دنیا کا کوئی سچا مذہب بھی انسانی حقوق کے احترام، عدل، انصاف، امن و صلح کی تعلیم، اور ظلم و جور، فتنہ و شر اور دوسروں کی حق تلفی وغیرہ کی ممانعت اور اس قبیل کی دوسری اخلاقی تعلیمات سے خالی نہیں ہے اور ان کے ذریعہ بھی عدل کے ساتھ حکومت کی جا سکتی ہے، اس سے انکار نہیں، اسی لئے کسی حکمراں قوم کی تاریخ بھی صالح اور عادل حکمرانوں سے خالی نہیں ہے۔

لیکن اصل بحث محض اخلاقی تعلیمات کی نہیں، بلکہ ان کی قانونی حیثیت کی ہے، قانونی حیثیت اور قوتِ نافذہ کے بغیر محض اخلاقی تعلیم کافی نہیں ہے، اس لئے کہ اخلاقی تعلیم پر عمل اشخاص کی ذاتی صلاحیت اور سلامت طبع پر موقوف ہے۔ مثلاً ایک صالح حکمراں تو اخلاقی تعلیمات پر عمل کرتا ہے، لیکن جو حکمراں ایسا نہیں ہے، اس کو مجبور کرنے والی کوئی قوت ہونی چاہیے، یہ قوت آئین و قوانین کی ہے۔

---

[1] یہ کتاب، ہارون رشید نے اسلامی قانون خراج پر لکھوائی تھی، لیکن اس میں ذمیوں کے حقوق کی بھی پوری تفصیل ہے، جس پر عباسی دور میں عمل درآمد ہوتا تھا۔

اسلامی نظام کی یہی خصوصیت ہے کہ اس کا پورا آئین اور اس کے قوانین موجود ہیں، جن کی پابندی اخلاقی تعلیمات کی طرح ذاتی صلاحیت پر موقوف نہیں، بلکہ اس کا نفاذ اور اُن پر عمل قانونی فرض ہے۔ اس کے جواب میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ جو اسلامی حکمراں اُن پر عمل نہیں کرتا، اس کو مجبور کرنے والی کون سی قوت ہے جس کی مثالیں تاریخ میں موجود ہیں اس کا جواب اوپر گزر چکا ہے کہ وہ صحیح اسلامی حکمراں ہی نہیں جو اسلامی قوانین کا پابند نہ ہو، اور وہ اسلامی حکومت نہیں جس میں اسلامی قوانین کا نفاذ نہ ہو، اور اس بحث کا مقصد صحیح اسلامی حکومت ہے۔ درحقیقت خالص دنیاوی اور مادی فوائد کے لحاظ سے بھی اسلامی تعلیمات ایسی صداقتوں پر مبنی ہیں، جن پر عمل کے بغیر انسانوں کو مادی فلاح اور دنیاوی امن و سکون بھی حاصل نہیں ہو سکتا، چنانچہ آج انسانی حقوق کے احترام، عالمگیر انسانی اخوت و محبت، معاشی مساوات اور امن و صلح کی آوازیں ہر ملک سے بلند ہو رہی ہیں، اور جن باتوں کو دنیا آج نہیں مانتی ان کے کل ماننے پر مجبور ہو گی، اسلام کے نام سے نہ سہی دوسرے ناموں سے سہی، اصل مقصد نام نہیں، بلکہ کام اور نتیجہ ہے، اگر دنیاوی معاملات ہی کی حد تک صحیح اسلامی اصولوں پر دنیا کا عمل ہو جائے تو کم از کم مخلوق خدا کو دنیا میں تو امن و سکون حاصل ہو جائے گا۔

اس لئے اقبال کی دعوت درحقیقت انسانی فلاح و سعادت کی دعوت ہے، جس میں تمام برحق اور الہامی مذاہب کی اصولی تعلیمات شامل ہیں، انھوں نے شاعری کے علاوہ اپنی کتابوں اور تحریروں میں بھی اس حقیقت کا اظہار

کیا ہے، خیال آتا ہے کہ اسرارِ خودی کے انگریزی مترجم ڈاکٹر نکلسن یا کسی دوسرے ریویو نگار کے اعتراض پر انھوں نے یہی جواب دیا تھا کہ اُن کے نزدیک انسانوں کی نجات اور اُن کے تمام مشکلات کا حل اسلام ہی کے ذریعہ ہو سکتا ہے اس وقت ان کا اصل جواب سامنے نہیں ہے، اس لئے اُن کے صحیح الفاظ نقل نہیں کئے جا سکتے، مگر اس کا مفہوم قریب قریب یہی تھا۔

پروفیسر آل احمد سرور نے اُن کی بعض تعلیمات اور اشعار کے متعلق اپنے کچھ شکوک اور اعتراضات لکھ بھیجے تھے، ان کے جواب میں انھوں نے لکھا تھا۔

آپ کے دل میں جو باتیں پیدا ہوئیں، ان کا جواب بہت طویل ہے، اور میں بحالت موجودہ طویل خط لکھنے سے قاصر ہوں، اگر میں کبھی علی گڑھ حاضر ہوا، یا آپ کبھی لاہور تشریف لائے، تو انشاء اللہ زبانی گفتگو ہوگی، سر دست میں دو چار باتیں عرض کرتا ہوں۔

۱۔ میرے نزدیک فاشزم کمیونزم یا زمانۂ حال کے اور ازم کوئی حقیقت نہیں رکھتے، میرے عقیدے کی رو سے صرف اسلام ہی ایک حقیقت ہے جو بنی نوع انسان کے لئے ہر نقطۂ نگاہ سے موجب نجات ہو سکتی ہے، میرے کلام پر ناقدانہ نظر ڈالنے سے پہلے حقائقِ اسلامیہ کا مطالعہ ضروری ہے، اگر آپ پورے غور و توجہ سے یہ مطالعہ کریں تو ممکن ہے آپ ان ہی نتائج تک پہونچیں، جن تک میں پہونچا ہوں، یہ ممکن ہے آپ کا ریویو مجھ سے مختلف ہو، یا آپ خود دینِ اسلام کے حقائق ہی کو ناقص تصور کریں، اس دوسری صورت میں دوستانہ بحث ہو سکتی ہے، جس کا نتیجہ معلوم نہیں کیا ہو۔

۲۔ آپ کے خط سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ نے میرے کلام کا بالاستیعاب مطالعہ نہیں کیا ہے، اگر میرا یہ خیال صحیح ہے تو میں آپ کو دوستانہ مشورہ دیتا ہوں کہ آپ اس طرف بھی توجہ کریں، کیونکہ ایسا کرنے سے بہت سی باتیں خود بخود اس کی سمجھ میں آجائیں گی۔ (رسالہ ماہ نو اگست ۴۹ء)

ان سطور میں انھوں نے اپنے کلام کے متعلق اس قسم کے تمام اعتراضات کا جواب دے دیا، تاہم اس سے انکار نہیں کہ اقبال انسان تھے، اُن سے غلطی بھی ہو سکتی ہے اور اُن کی بعض تعلیمات میں اختلاف کی گنجائش نکل سکتی ہے، لیکن مجموعی حیثیت سے وہ بلا اختلاف مذہب و ملت تمام قوموں کے لئے درس حیات ہے اوپر جو کچھ لکھا گیا وہ تو اقبال کے معترضین کا جواب تھا لیکن اسی کے ساتھ اس حقیقت کا اظہار بھی ضروری ہے کہ اپنے نفس اور اپنی ذات پر خدا کے قوانین کی حکومت قائم کئے بغیر سیاسی حکومت الٰہیہ وجود میں نہیں آسکتی، یعنی جب تک مسلمان اپنے اعمال اور اپنی انفرادی زندگی میں خدا کے احکام کے پابند نہ ہوں گے، اور ان کی زندگی اسلامی سانچہ میں نہ ڈھل جائے گی، اس وقت تک حکومت الٰہیہ کا قیام ممکن ہی نہیں ہے، اور جب وہ خود نمونۂ عمل بن جائیں گے، تو دنیا خود بخود اسلامی نظام کی طرف کھنچے گی، اور بغیر کسی دعوت و تبلیغ کے حکومت الٰہیہ قائم ہو جائے گی۔

مذہبی عقیدہ و تعلیم اُصول فطرت اور تاریخی واقعہ ہر لحاظ سے حکومت الٰہیہ کے قیام کی یہی ترتیب اور یہی ایک شکل ہے، اس بارہ میں قرآن مجید کا وعدہ یہ ہے۔

"اللہ تعالےٰ نے اُن لوگوں سے جو ایمان لائے، اور عمل صالح کئے، یہ وعدہ کیا کہ روئے زمین پر اُن کو اپنا خلیفہ بنائے گا، جس طرح اُن سے پہلے والوں کو خلیفہ بنایا تھا۔"

یعنی استخلاف فی الارض، ایمان و عمل صالح کے ساتھ مشروط ہے۔

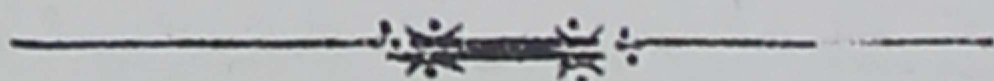
اصول فطرت یہ ہے کہ عملی نمونہ کے بغیر کوئی تعلیم اور کوئی دعوت خواہ وہ دینی ہو یا دنیاوی کامیاب نہیں ہو سکتی، اور ہر دعوت کے لئے ضروری ہے کہ داعی کی پوری زندگی خود دعوت کا عملی نمونہ ہو، اس لئے مسلمان جب تک اپنی انفرادی زندگی میں اسلامی تعلیمات کا مثالی نمونہ پیش نہ کریں گے، اُس وقت تک محض زبان سے اُن کی دعوت بے نتیجہ اور بے اثر رہے گی، لیکن اگر وہ اپنے عمل سے ثابت کر دیں کہ اسلام ہی ہر حیثیت سے انسانیت کی فلاح کا ذریعہ ہے، تو دنیا خود بخود اس سے متاثر ہو گی، اور بغیر دعوت کے اس کی طرف کھنچ آئے گی، ع

حقیقت خود کو منوا لیتی ہے مانی نہیں جاتی

اور یہ اصول نہ صرف اسلام اور حکومتِ الٰہیہ بلکہ دنیا کی ہر تعلیم اور ہر نظام کے لئے یکساں ہے، چنانچہ اگر آج نسلی و جغرافی قومیت و وطنیت کے جذبات سے بلند ہو کر صحیح جمہوری اصولوں پر عمل کیا جائے تو دنیا صحیح جمہوری نظام کو قبول کرے گی، اس لئے کہ وہ تو اپنے مشکلات کا حل اور اپنے مصائب کا علاج چاہتی ہے، یہ علاج جس نظام میں بھی ملے گا اُس کو وہ بلا تامل قبول کرلے گی، اس لئے اگر مسلمانوں کا یہ دعویٰ ہے کہ انسانیت کے امراض کا

علاج اسلامی نظام میں ہے اور یہ دعوے یقیناً صحیح ہے تو انہیں عمل سے اس کا ثبوت دینا چاہیے۔

تاریخی حیثیت سے بھی اسلامی نظام کی تبلیغ اور اس کی کامیابی کی بھی یہی ترتیب ہے، اسلام کے ظہور کے ساتھ حکومت الٰہیہ نہیں قائم ہو گئی تھی بلکہ پہلے برسوں مکی اور پھر ابتدائی مدنی زندگی میں ان میں عمل کی روح پیدا کی گئی، اور جب وہ نمونۂ عمل بن گئے، اُس وقت حکومت الٰہیہ کی بنیاد پڑی اور جب خلفائے راشدین کے زمانہ میں اس کا مکمل مثالی نمونہ قائم ہوا، اس وقت خود بخود دوسری قومیں اس نظام کو قبول کرنے لگیں، اس لئے اسلامی نظام کی دعوت کی کامیابی اور ناکامی مسلمانوں کے عمل پر منحصر ہے۔



وادی ایمن

یعنی کلام حضرت خواجہ عزیز الحسن مجذوب رحمۃ اللہ علیہ

حضرت مجذوب سے پہلا تعارف تقریبًا دس بارہ سال ہوئے راقم الحروف کسی ضرورت سے لکھنؤ گیا تھا، ایک دن مخدومی قطب میاں صاحب سے ملنے کے لئے فرنگی محل جانا ہوا، اس وقت اُن کے پاس ایک فرشتہ صورت اور مجذوب صفت بزرگ بڑے والہانہ انداز سے زمزمہ سنجی میں مصروف تھے ان کی وارستہ مزاجی اور ظاہری وضع وقطع سے نہ جاننے والا ان کی حیثیت اور مرتبہ کا اندازہ نہیں کرسکتا تھا، میں بھی سمجھا کہ فرنگی محل کے عقیدتمند خواجگان میں سے کوئی صاحب ہوں گے، لیکن دو ہی چار شعر سُنے تھے کہ کلام کی خوبی نے اپنی جانب متوجہ کرلیا، اور یہ تاثر برابر بڑھتا گیا، تاآنکہ ختم مجلس کے وقت دل کلام کی تاثیر سے معمور اور زبان اُس کے اعتراف پر مجبور تھی، یہ شاعر حضرت خواجہ عزیز الحسن صاحب مجذوبؔ انسپکٹر مدارس، خلیفہ مجاز حضرت مولانا اشرف علی تھانوی رح تھے، جس کا تعارف سے پہلے قیاس بھی نہ ہوسکتا تھا۔

لیکن اس مختصر صحبت سے ذوق کو تسکین نہ ہوئی، بلکہ آتش شوق اور بھڑک اُٹھی، اتفاق سے اسی دن شب کو کسی تقریب کے سلسلہ میں قطب میاں کی جانب سے دعوت تھی، موصوف نے مجھے بھی مدعو کیا، اس دعوت میں

خواجہ صاحب اور دوسرے عمائدِ شہر بھی شریک تھے، کھانے سے فراغت کے بعد محفلِ سماع میں خواجہ صاحب کا جام گردش میں آیا، اور نو دس بجے شب سے صبح صادق تک برابر موصوف کی شعر خوانی کا سلسلہ جاری رہا، گویا

ملا ساقی جو دریا دل بلا نوشوں کی بن آئی
اٹھایا شام سے ساغر تو ہنگام سحر رکھا

خود خواجہ صاحب کی زبان میں کلام کی تاثیر کا یہ حال تھا کہ

جان رگ رگ سے کھنچی آتی ہے کانوں کی طرف
کس قیامت کی کشش اُف تری آواز میں ہے

سامعین کی پوری رات آنکھوں میں کٹ گئی تھی، لیکن ہر شخص ہمہ تن گوش تھا، اور سب کی زبان حال گویا تھی۔

جی اُٹھے مُردے تری آواز سے
پھر ذرا مطرب اسی انداز سے

خواجہ صاحب کے جذب و وارفتگی کا یہ حال تھا کہ پڑھتے پڑھتے بیخودی میں اُٹھ کھڑے ہوتے تھے، اور نیم رقص کی کیفیت پیدا ہو جاتی تھی، اور اُن کی زبان بول رہی تھی۔

یہ نغمۂ دلکش مرا یہ ساز نہیں ہے
وہ بول رہے ہیں مری آواز نہیں ہے

اس واقعہ کو برسوں گزر گئے مگر وہ سماں اب تک نگاہوں میں ہے، جب تہجد کے سہانے وقت خواجہ صاحب بڑے جوش اور مستی میں یہ مصرع

اندھیرے میں لوٹیں گے جوبن کسی کا

پڑھتے جاتے تھے، اور بڑی ترتیل اور خوش الحانی کے ساتھ "ورتل القرآن" ...

نافلۃ لک" کی آیۂ پاک کا متزاد اس طرح لگاتے تھے، کہ معلوم ہوتا تھا، کہ یہ مصرع اسی وقت کے لئے کہا گیا تھا، اور اس آیۂ پاک کی تفسیر یہی ہے، اس تفسیر نے اس عامیانہ مصرع کو کہاں سے کہاں پہونچا دیا۔

اس وقت سے راقم کو خواجہ صاحب کے کلام کے ساتھ ایک خاص شغف اور ذوق پیدا ہو گیا، اس واقعہ کے چند برسوں کے بعد شیوخ دار المصنفین، حضرت مولانا اشرف علی تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کے دامن فیض سے وابستہ ہو گئے اس تعلق سے خواجہ صاحب کئی مرتبہ دار المصنفین تشریف لائے، اور یہ دولت گھر بیٹھے ملنے لگی، ع :-

خوش درخشید ولے دولتِ مستعجل بود

افسوس کہ یہ دولت بہت جلد چھن گئی، اور دار المصنفین کی آخری آمد کے چند ہی مہینوں کے بعد اگست ۱۹۴۴ء میں یہ مجذوب حق، واصل بحق ہو گیا۔

خواجہ صاحب کے کلام کی خصوصیات

آج کل سب سے زیادہ ارزاں جنس شاعری ہے، گلی گلی کوچہ کوچہ میں شاعری کا بازار گرم ہے، لیکن حقیقی شاعری اب بھی نادر و نایاب ہے، عام شعرا کا ذکر نہیں، ان شعراء میں بھی جن کا شمار مشاہیر میں ہے، کتنے واقعی شاعر کہلانے کے مستحق ہیں، پھر ان تلامیذ الرحمن کا کیا ذکر ہے جن کی شاعری ان من الشعر لحکمۃ وان من البیان لسحرا کی مصداق ہو۔

کسی زمانہ میں بھی شعرا کی کمی نہیں رہی، ہر دور میں بڑے بڑے اساتذہ پیدا ہوتے رہے، لیکن جن کے کلام میں طور کی تجلی اور وادی ایمن کے شرارے

ہوں وہ ہمیشہ نادر و نایاب کے حکم میں رہے۔

فارسی شاعری کے دفترِ بے پایاں میں جس سے عارفانہ شاعری پیدا ہوئی، حضرت عطار، سنائی، شمس تبریز، مولانا روم، ابو سعید، ابو الخیر، اوحدی کرمانی، عراقی، خسرو، یا اور اس قبیل کے دو چار شعرا اس حریم قدس کے محرم تھے، جن کے کلام میں آتشِ عشق کے شرارے اور شرابِ محبت کی مستی ہے، اُردو میں اصحابِ دل شعراء کی تعداد اور بھی کم اور انگلیوں پر گنی جا سکتی ہے۔

درحقیقت یہ صوت سرمدی موہبت الٰہی اور انہی سوختہ سامانوں کا حصہ ہے، جن کے سینے عشقِ حقیقی کی آگ سے سوزاں، اور جن کے دل بادۂ معرفت سے لبریز ہیں، یہ دولت عموماً صوفیائے کرام کا حصہ رہی ہے خصوصاً خواجگان چشت میں اس شراب کی مستی زیادہ رہی ہے، حضرت مجذوب بھی اسی میکدہ کے بادہ خوار تھے، اور ان کی طبیعت کو ذوق و مستی سے زیادہ مناسبت تھی، اس لئے ان پر اس کیفیت کا غلبہ زیادہ تھا، مگر اس سلسلۃ الذہب کے بزرگوں کی طرح اس مستی میں بھی ان کا قدم شریعت و تقوے کے جادۂ مستقیم سے کبھی نہیں ہٹا۔

در کفے جامِ شریعت در کفے سندانِ عشق

ہر ہوسناکے نہ داند جام و سنداں باختن

خواجہ صاحب فطری شاعر تھے، اُن کے سینہ سے شاعری کا چشمہ اُبلتا تھا، کہنے پر آتے تھے، تو بے تکان کہتے چلے جاتے تھے، قافیے پناہ

مانگ جاتے تھے، لیکن اُن کی طبیعت کی روانی نہ رکتی تھی، جس پر ان کی طویل غزلیں شاہد ہیں، اس فطرتِ شعری میں ذوق و مستی کی آمیزش نے اس شراب کو اور زیادہ تیز کر دیا تھا، فنی حیثیت سے بھی وہ کامل الفن شاعر تھے، معنوی محاسن سے قطع نظر ان کا کلام ظاہری خوبیوں سے بھی آراستہ اور فنی حیثیت سے استادانہ ہے، جس کی تفصیل آئندہ آئے گی، اُن کے کلام میں بڑی نیرنگی اور جامعیت ہے، ایک طرف اس میں سنائی اور عطار کی حکمت، شمس تبریز کی گرمی، مولانا روم کا جوش و خروش، اور خسرو کی مستی ہے، دوسری طرف میر کے نشتر اور غالب کے فلسفہ سے لے کر داغ و امیر کی معاملہ بندی، بلکہ ناسخ اور امانت کے ضلع جگت تک کے نمونے موجود ہیں جو ان کی قادر الکلامی کی دلیل ہے۔

لیکن یہ ان کا اصل رنگ نہیں، عمومیتِ فیض ہمیشہ سے صوفیائے کرام کا حصہ رہا ہے، اس لیئے خواجہ صاحب نے بھی عوام کو محروم رکھنا مناسب نہ سمجھا، اور اُن کی دلچسپی اور تفریح طبع کے لیئے اپنے کلام میں کچھ رنگین چھینٹے بھی دے دیے ہیں، کہ خواص کے ساتھ عوام بھی ان کے کلام سے لطف اندوز ہو سکیں، خود فرماتے ہیں۔

ادھر ہیں رندِ مستی میں اُدھر ہیں وجد میں صوفی

مزے ہر رنگ والے کو مرے اشعار میں آئے

ان کا اصل رنگ جس میں وہ اپنے دور میں بالکل منفرد اور تنہا تھے عشق حقیقی کی واردات اور راہ سلوک کے احوال و کوائف کی ترجمانی ہے

اُن کے کلام کا یہی حصہ ان کی شاعری کی اصل روح اور خود شاعر کی زبان میں حقائق و معارف کا الہام ہے۔

یہ حقائق یہ معانی یہ روانی یہ اثر
شاعری تیری ہے اے مجذوب یا الہام ہے

ان حقائق و معانی و الہام کی کیفیتیں اتنی گوناگوں، نازک اور لطیف ہیں، کہ شرح و بیان کی متحمل نہیں ہوسکتیں اور خواجہ صاحب نے ان کو جن جن پیرایوں میں بیان کیا ہے، اس کی مثال اُردو شاعری میں نہیں مل سکتی خواجہ حافظ کی طرح اُن کے خیالات کا دائرہ بھی محدود ہے، لیکن بیان کے تنوع اور رنیرنگی سے ایک عالم نظر آتا ہے۔

یہی ہے رنگ اگر مجذوب کی مستانہ غزلوں کا
عجب کیا ہند کا وہ حافظ شیراز ہو جائے

میری عرصہ سے تمنا تھی کہ جس پایہ کا یہ کلام ہے، اسی درجہ کے کوئی بزرگ اس پر قلم اُٹھاتے، لیکن جب کہیں سے کوئی صدا نہ اُٹھی، تو اپنی نااہلی کے باوجود خود راقم کو اس سعادت کے حصول کا حوصلہ پیدا ہوا، مگر اس کے لئے خواجہ صاحب کے پورے کلام یا کم از کم اس کے معتدبہ حصہ کے مطالعہ کی ضرورت تھی جس کی بظاہر کوئی امید نہ تھی، ایک دو مرتبہ اس کی کوشش بھی کی، لیکن کامیابی نہ ہوئی، اور یہ حسرت دل ہی میں رہ جانے کو تھی، کہ طلب صادق کی کارفرمائی نے خود اس کا سامان پیدا کر دیا۔

خواجہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے بعض خواجہ تاش بزرگوں کو ان کے کلام کی ترتیب و اشاعت کا خیال پیدا ہوا، انھوں نے یہ کام مولانا مسعود علی صاحب مدظلہ کے متعلق کیا، انھوں نے یہ بار امانت میرے سپرد کیا، اس طرح :- ع

قرعۂ فال بنام من دیوانہ زدند

اور راقم کو ایک دیرینہ تمنا پوری کرنے کا موقع ملا۔

خواجہ صاحب کی صورت، سرمدی پر مجھ جیسے نااہل اور نا آشنائے ذوق کا قلم اٹھانا بڑی جسارت ہے، لیکن اس حسن نیت کی بنا پر قابل معافی ہے کہ اگر باطنی دولت سے محرومی ہے، تو کم از کم اس کے مداحوں ہی کے زمرہ میں شامل ہونے کی سعادت حاصل ہو جائے۔ ع

بلبل ہمیں کہ قافیہ گل شود بس است

جیسا کہ اوپر اشارہ کیا گیا ہے، خواجہ صاحب کے کلام کے دو حصے یا دو رخ ہیں، ایک خالص مادی شاعری، دوسرا قلبی کیفیات و باطنی واردات، پہلے حصہ پر نقد و تبصرہ آسان ہے۔ لیکن دوسرے کا تجزیہ بہت مشکل ہے کہ پھول کی بو اور شراب کے نشہ کو الفاظ میں نہیں دکھایا جا سکتا، اور آفتاب کی کرنوں اور نور کی تجلیوں کو مٹھی میں بند نہیں کیا جا سکتا، اس کا ادراک صرف حواس ہی کر سکتے ہیں، تجزیہ سے اس کی ساری خوبی اور لطافت غارت ہو جاتی ہے، اس کا شارح صرف ذوق سلیم ہے، جیسا کہ اوپر عرض کیا جا چکا ہے، راقم ان اسرار کا محرم نہیں، اس لیے اگر

کسی شعر کا صحیح مفہوم سمجھنے اور اس کی تشریح میں لغزش ہو جائے تو اس کو راقم کی نارسائی پر محمول کیا جائے، اس اعتراف کے بعد کلام مجذوبؔ کے متعلق کچھ قلبی تاثرات پیش کیے جاتے ہیں۔

بادۂ معرفت

دوسرے اکابر اہل دل شعراء کی طرح خواجہ صاحب نے بھی باطنی کوائف اور راہ سلوک و معرفت کے حالات و مقامات کے لیے بیشتر شراب اور اس کے لوازم کا پیرایۂ بیان اختیار کیا ہے، گو ان کی تعبیریں اسی پیمانہ تک محدود نہیں ہیں، بلکہ ان کے خیالات کی طرح اُن کے طریقۂ تعبیر میں بھی نیرنگی ہے، لیکن اس سرمست بادۂ وحدت کے واردات کی ابتدا اسی بادہ سے کرنا مناسب معلوم ہوتا ہے، اس سے خواجہ صاحب کے کلام کی اصلی روح کا بھی اندازہ ہو جائے گا۔

عموماً اس طریقہ تعبیر میں مجاز کا رنگ اتنا گہرا ہوتا ہے، کہ حقیقت و مجاز میں امتیاز کرنا مشکل ہو جاتا ہے، لیکن خواجہ صاحب کے یہاں یہ پردہ اتنا ہلکا اور لطیف ہے، کہ حسنِ حقیقت کا چہرہ صاف جھلکتا دکھائی دیتا ہے اور اکثر مقامات پر خود کلام بول اُٹھتا ہے، کہ وہ دوسرے عالم کی آواز ہے،

حضرت مجذوب رح کو اپنے مرشد برحق سے والہانہ شیفتگی تھی، اور اُنھیں فنا فی الشیخ کا درجہ حاصل تھا، شیخ کی بارگاہ میں بھی اُن کو بڑی مقبولیت و محبوبیت حاصل تھی، جس کے اشارے کہیں کہیں ان کے کلام میں بھی پائے جاتے ہیں، مثلاً

مجذوبؔ کو تو لائے وہ ہمراہ بزم میں
اور سالکوں کو دور سے رستے بتا دیے

حضرت نظام الدین اولیاء قدس سرہٗ اور حضرت امیر خسرو کے ربط و تعلق کے جو واقعات سننے اور پڑھنے میں آتے ہیں، اُس کی زندہ مثال حضرت مجذوب اور اُن کے مرشد کے تعلق میں نظر آتی ہے، حضرت مجذوبؒ شیخ کی شراب عشق میں سراپا مخمور تھے، اور اُن کا ہر موئے بدن شیخ کی ثنا و صفت کا ایک شعر تھا، جس پر اُن کا کلام شاہد ہے۔

ترے محبوب کی یا رب شباہت لے کے آیا ہوں
حقیقت اس کو تو کر دے میں صورت لے کے آیا ہوں

جو اشرف تھا زمانہ میں جو اشرف ہے زمانہ میں
میں ایسے تیرے اشرف کی عقیدت لے کے آیا ہوں

اسی لئے ان کے قریب قریب کل اشعار میں ساقی و پیر مے خانہ سے مراد شیخ طریقت ہیں، بعض بعض اشعار میں یہ کنایہ تصریح کی حد تک پہونچ جاتا ہے۔

چڑھی ہے کچھ ایسی کہ تیور تو دیکھو جواں آج پیر مغاں ہو رہا ہے
دمکتا ہے چہرہ چمکتی ہیں آنکھیں بڑھاپے میں بھی جان جاں ہو رہا ہے

حوض کوثر موج زن پیر مغاں کے دل میں ہے
کس میں ہے وہ بات جو اس مرشدِ کامل میں ہے

ہزار راحت ہزار رحمت مگر نہیں دم زدن کی جرأت
یہ سادگی میں بھی رعب ہیبت اسی جلالتمآب میں ہے

یہیں سے پاؤں گا ہر نعمتِ دنیا و دیں ساقی
کہیں کیوں جاؤں میرے میکدہ میں کیا نہیں ساقی
ٹلوں گا میں نہ ہرگز لاکھ ہو تو خشم گیں ساقی
کہ جو مے سب سے بہتر ہے وہ ملتی ہے یہیں ساقی

شرابیں سیکڑوں ساقی ہزاروں بادہ کش لاکھوں
میں اُن کا مست ہوں آنکھوں سے جو مخمور کرتے ہیں

مجذوب ہی کا خانۂ دل کیا کہ آپ نے
گھر ایسے ایسے کتنے نہ جانے سجا دیے

اس قسم کے بہ کثرت اشعار ہیں، جن سے حضرت مجذوب کے ساقی و مے و میخانہ کی حقیقت ظاہر ہوتی ہے، فرماتے ہیں:۔

مرے جام و مینا نہیں جام و مینا — یہ ہے قلب روشن وہ ہے چشم بینا

ان کے میخانہ کے شیوخ کا سلسلہ اس رحمۃ للعالمین پر منتہی ہوتا ہے جس کے فیض سے سارا عالم سیراب ہے۔

نہ چھیڑ اے محتسب میں ہوں مئے وحدت کا متوالا
میں وہ میخوار ہوں جس کے ہیں ختم المرسلین ساقی
کہوں کیوں کر نہ تجھ کو رحمۃ للعالمیں ساقی
کہ تیرے فیض سے سیراب ہے روئے زمیں ساقی

اس شراب کی حقیقت ظاہر ہونے کے بعد اب اس کے اثرات، اور مختلف کوائف ملاحظہ ہوں، اس کے بادہ خواروں کے دل خوف وخشیت سے لبریز ہوتے ہیں۔

بہت پاتا ہوں میں رندوں میں خوف یوم دیں ساقی
بنی اُمّ الخبائث بھی شراب الصالحیں ساقی

ان پر سارے اسرار دیں فاش ہوتے ہیں، اور انھیں ایمان کامل کا درجہ حاصل ہوتا ہے۔

ترے رندوں پہ سارے کھل گئے اسرار دیں ساقی
ہوا علم الیقیں، عین الیقیں حق الیقیں ساقی

اس وقت یہ کہنا بالکل صحیح ہے۔

کہاں سے مجھ کو پہونچا یا کہاں پیر مغاں تونے
مرا میخانہ اب لاہوت ہے روح الامیں ساقی

یہ میخانہ انوار الٰہی کا منبع اور عرش بریں کا ہم پایہ ہے۔

تری محفل میں کیا انوار ہیں اے مہ جبیں ساقی
اُتر آیا زمیں پر آج کیا عرش بریں ساقی

اس میخانہ کی دریوزہ گری کے بغیر کمال حاصل نہیں ہو سکتا۔

عبادت ریاضت کرے لاکھ زاہد مقدس جو ہوگا تو میخوار ہو کر
کچھ اور ہی ہے ذرا چکھ تو میرے ساغر کی
جو پھر کبھی تجھے زاہد طلب ہو کوثر کی

اس راہ کی ابتدائی جھجک کی کتنی لطیف اور صحیح توجیہ ہے۔

جام لیتے ہاتھ کنپتا ہے تو اے ساقی نہ ہنس
پہلا موقع ہے نہیں پڑتی ہے ہمت کیا کریں

اس شعر پر راقم کو ایک ذاتی مشاہدہ یاد آگیا، میرے ایک محترم بزرگ نے جب ابتداء میں اس راہ میں قدم رکھا تو عادت نہ ہونے کی وجہ سے ان کو "جام" یعنی تسبیح ہاتھ میں لینے میں جھجک محسوس ہوتی تھی اور فرماتے تھے کہ اس پر ریا کا دھوکہ ہوتا ہے، لیکن رفتہ رفتہ جب اس کا چسکا لگ گیا، تو اب یہ جام و ساغر کسی وقت اُن کے ہاتھ سے جُدا نہیں ہوتا تھا بقول مجذوب۔

وہ ریا جس پہ تھے زاہد خندہ زن — پہلے عادت پھر عبادت ہوگئی

اور اب اُن کا یہ حال ہے۔

دم رُکا سمجھو اگر دم بھر بھی یہ ساغر رُکا
میرا دورِ زندگی ہے یہ جو دورِ جام ہے

جام و ساغر و مینا کی یہ تشریح خود حضرت مجذوب کی زبانِ فیض ترجمان سے راقم نے سُنی ہے، فرماتے تھے کہ ایک مرتبہ الہ آباد کی انسپکٹری کے زمانہ میں کاموں کی اتنی کثرت ہوگئی تھی، کہ اوراد و وظائف کے معمولات پورا کرنے کا بھی موقع نہ ملتا تھا، اس کی ترجمانی اس شعر میں فرمائی تھی۔

مطرب ہے نہ ساقی نہ ساغر نہ مینا — ارے یہ بھی ہے کوئی جینے میں جینا

اسی طریقہ سے اس شعر

روانہ سوئے کعبہ یوں ترا مستانہ ہوتا ہے
کہ بوتل تو بغل میں ہاتھ میں پیمانہ ہوتا ہے

کی تشریح میں فرمایا کہ ہاتھ میں تسبیح اور بغل میں کلام مجید۔

یہ واقعات درمیان میں ضمناً آ گئے، اصل مقصود بادۂ معرفت کے احوال و کوائف پیش کرنا تھے، ابتدائی جھجک کا منظر اوپر گزر چکا ہے، آخر میں غلبۂ شوق کا یہ حال ہو جاتا ہے۔

پینے سے کیا بجھے گی بلا کی ہے تشنگی
ساقی تو آج مجھ کو ڈبو دے شراب میں

لیکن یہ شراب بڑی تیز و تند ہے، اس کا تحمل آسان نہیں۔

یہ کس بھٹی کی تو نے دی شراب آتشیں ساقی
کہ آنکھوں سے لہو کی ندیاں بہنے لگیں ساقی

پلا دی ہے کس تیز بھٹی کی ساقی کہ مجذوب آتش بجاں ہو رہا ہے
دے تاؤ نہ اب اتنا کر آنچ ذرا ہلکی
تیزی پہ ہے ساقی اڑ جائے نہ میخانہ

اس میخانہ کے بادہ خوار ہی ان کو لطف کا اندازہ کر سکتے ہیں، ایسی تیز و تند شراب کے لئے بڑے اندازہ داں ساقی کی ضرورت ہے۔

نظر میں جانچ لیتا ہے کہ کس کا ظرف کتنا ہے
دکھائے کوئی ایسا نکتہ رس اور دور بیں ساقی
رہے ہشیار پی کر خم کے خم بھی تیرے متوالے
تیرے اندازِ مے بخشی پہ ہے صد آفریں ساقی

اس شراب کے انقلاب انگیز اثرات۔

ساقی نے بدل ڈالی دنیا مری ہستی کی
آنکھیں ہیں کہ مے خانہ دل ہے کہ پری خانہ

اس شعر کے مفہوم کو سمجھنے کے لیئے اس حالت کو پیش نظر رکھنا ضروری ہے، کہ صاحب دل بزرگوں کی آنکھوں میں ایک خاص کیفیت و کشش پیدا ہو جاتی ہے، اور ان کا دل یادِ الٰہی سے معمور رہتا ہے۔

دنیا سے بے تعلقی و تبتّل الیہ تبتیلا٥

بڑھ گیا ربط کچھ ایسا مرا پیمانوں سے
کچھ تعلق ہے نہ اپنوں سے نہ بیگانوں سے

چسکا لگا ہے جام کا شغل ہے صبح و شام کا
اب میں تمھارے کام کا ہم نفسو نہیں رہا

ہوا میں بے خبر دونوں جہاں سے ایک ساغر میں
ہوئے سب طے مراحل اوّلین و آخریں ساقی

اس شراب کے ذوق آشنا کے لیۓ پھر ساغر و مینا کے اہتمام کی ضرورت نہیں رہ جاتی۔

ہمیشہ ہوں مست اور ساغر نہ مینا اسے کہتے ہیں دیکھ اے رند پینا

وہ پیرِ مغاں کا نظر کردہ میں ہوں کہ پانی میں کیف شراب آ رہا ہے

جس کو فکرِ جام و ساقی ہو وہ رندِ خام ہے
ہم کو تو آب سادہ ہی مے گلفام ہے

اب ہوں ہی کب میں دائرۂ احتساب میں
اب مجھ کو امتیاز ہی نہیں آب و شراب میں

وہ لطیف الطبع ہوں جو بے پئے مخمور ہے
محتسب بھی ایسے ظرفہ رند سے مجبور ہے

یعنی اس وقت ذکر و فکر کے لئے اہتمام کی بھی ضرورت نہیں رہتی، ہر موئے بدن تسبیح بن جاتا ہے، اور قلب میں خود بخود ذکر الٰہی کی موجیں رواں ہو جاتی ہیں۔

ایسی رندی سراسر رحمت اور نکوکاری ہے۔

کرم کے بھروسہ پہ میخواریاں ہیں — یہ میخواریاں کیا نکوکاریاں ہیں
کریم ہی کے بھروسہ پہ پی رہا ہوں میں — میں رند تو ہوں مگر رند پارسا ہوں میں
ظہور رحمت مولیٰ بھی تو ضروری ہے — گناہگار نہ ہوں تو گناہگار ہوں میں

نگاہِ ساقی کا فیض

نظر کردہ ترا کب طالب پیمانہ ہوتا ہے
تری اک اک نظر میں کیف صد میخانہ ہوتا ہے

ساقی کی توجہ خاص کا اثر،

حقیقت میں تو میخانہ جبھی مے خانہ ہوتا ہے
ترے دست کرم میں جب کبھی پیمانہ ہوتا ہے

رندی اور مے کشی کا لطیف فرق۔

میکشو یہ تو میکشی رندی ہے مے کشی نہیں
آنکھوں کی تم نے پی نہیں آنکھوں سے تم نے پی نہیں

غلبۂ حال کے زمانہ میں یادِ محبوب، ذکرِ محبوب اور گریہ و زاری سے بہتر کوئی شغل نہیں ہوتا۔

مستی کا زمانہ بھی کیا خوب زمانہ ہے
پینا ہے پلانا ہے، رونا ہے رولانا ہے

ساقی کی مستانہ ادائی کے کرشمے۔

تیری مستانہ ادائی کے کرشمے ہیں یہ سب
میری رندانہ روش تو مفت میں بدنام ہے

اس شعر کو نوشتۂ تقدیر کے مقابلہ میں انسان کے عجز و بے بسی پر محمول کیا جا سکتا ہے،

شراب کی تطہیر یا اجتماع طریقت و شریعت،

مے بھی یوں طاہر بنالی جائے گی آبِ زمزم میں ملالی جائے گی

خرقہ کا مصرف،

اور تو نکلیں ہی گے خرقہ سے کام اس میں بوتل بھی چھپالی جائے گی

شیخ و زاہد محتسب وغیرہ | مے پرستوں یعنی بادۂ معرفت کے متوالوں، اور شیخ و زاہد محتسب یعنی متقشف علمائے ظاہر میں پرانی رقابت ہے، اور ان پر طعن و طنز شاعری کا جز دین گیا ہے، خواجہ حافظ اس فن کے امام ہیں، انھوں نے ریاکار زاہدوں کی خوب پردہ دری کی ہے، لیکن ان بزرگوں کے کلام میں جہاں شیخ و زاہد وغیرہ کا ذکر آیا ہے، اُن سے مراد وہ ریاکار ارباب ظاہر ہیں جن کے دل شرابِ معرفت یعنی دین کی روح سے خالی ہیں، اور ان کا کام صرف

دوسروں کی عیب جینی ہے، ورنہ وہ علمائے برحق جو شریعت وطریقت کے مجمع البحرین اور دین کی پاسبانی کے ساتھ اس حریم قدس کے بھی محرم ہیں، ہر طبقہ کے لئے واجب الاحترام ہیں، رندانہ شاعری میں اُن سے نہیں بلکہ پہلے طبقہ کے علماء سے خطاب ہے، خواجہ صاحب میں طبعی شوخی اور رندانہ دلی تھی، اس لئے انھوں نے بھی اُن پر بڑی لطیف چوٹیں کی ہیں، لیکن وہ محض تمسخر اور استہزاء نہیں ہیں، بلکہ اس میں بڑے نکتے اور لطائف پیدا کئے ہیں۔

محض ارباب ظاہر سے فیض باطنی کا حصول ممکن نہیں۔

ترا وجود ہے بے فیض مردہ دل زاہد
کہ نخل خشک سے امید برگ و بار نہیں

اس بے جان وجسم میں محبت کی گرمی سے روح پیدا ہو سکتی ہے۔

زاہدوں پر مے اچھالی جائے گی — روح ان مُردوں میں ڈالی جائے گی

راہ سلوک و معرفت کے شرائط محض احکام شرعی کی پابندی سے زیادہ سخت ہیں۔

زاہد در میخانہ بھی کیا ہے در توبہ — یہ ہر کس و ناکس کے لئے باز نہیں ہے

اس لئے عالم ہونا آسان ہے اور عارف ہونا بہت مشکل ہے۔

ترک دنیا اور گوشہ گیری میں دینداری کمال نہیں، بلکہ دنیا میں رہ کر دین پر قائم رہنا اصل کمال ہے

دکھا اتقا آ کے رندوں میں زاہد — یہ حجرہ میں کیا پارسا ہو رہا ہے

ایک مطلب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ صرف اہل دل کا معیار تقوےٰ سند ہے۔

یہ واقعات نادر نہیں کہ اہل دل کی ایک نگاہ نے بڑے بڑے علمار کی کایا پلٹ دی۔

ذرا ہشیار رہنا شیخ جی ہیں ہوں وہ متانہ
نظر میں زاہد صد سالہ کو پیر مغاں کر دوں

اگر شراب محبت کی مستی وقارِ علم کے خلاف ہو تو کم از کم اس سے ربط باطن ہی رکھنا چاہیئے۔

ہے خلافِ وضعِ زاہد برملا رندی اگر
دختر رز سے چھپے چوری ہی یارانہ رہے

زاہد کے ذوق مے پرستی پہ لطیف تعریض۔

میں تو ہوں ہی رند زاہد پارسا تو بھی نہیں
میں اگر ہوں جام بر کف تو نظر بر جام ہے

محتسب کے ذوق رندی کا دلچسپ ثبوت۔

مگر اے محتسب تجھ کو بھی ہے کچھ ذوق رندی کا
جبھی آتا ہے تو جب رنگ پہ میخانہ ہوتا ہے

شیخ کی ہٹ دھرمی۔

حق بات جانتے ہیں مگر مانتے نہیں ضد ہے جناب شیخ تقدس مآب میں

اس کا مطلب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ عالم سلوک و معرفت کی حقانیت

دل پر روشن ہے، لیکن زبان سے اعتراف اور اس پر عمل نہیں۔

ایک شوخ مذاق

شیخ کی پگڑی اچھالی جائے گی — سرکشی سے نکالی جائے گی
رخصتِ تقویٰ کے دن ہمراہ شیخ — دخترِ رز بن کے سالی جائے گی

راہ عشق و محبت کے کوائف اور سلوک کے احوال و مقامات

جذبات کی دنیا میں عشق و محبت کی کیفیتوں سے زیادہ لطیف، پُر کیف وسیع اور گوناگوں کوئی جذبہ نہیں، یہ اپنے اندر کیفیات کا ایک عالم رکھتا ہے، بحرِ محبت کی موجیں بڑی پُر جوش اور ان گنت ہیں، شعراء کے تخیل نے بڑی بلند پروازیاں کیں، بڑی گہرائیوں میں ڈوبے، مگر کوئی شاعر اس کا احاطہ نہ کر سکا۔

یہ تو مادی عشق و محبت کے جذبات کی نیرنگی کا حال ہے، جو نسبتہً محدود ہے، پھر عشق حقیقی کے بحرِ ناپیدا کنار کی وسعت و گہرائی اور جوش و خروش کا کون اندازہ کر سکتا ہے، جس کی بقول مجذوب کوئی ابتدا و انتہا نہیں۔

کشتیٔ دل یہ ناگہاں آ گئی ناخدا کہاں
ہٹیے تو ابتدا نہیں، بڑھیے تو انتہا نہیں

اور بڑے بڑے اصحابِ دل شعراء کو اپنے عجز و نارسائی کا اعتراف کرنا پڑا۔

دفتر تمام گشت و بہ پایاں رسید عمر
ما ہم چناں در اولِ وصفِ تو ماندہ ایم

یہ عالم لاہوت بے کیف و کم ہونے کے باوجود، گوناگوں کوائف سے

معمور ہے، حضرت مجذوبؔ نے ان کی بڑی لطیف ترجمانی کی ہے، یہ ان کی شاعری کا بڑا نازک اور دقیق حصہ ہے۔ جس سے صرف ذوقِ سلیم ہی لذت گیر ہوسکتا ہے۔

یہ راہ سراسر عشق و محبت کی ہے، اور محبت کے حالات وکوائف گوناگوں ہیں، اس کا مقام عرش سے بھی اونچا ہے۔

چڑھیں دار پر یا چڑھیں طور پر ہم — رسائی سے بالا ہے بامِ محبت
ازل ابتدا ہے ابد انتہا ہے — نہ صبحِ محبت نہ شامِ محبت
نہ ہوگا ابد تک بھی پورا نہ ہوگا — مرا قصۂ نا تمامِ محبت
سنبھل کر ذرا تیز گامِ محبت — مقامِ ادب ہے مقامِ محبت
مقامِ فنا ہے مقامِ محبت — کہ یکساں ہے سب خاص و عامِ محبت
ٹھہر یادِ جاناں ٹھہر میرے دل میں — یہی ہے یہی ہے مقامِ محبت
مٹے فرق وصل و فراق من و تو — جو ہو جائے راسخ مقامِ محبت
وہ آئے ہیں اور میں ہوں محوِ تصور — عجب کیف سے کیف جامِ محبت
حقیقت ہی اب ہر سو جلوہ گر ہے — جدھر پھیر دوں میں زمامِ محبت

لیکن یہ راہ بڑی کٹھن اور دشوار گزار ہے، اس میں کامیابی کی پہلی شرط ہمت و استقلال اور مشکلات و مصائب کا مقابلہ ہے۔

دیکھ یہ راہ عشق ہے، ہوتی ہے بس یوں ہی طے
سینہ پتھر کھائے جا، آگے قدم بڑھائے جا

قدم جس طرح ہو بڑھاتا چلا جا — کہیں پر نہ رک لڑکھڑاتا چلا جا

بس چلا چل قطع راہِ عشق اگر منظور ہے ۔

یہ نہ دیکھ اے ہم سفر نزدیک ہے یا دُور ہے

ہمیں تو رات دن اے ہم سفر گرم سفر رہنا

سفر محدود ہو جس کا اُسے ہو فکر منزل کی

اس راہ کی لغزش بھی وصول کا ذریعہ ہے ۔

میں لاکھ چلا پھر بھی پہونچا نہ سرِ منزل

کچھ تو ہی سہارا دے اے لغزشِ مستانہ

اور اس کی گم کردہ راہی کا بھی یہ درجہ ہے ۔

طریقِ عشق میں جو جس قدر گم کردہ منزل تھا

وہ بس اتنا ہی اے دل خضرِ رہ بننے کے قابل تھا

یہ دولت کیا کم ہے کہ

اک مسلسل کیف و ذوق و شوق میرے دل میں ہے

خیر یہ مقصد تو حاصل سعی لاحاصل میں ہے

اس راہ میں جان تک کی بازی لگانے سے دریغ نہ کرنا چاہیئے ۔

بے جھجک شوق سے ہاں مٹنے پہ ہو جا تیار

بے نشاں ہو کے وہ کچھ اپنا پتہ بھی دے گا

خرد ہوش سب کچھ گنواتا چلا جا نشاناتِ ہستی مٹاتا چلا جا

دیتا ہے زہر کا پیالہ مرا ساقی پہلے

پی لیا جس نے اُسے آبِ بقا بھی دے گا

جو سب کچھ ہو برباد مطلق نہ غم کر
بس اک خیر دل کی مناتا چلا جا

اس راہ کی دوسری شرط جنون و سودا ہے، بغیر مجنونانہ طلب کے مقصود حاصل نہیں ہو سکتا، اور بغیر خود کو کھوئے ہوئے مطلوب نہیں مل سکتا۔

میں ہوں اور حشر تک اس در کی جبیں سائی ہے
سر زاہد نہیں یہ سر سودائی ہے

اب بھی مجذوب جو محروم پذیرائی ہے
کیا جنوں میں ابھی آمیزش دانائی ہے

بقدر جنوں مجذوب واصل ہوتا جاتا ہے
کہ ہوش اپنا تو زائل اُن کا حاصل ہوتا جاتا ہے

ادھر ہر گام پر گم کردہ منزل ہوتا جاتا ہے
بفیض جذب ادھر مجذوب واصل ہوتا جاتا ہے

حدیث کی کتابوں میں صحابہ کرامؓ کے حالات میں آتا ہے کہ اگر تم ان کی شدت ایمان اور جوش عمل کو دیکھتے تو ان کو مجنوں سمجھتے، اور کما قال کوئی طالب محروم نہیں، قرب دوری وغیرہ اس راہ کے مختلف کوائف ہیں۔

حد عشق کی کر رہے ہیں وہ قائم
کبھی پاس آکر کبھی دُور ہو کر

سر دار ہو کر سر طور ہو کر
ترے پاس پہونچے بہت دُور ہو کر

زیادہ قرب خطرناک ہے، اس میں طالب کو اپنی ذات پر مطلوب کا

ڈھنگ کا ہو جاتا ہے۔

نہ پاس آؤ اتنے ملے دور ہو کر　　میں کچھ اور کہہ دوں نہ منصور ہو کر

مطلوب کی ظاہری بے توجہی بھی در پردہ توجہ ہے، اور کسی نہ کسی عنوان طالب کی تشفی کا سلسلہ قائم رہتا ہے۔

مجھے پاس کیوں ہو کہ وہ دل میں بیٹھے　　برابر تسلی دیے جا رہے ہیں

ان سا کوئی ہمدم کوئی دمساز نہیں ہے　　ہر وقت ہیں باتیں مگر آواز نہیں ہے

اس کا غضب بھی دراصل کرم ہے، صرف پردہ عتاب کا ہے، کہ یہ بھی اصلاح و تطہیر کا طریقہ ہے،

سمجھتے تھے جس کو غضب ہو رہا ہے　　وہی اب کرم کا سبب ہو رہا ہے

کرم ہی کرم روز و شب ہو رہا ہے　　مگر ہاں بہ شکلِ غضب ہو رہا ہے

بعض روایات میں بھی آیا ہے کہ گنہگار مسلمانوں کے عذاب کا مقصد معاصی کی آلائش سے ان کی تطہیر ہے۔

یادِ محبوب کی مختلف کیفیتیں۔

بس اب تو ہمدمو کوئی جگہ ایسی کہیں ہوتی

اکیلے بیٹھے رہتے یاد اُن کی دل نشیں ہوتی

رات دن میں ہوں تری یاد ہے تنہائی ہے

کام ہی کچھ ہے نہ فرصت ہی کبھی پائی ہے

خانۂ دل میں عجب انجمن آرائی ہے

رو کشِ بزمِ دو عالم مری تنہائی ہے

جلوۂ محبوب کے لئے قلب کا ماسوا سے فارغ ہونا ضروری ہے کہ
ایک مکان میں دو مکیں نہیں رہ سکتے۔

آ میرے دل کی بزمِ تمنا میں اب تو آ
دیتے تھے جو دھواں وہ دیے سب بجھا دیے

وارفتگیِ شوق کا امکاں نہیں رہا
آ جا کہ دل میں اب کوئی ارماں نہیں رہا

ہر تمنا دل سے رخصت ہو گئی
اب تو آ جا اب تو خلوت ہو گئی

کوئی حسرت ہے نہ اب کوئی تمنا دل میں ہے
شکر ہے اب عشق اپنا آخری منزل میں ہے

باقی نہیں اب کوئی تمنا مرے دل میں
موجود ہے عکسِ رخِ زیبا مرے دل میں

کس جگہ بے خودیِ شوق یہ لے آئی ہے
کہ جہاں کوئی تمنا نہ تمنائی ہے

تصوّرِ محبوب کی عظمت اور اُس کے نتائج

اُس رُخ کے تصوّر کو آنکھوں میں جاتا ہے
ہر ذرۂ عالم کو اک طور بنانا ہے

یہ آج تصوّر میں مرے کون حسیں ہے
ہر موجِ نظر طور ہے دل عرشِ بریں ہے

کیا کہیں تصوّر میں کس سے لگانے
جو دل پہ سلسلۂ ضیا باریاں ہیں

تصورِ عرش پہ ہر وقت سجدے جبیں میری
مرا اب پوچھنا کیا آسماں میرا زمیں میری

غلبۂ تصور کے نتائج ۔

یوں تصور ترا پیوست دل و جاں ہو جائے

فرقتِ وصل مجھے عشق میں آساں ہو جائے

تری تصویر سی ہر سو کھچی معلوم ہوتی ہے

تصور کی یہ سب صورت گری معلوم ہوتی ہے

جو میں دن رات یوں گردن جھکائے بیٹھا رہتا ہوں

تری تصویر سی دل میں کھچی معلوم ہوتی ہے

جہاں میں جاؤں مرے ساتھ ہے تصورِ دوست

تمام روئے زمیں اب ہے کوئے یار مجھے

فاینما تولوا فثم وجہ اللہ ۔

تصور کی دیکھو تو معجز نمائی کہ مجھ پر تمہارا گماں ہو رہا ہے

جہاں وحدت کی نیرنگی ،

جلوہ گر عالم وحدت میں ہے کثرت ہر سو

آئینہ خانہ میں تو محوِ خود آرائی ہے

آئیں بھی تو کیونکر مری پہچان میں آئیں

بیرنگ ہیں سو رنگ کی لیکن ہیں قبائیں

جہاں میں ہر سو ہے اُن کا جلوہ کہاں نہیں ہے کدھر نہیں ہے

وہ ذرّے ذرّے میں جلوہ گر ہے، مگر کوئی دیدہ ور نہیں ہے

حجاب کے پردے ،

یہ اپنی حدِ نظر ہے کسی کی دید کہاں
یہ عکسِ حسنِ نظر ہے جمالِ یار نہیں

وہ جلوہ تو ہر سو عیاں ہو رہا ہے حجاب خودی درمیاں ہو رہا ہے

دکھا نہ تو روئے آفتابی، حجاب تیری ہے بے حجابی
مری نظر کی ہے یہ خرابی، کہ تابِ جلوہ حجاب میں ہے

ناکام ہی تا عمر رہا طالبِ دیدار ہر جلوہ ترا بعد کو پردہ نظر آیا

طلب میں کیا کیا نہ زور مارے، کبھی نہ جیتے ہمیشہ ہارے
حجاب گو اُٹھ گئے ہیں سارے ہنوز پھر نقاب میں ہے

پردہ امتحان طلب ہے، اس سے مایوس نہ ہونا چاہیئے۔

حیاں ہو کے جلوہ نہاں ہو رہا ہے طلب کا مری امتحاں ہو رہا ہے

اس پردہ کو ہٹانے کے لیے ہمت چاہیئے۔

اُٹھ جائے ابھی کام لیں ہمت سے اگر ہم
اک یوں ہی سا پردہ ہے اِدھر وہ ہیں اُدھر ہم

تو اپنے رُخ کے سامنے پردے ہزار ڈال
سب دور ہیں بس اک نگہِ کامیاب میں

سب ترا پردہ دھرا رہ جائے گا جب ذرا گردن جھکا لی جائے گی

پردہ اُٹھتا ہے۔

چھپاتا بھی ہے، اور دکھاتا بھی رُخ کو
وہ رک رک کے زیر نقاب آ رہا ہے

یہ برق صفت کون اُٹھا دیتا ہے پردہ
ہو جاتا ہے اک دم جو اُجالا میرے دل میں

دل کی دنیا جو جگمگا اُٹھی کس نے پردہ اُٹھا کے دیکھ لیا

جلوۂ جمال اور اُس کی تجلی کے ظاہری اثرات، حیرت۔

نقاب اُلٹ بھی دو اب کوئی ہوشیار نہیں
کہ منتظر کو بھی احساس انتظار نہیں

کبھی تکلیف فرما کر وہ آئے بھی تو کیا آئے
انھیں خلوت ہی میں رکھتی ہے حیرت اہل محفل کی

وہ اُٹھ بھی گئے بزم سے کب کے مگر اب تک
اللہ ری حیرت جو جہاں تھا وہ وہیں ہے

جس کو بھی یہاں دیکھا حیرت زدہ ہی دیکھا
یہ آپ کی محفل ہے یا آئینہ خانہ ہے

جلوۂ جمال، کی باطنی تجلیاں،

نکلتی ہیں ہر موئے تن سے شعاعیں یہ کس مہ کا جلوہ عیاں ہو رہا ہے

اے جذب لا بٹھا یا دل و دیدہ میں اُنھیں
تو نے تو میرے دونوں جہاں جگمگا دیے

یہ کون آکے بیٹھا سویدائے دل میں سیاہی چمکنے لگی نور ہو کر

سینہ میں تجلی کا جو ہر دم ہے یہ عالم
کیا عرش معلیٰ اُتر آیا مرے دل میں

کیسے دیکھ کر آج ہم آ رہے ہیں   کہ آنکھوں سے انوار برسا رہے ہیں

جذب و بے خودی۔

جدھر جذب ہم کو لئے جا رہا ہے   کئے بند آنکھیں چلے جا رہے ہیں

گم گشتۂ حیرت کوئی مجھ سا بھی نہیں ہے
میں خود ہوں کہیں دل ہے کہیں ہوش کہیں ہے

اس کے نتائج۔

مرا دل ہے ہر وقت محو تماشا   فدا میری غفلت پہ ہشیاریاں ہیں

کسی اور عالم میں پہونچے ہوئے ہیں   جہانِ خودی سے گزر جانے والے

قتیلِ راہِ محبت یا واصلین بحق کے لئے حیاتِ ابدی کی نوید،

تیرے کشتوں نے حیاتِ ابدی پائی ہے
اس کو کہتے ہیں مسیحا یہ مسیحائی ہے

لا تقولوا لمن یقتل فی سبیل اللہ امواتا۔

کشتگانِ خنجرِ تسلیم را   ہر زماں از غیب جانے دیگر است

سالکین کی منزل بہت بلند اور قید مکان ولامکان سے آزاد ہے۔

بنا نہ دنیا میں تو نشیمن نہیں ہے یہ باغ تیرا گلشن
کہ بلبل قدس تو ہے تیرا تو شاخ طوبیٰ پر آشیاں ہے

پر شکستہ نہ سمجھ بلبل قدسی ہوں میں
پرِ جبریل مرے بازوئے پرواز میں ہے

محمود فضائیں ہیں یہ مرغانِ ہوا کی   اڑتے ہیں جہاں ہوش وہ ہیں اور فضائیں

یہ قیدِ کون و مکاں تو شایانِ شانِ آزادگاں نہیں ہے

میرا جہاں ہے وہ عالم ہو جہاں زمین آسماں نہیں ہے

زمینِ مجذوبِ نارسیدہ کی عرش و کرسی و لامکاں ہے

پہونچ کسی کے شکستہ پا کی بھی اللہ اللہ کہاں کہاں ہے

مجذوب اور سالک فرق،

اگرچہ مجذوب اور سالک ہیں دونوں ایک ہی راستہ پر

بڑا تفاوت ہے منزلوں میں یقیں یقیں ہے گماں گماں ہے

ایک دوسرے شعر میں اس سے بلند تر تخیل کو اس سے زیادہ بلیغ پیرایہ میں بیان کیا ہے۔

بے خودیِ شوق یہاں جلوہ گہِ ناز میں ہے

طور پر بحث ابھی صورت و آواز میں ہے

اقبال نے بھی تقریباً اسی مفہوم کو اس شعر میں ادا کیا ہے۔

بوعلی اندر غبارِ ناقہ گم دستِ رومی پردۂ محمل گرفت

حقیقت یہ ہے کہ عشق کی وارفتگی کا درجہ علم و عقل کے تدبر اور احتیاط سے بمراحل بلند ہے، بلکہ بقولِ اقبال ع

عشق تمام مصطفےٰ عقل تمام بولہب

عشق سراپا حضور، علم سراپا حجاب

علم مقامِ صفات عشق تماشائے ذات

اس تشریح کے بعد اب اس شعر کو پڑھیے۔

بے خودِ شوق یہاں جلوہ گہِ ناز نہیں ہے
طور پہ بحث ابھی صورتِ آواز یں ہے

اس سے معراج نبوی بھی مُراد لی جا سکتی ہے، مقام توحید،

جب مہر نمایاں ہوا سب چھپ گئے تارے
تو مجھ کو بھری بزم میں تنہا نظر آیا:

طلب توحید،

ترے ہوتے یہ کیا اے جلوۂ جانانہ ہوتا ہے
خبر لے کعبۂ دل پھر مرا بت خانہ ہوتا ہے

بقا و فنا۔

یوں ہی تم پہ مرتا رہوں زندگی بھر
بقا بھی برنگِ فنا چاہتا ہوں:

ادائے خاص۔

یوں تو ہیں سبھی آپ کے اس حسن کے شیدا
مرتا ہوں میں جس پہ وہ ادا اور ہی کچھ ہے

تقدیر کے معنی۔

ایسی ضد کا کیا ٹھکانا ہے بھلا   بات جو کہہ دی وہ قسمت ہو گئی

سوز محبت اور گداز عشق کی کیفیتیں | دل کا سوز و جراحت عشق و محبت کی روح ہے
اس کے بغیر عشق میں جان نہیں پیدا ہوتی۔ ع
برق گرتی ہے تو یہ نخل ہرا ہوتا ہے

اس سے مراد فریاد و فغاں اور نالہ و شیون نہیں ہے، بلکہ سوز و ساز اور درد و لذت و الم کی وہ لطیف کیفیت مقصود ہے، جس سے روح لذت گیر ہوتی ہے، عشق حقیقی میں یہ کیفیتیں اور زیادہ تیز اور شدید ہوتی ہیں، روایتوں میں ہے کہ حضرت امیر خسرو کا دل سوز عشق سے اتنا بریاں تھا، کہ حضرت نظام الدین اس پر فخر کرتے تھے، اور فرماتے تھے، کہ جب خدا قیامت میں مجھ سے پوچھے گا، کہ میرے لئے کیا تحفہ لایا ہے، تو عرض کروں گا کہ اس ترک بچّہ کا سوز سینہ لایا ہوں۔

اس عالم میں دل پر سوز و ساز، درد و الم، کیف و سرور، حسرت و یاس، امیدی اور ناامیدی کی مختلف کیفیتیں طاری ہوتی ہیں، مجذوب کے کلام میں جا بجا یہ کوائف نظر آتے ہیں۔

درد و الم کی مختلف کیفیتیں،

عالم عشق و محبت میں بہار آئی ہے

آنسوؤں کی ہے جھڑی، غم کی گھٹا چھائی ہے

اس دل زار سے مفر عشق میں جیتے جی نہیں

رونا ہے مجھ کو عمر بھر، غم مرا عارضی نہیں

غمزدگان عشق میں مجھ سا کوئی حزیں نہیں

روتا تو رات دن ہوں میں تر مری آستیں نہیں

ٹھہرے گا دل تھمیں گے اشک آہ مگر ابھی نہیں

غم ہے یہ دل لگی نہیں، رونا ہے یہ ہنسی نہیں

ہنسی بھی ہے میرے لب پہ ہر دم اور آنکھ میں بھی تری نہیں ہے

مگر جو دل رو رہا ہے پیہم کسی کو اس کی خبر نہیں ہے

کسی حال میں چین پاتا نہیں دل — نہ مغموم ہو کر نہ مسرور ہو کر

لذت الم اور ایذا طلبی ۔

جہاں سانس لینے میں ہو آہ پیدا — اب ایسی کوئی میں فضا چاہتا ہوں

مری چشم پُرنم مرا قلب پُرغم — یہ مینائے الفت وہ جامِ محبت

پھونک دی اک روح تو تھی میں مری ہر آہ نے

درد دل نے میری رگ رگ کو رگِ جاں کر دیا

روح مثل شعلۂ جوالہ رقصاں ہے مری

کس مزے کی ہائے سوزش داغہائے دل میں ہے

یہ تلخ ہے گو غم نہانی مگر ہے لبریز شادمانی

سرور کی جیسے ہو نشانی وہ اک جو تلخی شراب میں ہے

حسرت و یاس ،

یاس بھی اب دل کی فطرت ہو گئی — آرزو جو کی وہ حسرت ہو گئی

میں ہی محروم ہوں اک خلق تماشائی ہے

کیا غضب ہائے یہ ایسے ذوق جبیں سائی ہے

جی رہا ہوں موت کی اُمید میں — مر ہی جاؤں گا جو صحت ہو گئی

بے کسی اور بے بسی کی کیسی حسرتناک تصویر ہے ۔

زباں بے دل ہے اور دل بے زباں ہے کہ مجبوری — بیاں ہو کس طرح آئے کہ جو دل پر گزرتی ہے

ہائے مجھ سا بھی جہاں میں کوئی مجبور نہیں
خود کو مجبور سمجھنے کا بھی مقدور نہیں

سکونِ قلب یا غم کی انتہا۔

دفورِ غم سے اب احساس باطل ہوتا جاتا ہے
سکونِ دل کا باعث خود غمِ دل ہوتا جاتا ہے
سکوں دشمن تلاطم آشنا دل ہوتا جاتا ہے
وفورِ موج سے گرداب ساحل ہوتا جاتا ہے

چارہ گر کا اعجازِ مسیحائی۔

میرے چارہ گر کا دیکھے تو کوئی حسنِ علاج
محو دل سے امتیازِ درد و درماں کر دیا

تیرے کشتوں نے حیاتِ ابدی پائی ہے
اس کو کہتے ہیں مسیحا یہ مسیحائی ہے

دنیائے عشق و محبت کے آئین و قوانین جدا ہیں، کہنے والوں نے تو یہاں تک کہہ دیا ہے، ع

عاشقاں را مذہب و ملت جداست

اس لئے عشاق کی عبادت بھی عوام سے مختلف ہے، اس میں ظاہری شرائط کی پابندی کے ساتھ عبادت کی اصل روح ضروری ہے، اس کے بغیر عبادت نہیں ہوتی، حدیثوں سے بھی ثابت ہے کہ اخلاص و حضورِ قلب کے بغیر عبادت ناقص رہتی ہے۔

پھر زاہدوں کی عبادت صرف نماز تک محدود ہے، لیکن اہل دل کی عبادت یعنی ذکر و فکر ہر وقت جاری رہتی ہے، جس کے لئے کسی سمت و آستانہ کی بھی ضرورت نہیں، بلکہ صرف معبود و مسجود کا تصور کافی ہے، اسی کو حضرت مجذوب نے سجدۂ بے جبیں سے تعبیر کیا ہے۔

تم کو نصیب زاہد و سجدۂ بے جبیں نہیں
پیش نظر ہے آستاں مدِ نظر مکیں نہیں

اس کی بنیاد اسی آیت پر ہے، یذکرون اللہ قیاما وقعودا وعلے جنوبھم ویتفکرون فی خلق السمٰوات والارض، الخ
سجدہ درحقیقت وہی ہے کہ ایک مرتبہ سر جھک جانے کے بعد پھر نہ اٹھے۔

جھک کے اٹھے نہ پھر کبھی لائق سجدہ ہو جبھی
میرا سر سجود ابھی درخورِ آستاں نہیں

اور حشر تک جبیں سائی قائم رہے۔

میں ہوں اور حشر تک اس در کی جبیں سائی ہے
سر زاہد نہیں، یہ سر سر سودائی ہے

اہلِ صفا کا وضو،

بجائے سجدہ بہایا کئے گھڑے آنسو
نماز سب نے پڑھی ہم رہے وضو کرتے

اذان اور نماز،

تری گلی ہو مری فغاں ہو مری جبیں تیرا آستاں ہے
یہی ہو بس اب نماز میری یہی بس اب مری اذاں ہے

در پہ گدا نواز کے دیکھے سر نیاز ہوں
عشق میں زاہد میاں بس جانتا یہ نماز ہوں

تسبیح | عاشق تو ہے ملے زاہد ہر وقت عبادت میں
اشکوں کا مسلسل ہے اک سبحہ صد دانہ

اس عبادت کا درجہ :-

عرش بریں ہے زاہد و سجدہ گہ نماز عشق
تم کو میں کیا دکھا سکوں مرتبہ نیازِ عشق

سجدہ :-

یہ داغ سجدہ داغ غلامی ہے آپ کا
پہچانے اب تو جاتے ہیں بس اس نشاں سے ہم
سیماھم فی وجوھھم من اثر السجود۔

نغمہ وساز | بزرگانِ چشت کو سماع سے خاص مناسبت تھی، بلکہ بعضوں پر اسکا اتنا غلبہ رہا ہے کہ ان کو نے سے بھی نے نواز ہی کی آواز سنائی دیتی ہے۔

خشک تار و خشک چوب و خشک پوست
از کجا می آید ایں آوازِ دوست

حضرت خواجہ صاحب گو اس شراب سے محترز رہے، لیکن وہ سلسلہ چشتیہ صابریہ کے اس باطنی اثر کو نہ مٹا سکے، بلکہ یہاں تک کہا

جا سکتا ہے کہ وہ خود سراپا ساز و نغمہ تھے۔

جنھیں ان کی زمزمہ سنجی سے سامعہ نوازی کا موقع ملا ہے وہ اس کی تصدیق کر سکتے ہیں کہ خواجہ صاحب ہمہ تن جوش و مستی تھے، اللہ تعالیٰ نے ان کی آواز میں بھی لحنِ داؤدی کا اثر عطا فرمایا تھا، جب وہ جوش و مستی میں مترنم ہوتے تھے، تو ان کا ہر موئے بدن ساز بن جاتا تھا۔

خود فرماتے ہیں:۔

یوں تو اس پیکرِ ہستی میں مرے کچھ بھی نہیں
کوئی مطرب ہو تو ہر نغمہ مرے ساز میں ہے

مرا ساز ہستی ہے لبریز نغمہ — کوئی مطرب خوشنوا چاہتا ہوں

ان کا یہ نغمہ کسی اور ہی ساز کی آواز تھی۔

یہ نغمۂ دلکش مرا ہے ساز نہیں ہے
وہ بول رہے ہیں مری آواز نہیں ہے

ان کے نغموں کی تاثیر کا یہ حال تھا۔

جان رگ رگ سے کھنچی آتی ہے کانوں کی طرف
کس قیامت کی کشش اُف تری آواز میں ہے

جی اُٹھے مُردے تری آواز سے — پھر ذرا مطرب اسی انداز سے

نغمہ پیدا ہے کہ نوحہ ساز سے — ہوک سی اٹھتی ہے اس آواز سے

تن تنا تن کہ سینہ میں پیدا ہوئی جلن — یہ وہ تھے کہ آگ سے چنگ و رباب میں

اس پر بھی ان کا اصل نغمہ ناشنیدہ ہی رہا۔

کوئی محرم نہیں سب حال مرا راز میں ہے

ناشنیدہ ہے وہ نغمہ جو ابھی ساز میں ہے

یہ نغمہ وہی تھا جس کا اس شعر میں اشارہ ہے۔

سرِّ پنہان است اندر زیر و بم

فاش اگر گویم جہاں برہم زنم

تغزل یہاں تک خواجہ صاحب کے کلام کی معنوی اور باطنی حیثیت پر گفتگو تھی، جیسا کہ ہم نے اوپر لکھا ہے، فن کی حیثیت سے بھی ان کا کلام استادانہ ہے، اس میں بڑی جامعیت اور ہر رنگ کے نمونے موجود ہیں، ان کو دکھائے بغیر یہ تبصرہ ناقص رہ جائے گا، اس لیے ان کے کلام کے بعض ظاہری نمایاں رخ پیش کیے جاتے ہیں، خواجہ صاحب فطرۃً شاعر لطیف الاحساس، خوش خیال، خوش نگاہ، جمال پسند اور رنگین مزاج تھے، اس کا پرتو ان کی شاعری میں بھی نمایاں ہے، اور اس میں دنیاوی عشق و محبت کے نہایت رنگین اور دلفریب مرقعے ہیں، خود فرماتے ہیں:۔

حُسن کا خوشنما چمن عشق کا دل کشا چمن

سر سے ہے تا بہ پا چمن یہ مری شاعری نہیں

اس میں لطیف، ہلکے اور شوخ اور گہرے ہر رنگ کے خوشنما پھول ہیں۔

کہیں کہیں بیان کی شوخی اور رنگینی اتنی تیز ہو گئی ہے، کہ اس کے

سامنے داغ اور امیر کا رنگ پھیکا نظر آتا ہے، اور یہ یقین کرنا مشکل ہو جاتا ہے کہ ایک ساز سے ایسے متضاد نغمے بھی نکل سکتے ہیں، مگر اس موج کوثر کی طہارت اور پاکیزگی کو مادی کثافت سے مکدر کرنا ذوق سلیم گوارا نہیں کرتا اس لیے صرف لطیف اور پاکیزہ تغزل کے نمونے پیش کیے جائیں گے، ان میں سے اکثر اشعار میں نہایت نمایاں اور کھلا ہوا تغزل ہے، اور بعض میں حقیقت اور مجاز کی سرحدیں اتنی ملی ہوئی ہیں، کہ دونوں میں امتیاز کرنا مشکل ہے، اس کے لیے میں نے اپنے ذوق کو رہنما بنایا ہے۔

محبت کا ایک رخ اوپر پیش کیا جا چکا ہے، اب اس عالم آب و گل کی محبت کی کچھ کیفیتیں ملاحظہ ہوں:-

مرے سامنے لو نہ نام محبت
چھلک جائے گا ہائے جام محبت

تری چشم مے گوں ہے جام محبت
تری زلف مشکیں ہے دام محبت

پلا دے پلا دے پلا دے پلا دے
پلا دے ان آنکھوں سے جام محبت

محبت محبت محبت محبت
بڑا لطف دیتا ہے نام محبت

محبت کے بدلے محبت ستم ہے
نہ لے اُف نہ لے انتقام محبت

نہ رک ہائے قاصد نہ رک ہائے قاصد
کہے جا کہے جا پیام محبت

محبت کا کھیل،

یہ کھیل دل کے لینے کے جو کھیلتے ہیں آپ
مجھ سے نہ کھیلیے کسی ناداں سے کھیلیے

جو چاہیے کھیل کھیلیے دنیا ہے آپ کی
ہولی مگر نہ خونِ دل و جاں سے کھیلیے

اے جلوہ ہائے دوست بس اب کیجئے کرم
اتنا نہ میرے دیدۂ حیراں سے کھیلئے

کمالِ حسن و بہارِ حسن ۔

حسن خود حسن ہوا تیرے حسیں ہونے سے
روئے زیبا ترا خود زینتِ زیبائی ہے

تجھے زیب و زینت کی حاجت ہی کیا ہے
نظر میں سما کر سنور جانے والے

تن پاک میں پر لباسِ مصفّا — وہ آرہے ہیں نورٌ علیٰ نور ہو کر
وہ نظروں میں میری کھبے جارہے ہیں — سراپا ادا چشمِ بد دور ہو کر

یہ ناز یہ انداز یہ شوخی یہ ادائیں
اے زلف بدوش آ تری لے لوں میں بلائیں

قبا رنگیں بدن رنگیں دہن رنگیں نظر رنگیں
تمھیں دیکھا کہ اک جا مجتمع رنگینیاں دیکھیں

نہا کر تو نہ جانے حسن کا عالم ہی کیا ہوگا
پسینہ پونچھنے سے جب تری رنگت نکھرتی ہے

مستانہ ادائی ۔

صراحی دربغل ساغر بکف مستانہ وار آجا
لگائے آس بیٹھا ہے اک مستانہ برسوں سے

آرہا ہے جو متانہ وہ مستِ ناز — اب طبیعت کیا سنبھالی جائے گی

ان اشعار پر کسی فارسی استاد کے دو شعر یاد آ گئے۔

پریشاں کاکل و آغوش واستانہ می آئی
مسرت گردم بایں شانے کہ از میخانہ مے آئی

باصد کرشمہ آں بت بدمست مے رود
خود می کند خرام و خود از دست می رود

ایک بہترین شعر

نہیں درکار ہے ہم کو پیالے جا تو ہی اے ساقی
ہمیں تو مست کرتا ہے ترا سرشار ہو جانا

اس کیفیت کی تشریح نہیں ہو سکتی۔

مستی شباب:۔

بوضع رندانہ گھومتے ہیں قدم حسیں بڑھ کے چومتے ہیں
بشانِ مستانہ جھومتے ہیں وہ کیف مستی شباب میں ہے

جلوۂ حسن کے اثرات:۔

یہ کون آیا کہ دھیمی پڑ گئی لو شمع محفل کی
پتنگوں کی جگہ اڑنے لگیں چنگاریاں دل کی

اہل محفل فرشِ محفل ہو گئے بزم میں آئے وہ اس انداز سے

اللہ اللہ ترے آتے ہی ہجوم اشکوں کا
حسرتِ دید بھی مشکل سے نکل پائی ہے

احترامِ حسن:۔

خود کو بھی ترے عشق میں ہم غیر ہی سمجھے
جی بھر کے نہ دیکھا کہ لگا دیں گے نظر ہم
کس آنکھ سے دیکھیں انھیں ہمت نہیں پڑتی
وہ مصحف رُخ پاک ہے آلودہ نظر ہم

مجبوریِ نگاہ :-

کروں ناصح میں کیونکر ہائے یہ وعدہ نہ دیکھوں گا
نظر پڑ جائے گی خود ہی جو دانستہ نہ دیکھوں گا

نظر شوخ کی نیرنگی :-

ان کی نظر شوخ ہے اک طرفہ تماشا
ہر شخص سمجھتا ہے ادھر دیکھ رہے ہیں
یوں نظر تو مجھ پہ ڈالی جائے گی   جب میں دیکھوں گا ہٹا لی جائے گی
ادا یہ دیکھ کے عاشق کو جھینپ جانے کی
حضور رکھتی ہے رسوائیاں زمانے کی

دل کی چمن آرائی :-

دل میں گل عشق نے داغوں کے کھلائے تو بہت
ان کی گلگشت کے قابل یہ گلستاں نہ ہوا

متفرق :-

غزل ہے مری اور وہ گا رہے ہیں   غضب کر رہے ہیں ستم ڈھا رہے ہیں
گنگناؤ گے جو اس انداز سے   خود تڑپ نکلیں گے نغمے ساز سے

اب صبح ہوئی اب وہ اُٹھے اب وہ سدھارے
آثار سحر دیکھتے ہیں قبل سحر ہم

نہ صبح آ رہی ہے نہ وہ آ رہے ہیں
نہ موت آ رہی ہے نہ خواب آ رہا ہے

وہ میخانہ بردوش چرخ بریں پر
بصد کیف مستی سحاب آ رہا ہے

وہ بیٹھے رہتے ہیں دیکھوں تو بت بنے کب تک
جو بے قرار نہ کر دوں تو بے قرار نہیں

سلاست و صفائی حضرت مجذوب زبان و ادب کا بھی نہایت ستھرا مذاق رکھتے تھے، ان کا پورا کلام زبان کی صفائی، سادگی اور سلاست کا نمونہ ہے، ان کے بہت کم اشعار اس وصف سے خالی نکلیں گے، خصوصاً چھوٹی بحروں کی غزلیں جن کے بہت سے اشعار اوپر نقل ہو چکے ہیں، سادگی اور سلاست کے لحاظ سے سہل ممتنع کے حکم میں ہیں، طویل بحروں میں بھی بہت سے متفرق اشعار ایسے ڈھلے ہوئے اور برجستہ نکل گئے ہیں، کہ ضرب المثل بننے کے لائق ہیں۔

چند مثالیں ملاحظہ ہوں :-

وفا کر کے اس کا صلہ چاہتا ہوں
بڑا ناسزا ہوں سزا چاہتا ہوں

محبت کا اپنی صلہ چاہتا ہوں
سزا چاہتا ہوں سزا چاہتا ہوں

بھری بزم میں راز کی بات کہہ دی
بڑا بے ادب ہوں سزا چاہتا ہوں

ستائے بھی کوئی تو پائیں دعائیں
گدا ہوں میں سب کا بھلا چاہتا ہوں

میں اس بے وفا سے وفا چاہتا ہوں
مجھے دیکھئے کس سے کیا چاہتا ہوں

چلا ہوں کسی شوخ سے عرض کرنے
خبر یہ نہیں اس سے کیا چاہتا ہوں

ارے رکھ ہنسی کو ہنسی ہی کی حد میں
ہلاک تبسم ہوا چاہتا ہوں

میں کب تک پھروں دربدر مارا مارا
ترے در پہ اب بیٹھا چاہتا ہوں

ادھر اس طرف اک نظر بھی خدارا
بہ پاس مروت بہ نام محبت

کہاں ان کی بزم طرب کے ہوں قابل
میں شوریدہ سر تلخ کام محبت

زباں سے وہ کچھ ہی کہے جائیں لیکن
نگہ دے رہی ہے پیام محبت

ہٹا لے ارے اپنی مستانہ نظریں
چھلکنے کو ہے میرا جام محبت

نہ رک ہائے قاصد نہ رک ہائے قاصد
کہے جا کہے جا پیام محبت

چھپ سکیں گے حضور پھر کیونکر
جو تصور میں لا کے دیکھ لیا

آج میں نے وہ چاند سا مکھڑا
بکھری زلفیں ہٹا کے دیکھ لیا

اب تو چین آگیا تجھے قاتل
خاک و خوں میں لٹا کے دیکھ لیا

مجذوب اپنی حد سے بڑھائیں نہ جذب آپ
حضرت بہت نہ جلوۂ جاناں سے کھیلئے

لینے ہی دیتا اب نہیں کم بخت دم مجھے
کب تک اب آہ اس دل ناداں سے کھیلئے

میرے دل تپاں سے یہ اچھی نہیں ہے چھیڑ
ایسے نہ آپ شعلۂ بداماں سے کھیلئے

مجذوب کی تیغ زباں کی چمک سب سے زیادہ شیخ و ناصح اور زاہد کے مقابلہ میں نظر آتی ہے۔

یہ سب سوچ کر دل لگایا ہے ناصح نئی بات کیا آپ فرما رہے ہیں
میں مجذوب ہوں کچھ سمجھئے تو ناصح بھلا آپ کس کو یہ سمجھا رہے ہیں

کچھ تو ہو اے شیخ جی تلقین توبہ کا عوض
اور کیا خدمت کریں حضرت یہ حاضر جام ہے

ابر میں تلقین توبہ شیخ جی ؟ وقعت فرمان عالی جائے گی

رہیے تو کبھی رندوں میں سے شیخ زمانہ
قائل ابھی حضرت کا یہ احقر تو نہیں ہے

اتنے خفا جو آپ ہیں سچ کہدے شیخ جی ؟
ایسے ہی کیا تھے آپ مقدس شباب میں

تشبیہات | حضرت مجذوب میں ادبی اختراع کا بھی مادہ تھا۔ اس لیے انھوں نے بعض پرانی تشبیہوں کو حسن استعمال سے چمکایا ہے، اور بہت سی نئی تشبیہیں پیدا کی ہیں، اور ان کی شاعری کی طرح ان کی تشبیہات میں بھی بڑی بلندی ہے، بعض مثالیں ملاحظہ ہوں :-

موئے بدن تشبیہ شجر طور سے اور دل کی عرش بریں سے۔

یہ کون تصور میں مرے آج حسیں ہے
ہر مو شجر طور ہے دل عرش بریں ہے

دل سوزاں کی تشبیہ شمع سے اور ارمانوں کی پروانوں سے۔

بھاگتا ہے دل سوزاں عبث ارمانوں سے
جس جگہ شمع گئی گھر گئی پروانوں سے

سودائے سر کی تشبیہ تاج سے اور داغ دل کی نگین سے۔

سر میں مرے سودا ہے کہ ہے تاج میں گوہر
دل میں ہے مرے داغ کہ خاتم میں نگیں ہے

دل کے داغوں کی چراغاں سے،

اے سوزِ عشق تو نے مجھے داغ کیا دیے
جیسے چراغ دل میں ہزاروں جلا دیے

چمن آرائی سے،

دل میں گل عشق نے داغوں کے کھلائے تو بہت
اُن کی گلگشت کے قابل یہ گلستاں نہ ہوا

دل کی سمندر سے اور دیدۂ تر کی سحاب سے،

یہ دیکھ کر میرا دیدۂ تر سمجھ لو خود حالِ قلب مضطر
کہ ہوگا کس جوش میں سمندر جو یہ تلاطم سحاب میں ہے

چینِ جبیں کی موج مے سے اور چشم خشمگیں کی شراب آتشیں کے جام سے۔

مجھے اک موجِ مے ہے یہ تری چینِ جبیں ساقی
شرابِ آتشیں کا جام چشمِ خشمگیں ساقی

ایک نادر مرکب تشبیہ،

ترساں سوارِ کشتیِ طوفاں رسیدہ ہایم

ارماں لرز رہے ہیں دلِ بے قرار میں

ڈھلکے ہوئے آنسو کی قطرۂ خارج از مے سے،

وہ کیا آنسو ڈھلک جائے جو اے دل دیدۂ تر سے

وہ قطرہ خارج از مے ہے چھلک جائے جو ساغر سے

ابرِ سیاہ کی زلف سے اور برقِ تاباں کی ساغر سے،

یہ فصلِ گل باایں ابرِ سیاہ و برقِ تاباں ہے

کہ در کف ساغر و بر دوش زلفِ عنبریں ساقی

خلعتِ نو،

جنت کو جب چلے ہمیں اُترا لباسِ تن

شاخوں کو ملتے ہیں نئے خلعت بہار میں

چشمۂ فیض،

اشک باری بھی اشک باری ہے چشمۂ فیض اُن کا جاری ہے

محاکات | محاکات یعنی کسی ظاہری و باطنی کیفیت یا منظر کی ایسی مصوری جس سے اس کی پوری تصویر نگاہ کے سامنے آجائے، بڑی مشکل چیز ہے خواجہ صاحب کا کلام اس سے بھی خالی نہیں ہے، اور جا بجا اس کے نہایت مکمل نمونے موجود ہیں،

اُن کے یہ دو شعر:-

چڑھی ہے کچھ ایسی کہ تیور تو دیکھو جواں آج پیرِ مغاں ہو رہا ہے

دمکتا ہے چہرہ چمکتی ہیں آنکھیں بڑھاپے میں بھی جان جاں ہو رہا ہے

جو لفظوں نے اپنے مرشد کی شان میں کہے تھے، اوپر نقل کئے جا چکے ہیں،
ان شعروں میں کیف باطنی سے مرشد کی سرشاری اور اس کے فروغ جمال
کی کتنی مکمل تصویر ہے،

مشاہدہ جمال سے خود رفتگی کی کیفیت،

یہ کون آرہا ہے یہ کون آرہا ہے سنبھالو لے میں گرا جا رہا ہوں
سنبھالو، سنبھالو، سنبھالو، سنبھالو گرا جا رہا ہوں گرا جا رہا ہوں

حیرت کا مرقع،

میں ہر سمت پھرتا ہوں کھویا ہوا سا نہ جانے کسے ڈھونڈنا چاہتا ہوں
کھڑا ہوں میں چپ اس طرح ان کے آگے کہ جیسے ابھی کچھ کہا چاہتا ہوں

طریق عشق میں احتیاط،

طریق عشق میں ہم یوں سنبھل سنبھل کے چلے
کہ جیسے ہاتھ میں لبریز جام ہوتا ہے

اس تشبیہ سے رفتار کی احتیاط کی کتنی مکمل تصویر سامنے آجاتی ہے،
غلبۂ تصور کی کیفیت،

کھوئے ہوئے آغوش پڑھا اس سے میں ملنے
اتنا تھا تصور کہ میں سمجھا نظر آیا ؏

خواجہ صاحب کا کلام رنگارنگ پھولوں کا ایسا سدا بہار اور دلکشا
چمن ہے کہ اس کی پوری بہار ایک گلدستہ میں نہیں دکھائی جا سکتی ۔

دامانِ نگہ تنگ و گلِ حسنِ تو بسیار

گل چینِ جمالِ تو ز داماں گلہ دارد

اس کی تفصیل کے لیے مستقل کتاب کی ضرورت ہے، اس لیے ان کی ایک طویل غزل کے منتخب اشعار جو اُن کے اصلی رنگ کا مکمل نمونہ ہیں، یہ ریویو ختم کیا جاتا ہے۔

انشاء اللہ آئندہ کسی فرصت میں دوسرے پہلوؤں کو پیش کرنے کی سعادت حاصل کی جائے گی۔

چند منتخب اشعار | یہ غزل حضرت مجذوب نے غالباً اپنے مرشد کے وصال کے بعد کہی تھی، گو راقم کو اس کا علم نہیں، لیکن اشعار کا سوز و تپش شاہد ہے کہ یہ تاثرات کسی گہری چوٹ کا نتیجہ ہیں،

حال میں اپنے مست ہوں غیر کا ہوش ہی نہیں

رہتا ہوں میں جہاں میں یوں جیسے یہاں کوئی نہیں

کوئی مزا مزا نہیں کوئی ہنسی ہنسی نہیں

تیرے بغیر زندگی موت ہے زندگی نہیں

اس دلِ زار سے مفر عشق میں جیتے جی نہیں

رونا ہے مجھ کو عمر بھر غم مرا عارضی نہیں

ٹھہرے گا دل کہیں گے اشک آہ مگر ابھی نہیں

غم ہے یہ دل لگی نہیں رونا ہے یہ ہنسی نہیں

پیرِ مغاں کا دم کہاں اس کی وہ بزمِ جم کہاں

بادہ نہیں تو ہم کہاں زیست یہ زیست ہی نہیں

جائیں بہ چشم نم کہاں اُس کی وہ بزم جم کہاں
پہلے سے اب کرم کہاں ایسا تو اب کوئی نہیں

تو جو رہا نہ ساقیا پینے کا کیا مزہ رہا
پینا نہ غم رُبا رہا پی بھی تو میں نے پی نہیں

دل میں اگر حضور ہو سر ترا خم ضرور ہو
جس کا نہ کچھ ظہور ہو عشق وہ عشق ہی نہیں

عشق کا حق ادا کیا حُسن سے حق بھی کر ادا
عشق کا کچھ ہو مرتبہ حُسن پہ برتری نہیں

پینے میں آ گیا کہاں لپٹی ہیں اُڑ کے مستیاں
اتنی ہے تند مے یہاں مست ہوں اور پی نہیں

پہلے تھا گریہ و بکا اب ہے تحسیہ و خفا
رنگ وہی ہے بزم کا ہاں وہ ہما ہمی نہیں

ہجر کی شب عجب ہے شب حال یہ کیا ہی عجب
تارے ہیں روشنی نہیں چاند ہے چاندنی نہیں

شیشہ ہے جام ہے نہ خم اصل تو رونقیں ہیں گم
لاکھ سجا رہے ہو تم بزم ابھی سجی نہیں

دیکھیے جو خود کو عرش پر اس سے بھی کہ قطع نظر
دل میں نہ ہو جو ان کا گھر یہ کوئی چیز ہی نہیں

کتنا ہی تو بڑا سہی یہ بھی ہے زاہد آگہی
سمجھے جو خود کو منتہی وہ ابھی مبتدی نہیں

حُسن کی بارگاہ ہے سہل کوئی نباہ ہے
آہ بھی اک گناہ ہے عشق ہے دل لگی نہیں

جب تری رونمائی تھی، دولتِ دردپائی تھی
دل نے ازل میں کھائی ہے چوٹ یہ آج کی نہیں

بیٹھا ہوں میں جُھکائے سر نیچی کئے ہوئے نظر
بزم میں سب ہی مگر وہ جو نہیں کوئی نہیں

مال و زر و دل و جگر کر دے سبھی کو وقفِ در
بندگی اور بقید سر ننگ ہے بندگی نہیں

اُن کی محبت آہ میں شوق بھری نگاہ میں
یعنی ابھی ہے راہ میں دل میں ابھی بسی نہیں

پاتا ہوں ان کو شک نہ کر جان سے بھی قریب تر
فرق ضرور ہے مگر حد کوئی قرب کی نہیں

اے مرے باغ آرزو کیسا ہے باغ ہائے تو
کلیاں تو گو ہیں چار سو کوئی کلی کھلی نہیں

دل میں لگا کے ان کی لَو کر دے جہاں میں نشر ضَو
شمعیں تو جل رہی ہیں سو بزم میں روشنی نہیں



شعلۂ طور

دنیائے شاعری میں جناب جگرؔ کا نام اور ان کا کلام کسی تعارف کا محتاج نہیں ہے، آج شاعری کا مذاق سلیم رکھنے والا کوئی انسان ان کی شاعری سے ناواقف نہیں نکل سکتا، موجودہ دور میں جن جن شعرا نے تغزل کی پست اور پامال سطح کو آسمان کا ہمدوش بنایا ہے ان میں جگرؔ کا نام بھی خاص طور سے لائق ذکر ہے، یوں تو جدید رنگ شاعری کو چمکانے اور اسے پاکیزہ بنانے میں دور حاضر کے بہت سے شعرا کا حصہ ہے، لیکن ان میں رئیس المتغزلین حسرتؔ، فانیؔ، اصغرؔ اور جگرؔ کی کوششیں زیادہ نمایاں اور زیادہ کامیاب نظر آتی ہیں۔ ان میں سے ہر ایک نے گلستان شاعری میں نئے نئے گل بوٹے کھلائے اور اپنی زمزمہ سنجیوں سے تغزل کی زمین کو آسمان تک پہونچا دیا، ان سب کا رنگ اور ان کی خصوصیات جدا جدا ہیں، چنانچہ حسرتؔ کا خالص تغزل، فانیؔ کا سوز و گداز، اصغرؔ کی صوفیانہ اور فلسفیانہ غزل سرائی ان کے اوصاف خصوصی ہیں، اسی طرح جگرؔ کا خاص رنگ اور اُن کی خصوصیت، ان کی بےخودی و بےخبری اور جوش و سرمستی ہے، کسی نہ کسی حد تک ان کے دوسرے معاصرین میں بھی انفرادی طور پر یہ اوصاف پائے جاتے ہیں، لیکن جگرؔ ہمہ تن جوش و سرمستی ہے، اس نے کیف بےخودی میں اپنی ہستی

بالکل گم کر دی ہے، اور یہی اس کی شاعری کا مابہ الامتیاز وصف ہے۔

جگر کی شاعری کی عمر کچھ ایسی زیادہ نہیں ہے، کم از کم انھیں پبلک میں روشناس ہوئے زیادہ زمانہ نہیں گزرا، آج سے دس پندرہ سال پہلے مخصوص طبقوں کے علاوہ عام لوگ ان کی شاعری سے کم واقف تھے۔ لیکن آج کوئی مذاق سخن رکھنے والا، اُن سے ناواقف نہیں نکل سکتا، اس قلیل عرصہ میں ان کی شاعری میں حیرت انگیز انقلاب ہو گیا ہے، گو ان کا گلستان شاعری آغاز ہی سے اپنے پر بہار مستقبل کا پتہ دیتا تھا، تاہم آج سے دس برس پہلے اور اب کے کلام میں زمین و آسمان کا فرق نظر آتا ہے پہلے ایک کلی تھی، اب گل خنداں ہے، پہلے ایک جوئے مستانہ خرام تھا، اب پُر شور طوفان ہے، پہلے بے خودی میں احساس بھی شامل تھا، اب ہمہ تن بے خودی اور بے خبری ہے، غرض یہ شراب پرانی ہو کر خالص جوہر بن گئی ہے جس کا ایک ایک قطرہ دو سکر لذت آشناؤں کو بھی سرشار بنا دیتا ہے۔

اُن کا پہلا دیوان ہمارے شہر کے مشہور شاعر اور سخن فہم مرزا احسان احمد صاحب بی اے، ایل ایل بی علیگ نے آج سے دس بارہ برس پہلے بزم ادب کی جانب سے شائع کیا تھا، اب حال میں دوسرا دیوان مطبع مسلم یونیورسٹی علی گڑھ سے چھپ کر شائع ہوا ہے، گو یہ دیوان بہ شمول "تعارف" چھوٹی تقطیع پر ۱۲۰ صفحات سے زیادہ نہیں ہے، لیکن بہ قول ایک مرحوم ادرنامور ادیب کے کہ "لوح سے تحت تک، بہ مشکل سو صفحے ہیں، لیکن کیا ہے جو یہاں حاضر نہیں، کون سا نغمہ ہے جو اس ساز زندگی کے تاروں میں

تاروں میں بیدار یا خوابیدہ موجود نہیں ہے۔" میں آئندہ سطور میں اسی ساز زندگی پر مضراب لگانا چاہتا ہوں۔

اس مختصر دیوان کے آغاز میں استاذی مولانا سید سلیمان ندوی کا لکھا ہوا دس صفحات کا "تعارف" ہے جو بجائے خود ایک نظم منثور اور جس کا لفظ لفظ شعر ہے جیسا کہ "تعارف" کے لفظ سے ظاہر ہے، اس میں شاعری کی حقیقت و ماہیت یا جگر کی شاعری پر فنی حیثیت سے کوئی نقد و تبصرہ نہیں ہے، بلکہ محض حضرت جگر کی ذات کا تعارف اور ان کی شاعری پر شاعرانہ انداز میں اظہار خیال کیا گیا ہے، اس تعارف میں شاعر کی زبان میں حقیقت کی ترجمانی نے عجب کیف پیدا کر دیا ہے، قطع نظر لطف بیان کے اس سے جگر کی شاعری کی حقیقت پر بھی روشنی پڑتی ہے، اس لیے اس کے بعض ٹکڑے اس موقع پر نقل کیے جاتے ہیں، جگر کی شاعری پر تبصرہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں:-

"جگر کی شاعری میں زلف و شانہ ہے، نہ سرمہ و آئینہ، نہ ہوس بالائے بام نہ شکایت منظر عام، نہ اُس کے کاشانۂ خیال میں چھینٹے بسمل کی آئینہ بندی ہے، نہ اُس کے محبوب کے ہاتھوں میں قصاب کی چھری اور جلاد کی تلوار ہے، نہ اس کے کوچہ میں شہدا کے دل و جگر کی گلکاری ہے، وہ مست ہے اور اسی مستی میں کسی نادیدہ کا سراپا مشتاق نظر ہے، وہ اس کے حجابات کو اپنے رعشہ دار ہاتھوں سے بار بار اٹھا دینا چاہتا ہے، مگر نہیں اُٹھا سکتا، وہ جھانک کر دیکھنا چاہتا ہے

مگر نہیں دیکھ سکتا، اس کی تمنا کی آنکھیں اس کو کبھی بے حجاب
دکھا دیتی ہیں، تو وہ ہاتھ بڑھا کر چھونا چاہتا ہے مگر وہ تصویر
نگاہوں کے سامنے سے غائب ہو جاتی ہے۔

جگر مست ازل ہے، اس کا دل سرشار الست ہے، وہ محبت کا
متوالا ہے، اور عشق حقیقی کا جویا، وہ مجاز کی راہ سے حقیقت کی
منزل تک، اور بت خانہ کی گلی سے کعبہ کی شاہراہ کو، اور خمخانے
بادہ کیف سے بیخود و فراموش ہو کر بزم ساقی کوثر تک پہنچنا چاہتا ہے،
جگر بظاہر سرشار مگر درحقیقت بیدار ہے، اس کی آنکھیں
پُر خمار، مگر اس کا دل ہشیار ہے، اور کیا عجب کہ خود جگر کو بھی اپنے دل
کی خبر نہ ہو، اگر ایسا نہ ہو تو اس کے کلام میں یہ اثر نہ ہو"
مذکورہ بالا سطور جگر کی شاعری کی حقیقت کا خلاصہ اور عطر ہیں جن سے
اس کی شاعری کی تمام ناقابل بیان کیفیتوں اور نازک اداؤں کو الفاظ
میں دکھا دیا گیا ہے۔

اس مختصر تعارف کے بعد اصل دیوان شروع ہوتا ہے جو ۱۱۰ صفحات
پر مشتمل ہے، اس میں ننانوے صفحات میں اُردو کی غزلیں اور کچھ متفرق اشعار ہیں
اُردو کی غزلوں کے بعد "خمستان فارس" کے عنوان سے بادۂ شیراز کے
مصفا جام یعنی فارسی کا کلام ہے، سب سے آخر میں چھ صفحوں میں "نظمیات"
کے ماتحت تین مسلسل نظمیں "غم انتظار"، "نرگسِ مستانہ" اور "یادِ ایام" ہیں آئندہ
سطور میں اسی مختصر مجموعہ کے متعلق اظہار خیال کرنا ہے۔

جگر کی شاعری کی خصوصیات جگر کے کلام میں ظاہری اور معنوی حیثیت سے چند ایسی خصوصیات ہیں جو اس کو دوسرے شعرا کے کلام سے ممتاز بناتی ہیں، اس کی ظاہری خصوصیات میں سب سے پہلے جس چیز پر نظر پڑتی ہے وہ اس کی سادگی اور سلاست ہے، جگر ہمیشہ نہایت سہل اور سادہ الفاظ، آسان اور دل نشین ترکیبیں استعمال کرتا ہے، غزل کی غزل پڑھ جاؤ، کسی شعر میں کوئی ثقیل، نامانوس اور مشکل لفظ نہ ملے گا، لیکن اس کے باوجود کمال قدرت یہ ہے کہ شعر کی گرمی، زور بیان اور بلاغت میں کوئی کمی نظر نہیں آتی، جگر کا ادب شناس ذوق اس نکتہ سے اچھی طرح واقف ہے کہ نظم و نثر کی بلاغت اور دل نشینی کا راز الفاظ کے ثقل اور شکوہ سے زیادہ، ان کے دروبست اور ترکیب کے توازن میں پنہاں ہے، اسی لئے وہ انھیں شیریں اور سادہ الفاظ اور سہل و آسان ترکیبوں سے باغ کی بہار، جوئبار کی مستانہ خرامی، نسیم سحر کی اٹکھیلیاں، اور تبسم کی موج کی بھی مصوری کرتا ہے، اور انھیں سے بادل کی گرج، طوفان کے شور اور آندھی کے جھکڑ کے ہولناک مناظر بھی دکھاتا ہے۔ لطیف جذبات اور سادہ خیالات کی مثالیں ملاحظہ ہوں،

حسن بن کر حجاب نے مارا — ایک رنگیں نقاب نے مارا

کہہ چکا ہیں فسانۂ غم کیا — موت کی نیند چھائی جاتی ہے

فروغ بادہ ترے حسن کا جواب ہوا

سنبھالنا مجھے ساقی کہ بے نقاب ہوا

لہو کی ہر ایک بوند دل بن گئی ہے　　خوشا لذتِ کامیابِ محبت

ان لبوں کی جاں نوازی دیکھنا　　منھ سے بول اُٹھنے کو ہے جامِ شراب

اوپر کے اشعار لطیف اور سادہ جذبات کی مثالیں ہیں اور کسی میں کوئی ثقیل لفظ اور پُر پیچ ترکیب نہیں ہے لیکن اس سادگی کے باوجود شعر کی دل آویزی اور بلاغت میں کوئی کمی نہیں نظر آتی۔

بعینہ انھیں سادہ الفاظ اور آسان ترکیبوں سے وہ تیز سے تیز اور تند سے تند جذبات اور خیالات کا نقشہ کھینچتے ہیں اور سادگی کے باوجود جوشِ بیان اور سرمستی میں کوئی کمی نہیں پیدا ہوتی۔

جدھر کو مستیٔ دریا نے رُخ کیا اپنا
تڑپ کے موج اُٹھی، جھوم کر حباب اُٹھا

بجلیاں طورِ تصوّر پہ گرانے والے
پھونک دے پھونک دے ہستی کے سیہ خانے کو

یک بیک سامنے آیا نہ کر دے پردہ
لے کے اُڑ جائے نہ یہ عالمِ امکاں کوئی

مری ہستی کا ہر ذرہ اُڑا جاتا ہے منزل سے
مرا منھ دیکھتے ہیں جذبِ منزل دیکھنے والے

اس جانِ میکدہ کی قسم بارہا جگر　　کل عالمِ بسیط پہ میں چھا کے پی گیا

جو دل سے اُٹھتے ہیں شعلے وہ رنگ بن بن کر
تمام منظرِ فطرت پہ چھائے جاتے ہیں،

ان اشعار میں پُر شکوہ الفاظ سے احتراز کے باوجود ہر شعر تندی جذبات کی پوری مصوری کر رہا ہے۔

الفاظ کا انتخاب اور اُس کی نشست

شعر کی تاثیر کے لیے سب سے مقدم شرط الفاظ کا مناسب انتخاب اور اُن کا صحیح استعمال ہے، سامعہ کا سب سے پہلا اثر الفاظ کی شیرینی اور اس کے ترنم کا پڑتا ہے، معنی پر بعد میں نظر جاتی ہے معنوی حیثیت سے شعر کا مفہوم کتنا ہی بلند کیوں نہ ہو، لیکن اگر الفاظ شیریں اور ترکیب پُر ترنم نہیں ہے تو شعر بالکل پست ہو جائے گا اور سُننے والے پر اس کا کوئی خاص اثر نہ پڑے گا، اس کے برعکس سادہ سے سادہ تخیل کو الفاظ سحر کاری کہیں سے کہیں پہونچا دیتی ہے، جگر کو الفاظ کے مناسب انتخاب اور اس کی نشست کا خاص سلیقہ ہے، وہ اگرچہ الفاظ نہایت سادہ استعمال کرتے ہیں، لیکن ان کی شیرینی اور ترکیب کی خوبی شعر کو کہیں سے کہیں پہونچا دیتی ہے

کیفِ شباب و سرخوشی بادۂ حیات
کیا دور تھا تری نگہِ مستِ ناز کا

ان لبوں کی جاں نوازی دیکھنا
مُنھ سے بول اُٹھے کوئی جامِ شراب

دوڑا کے حُسنِ یار کی ہلکی سی اک لہر
کانٹوں کو میں نے رشکِ گلستاں بنا دیا

دیدۂ شوق سے ہوئیں آج وہ گل فشانیاں
ڈوب گئی بہار میں سادگیِ لباسِ حُسن

فریب خوردۂ رنگینیٔ ادا ہوں میں
نظر کی چند شعاعوں میں گھر گیا ہوں میں

بعض بعض اشعار میں وہ صرف ایک لفظ سے عجیب کیفیت پیدا کر دیتے ہیں، اس موقع پر "خاص" کے لفظ کے استعمال کی چند مثالیں پیش کی جاتی ہیں، کہ انھوں نے اس کو کس کس خوبی سے استعمال کیا ہے اور اس سے کیسے کیسے لطیف معنی پیدا کیے ہیں، کسی قدیم شاعر نے کہا ہے ع

غمزۂ خاص بہر گبر و مسلماں دارد

اس "غمزۂ خاص" کی تشریح ناممکن ہے، اب جگر کا "خاص" ملاحظہ ہو۔

اسے حال و قال سے واسطہ نہ غرض مقام و قیام سے
جسے کوئی "نسبت خاص" ہو ترے حسن برق خرام سے

وہ نگاہِ خاص "سے چھلکا رہا ہے۔ مے کوئی
وہ پاکباز نہیں اب جو پاکباز رہے

نہیں معلوم وہ کس طرح کے انساں ہوں گے
جن پہ تیرے "ستم خاص" کے احساں ہوں گے

مذکورۂ بالا اشعار میں "نسبت خاص" "نگاہِ خاص" اور "ستم خاص" نے اشعار میں کتنے بلند اور کیسے وسیع اور گہرے معنی پیدا کر دیے ہیں، یا مثلاً

معراج شوق کہیے یا حاصل تصور
جس سمت دیکھتا ہوں تو "مسکرا رہا ہے"

"مسکرانے کے بجائے یہاں اور بہت سے معراج شوق کے

نتائج دکھائے جا سکتے ہیں، لیکن مسکرانے کے خاص لفظ نے شعر میں جو بات پیدا کی ہے وہ کسی دوسرے نتیجے سے نہیں پیدا ہو سکتی تھی۔

سلاست و روانی نظم کی ایک ممتاز خوبی یہ ہے کہ خیالات کی نزاکتوں اور ادا کی دقتوں کے باوجود سلاست و روانی میں کوئی فرق نہ آنے پائے اور کسی جگہ زبان کو ٹھوکر نہ لگے۔ نظم کی سلاست و روانی کا نہائی کمال یہ ہے کہ اس کو نثر کرنے کے بعد بھی اس کی ترکیب میں فرق نہ آئے، یعنی اگر اسے نثر بنایا جائے تو کسی لفظ اور کسی جملہ کو اس کی جگہ سے ہٹانے کی ضرورت نہ پیش آئے۔ مرزا غالب کا یہ کمال سمجھا جاتا تھا کہ اپنی ژولیدگی بیان کے باوجود انھوں نے بعض بعض غزلیں ایسی کہی ہیں جو سلاست و روانی کا مکمل نمونہ ہیں، مثلاً

موت کا ایک دن معین ہے — نیند کیوں رات بھر نہیں آتی
سبزہ کو جب کہیں جگہ نہ ملی — بن گیا روئے آب پر کائی

رہیے اب ایسی جگہ چل کر جہاں کوئی نہ ہو
ہمنوا کوئی نہ ہو اور ہم زباں کوئی نہ ہو

یوں تو جگر کا پورا کلام سلاست و روانی کا مجموعہ ہے، لیکن چھوٹی بحر کی متعدد غزلیں سلاست بیان کا نہایت اعلیٰ نمونہ ہیں، غزل کی غزل پڑھ جاؤ، شربت کے گھونٹ کی طرح حلق کے نیچے اُترتی چلی جائے گی اور کہیں پر زبان کو رکنے کی ضرورت نہ پیش آئے گی، بعض بعض غزلیں تو ایسی ہیں کہ اگر پوری غزل کو نثر بنانا چاہیں تو ایک لفظ کی تقدیم و تاخیر کی

ضرورت نہ پیش آئے گی، یہاں مختلف غزلوں کے دو دو شعر نمونۃً نقل کئے جاتے ہیں:۔

عشق کو بے نقاب ہونا تھا　　آپ اپنا جواب ہونا تھا
تیری آنکھوں کا کچھ قصور نہیں　　ہاں مجھی کو خراب ہونا تھا

چھپتے ہیں اور چھپا نہیں جاتا　　اس ادائے حجاب نے مارا
ہم نہ مرتے ترے تغافل سے　　پرسشِ بے حساب نے مارا

جذبۂ شوق کامیاب ہوا　　آج مجھ سے انھیں حجاب ہوا
دل کی ہر چیز جگمگا اٹھی　　آج شاید وہ بے نقاب ہوا

ستمِ یار کی دہائی ہے　　نگہِ التفات نے مارا
موت کیا ایک لفظِ بے معنی　　جس کو مارا حیات نے مارا

جز ترے کچھ نظر نہیں آتا　　آرزو بن گئی مجسّم کیا
موت کی نیند چھائی جاتی ہے　　کہہ چکا میں فسانۂ غم کیا

لہو کی ہر اک بوند دل بن گئی ہے　　خوشا لذتِ کامیابِ محبت
کوئی نقشِ صورت نہ قائم رہے گا　　ٹھہرنے جو دے اضطرابِ محبت

لطفِ زبان شاعری کے اس دورِ انقلاب میں بھی شعراء کا ایک طبقہ ایسا ہے جو ابھی تک خیالات کی بلندی، جذبات کی پاکیزگی اور اسلوب بیان کی ندرت کے مقابلہ میں شاعری میں "زبان" کی چاشنی ڈھونڈھتا ہے، اور جو شعر اس ٹکسال کا ڈھلا نہیں ہوتا وہ خواہ اپنی دوسری خوبیوں کے لحاظ سے کتنا ہی بلند اور پاکیزہ کیوں نہ ہو کھوٹا شمار کیا جاتا ہے۔ اس میں

شبہ نہیں کہ ہر کلام کی خوبی کے لئے خواہ وہ نظم ہو یا نثر، زبان کی صحت اور سلاست، نہایت ضروری شرط ہے، لیکن زبان کی صحت اور سلاست الگ شے ہے اور لطف زبان اور شے، لطف زبان سے مراد وہ مخصوص اور ٹکسالی محاورے ہیں جو اُردو کے مرکز دلی کی گلیوں میں بولے جاتے ہیں، میرے نزدیک زبان کی خوبی کے لئے صرف اس قدر کافی ہے کہ اس میں کوئی صرفی نحوی خامی نہ ہو محاورے کے خلاف نہ ہو، انداز بیان میں فصاحت اور دلکشی ہو، اگر کلام اس معیار پر ٹھیک اُترتا ہے تو پھر اس کی خوبی کے لئے اور کسی عنصر کی ضرورت نہیں، اس معیار کے مطابق جگرؔ کے کلام کی خوبی میں گفتگو کا کوئی محل ہی نہیں ہے، اس کا ہر شعر نہ صرف صحت زبان بلکہ فصاحت و بلاغت کا بھی نمونہ ہے، لیکن شاعری میں زبان کی چاشنی ڈھونڈھنے والوں کے لطف کا بھی پورا سامان موجود ہے۔

چشم پُرنم، زلف آشفتہ، نگاہیں بے قرار
اس پشیمانی کے صدقے میں پشیمانی ہو گیا

زاہد یہ میری شوخیِ رندانہ دیکھنا
رحمت کو باتوں باتوں میں بہلا کے پی گیا

لاکھ جانیں ہوں تو میں اُن پہ تصدق کر دوں
وہ یہ فرمائیں زباں سے اسے برباد کیا

فراق و وصل کے صدقے مگر مرے مالک
فراق و وصل میں کوئی تو امتیاز رہے

اکثر بھیج دے ایسے میں اس جانِ تمنا کو
سکوتِ شب کا سناٹا ہے اور دل کی کہانی ہے

لیئے پھرتا ہوں اک تصویرِ حسرت اپنے سینہ میں
خدا بخشے دلِ مرحوم کی زندہ نشانی ہے

نیتِ شب بہ خیر اے ساقی   بزم جم کیا ہے ساغر جم کیا

فارسی ترکیبیں

اس میں شبہ نہیں کہ نظم ہو یا نثر اس کی خوبی الفاظ کی سادگی اور ترکیبوں کی سہولت میں ہے، لیکن اسی کے ساتھ اس سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ شعر کا لطف فارسی کے شیریں الفاظ اور دل نشیں ترکیبوں سے کہیں دوبالا ہو جاتا ہے، اور یہ وہ مرصع کاری ہے جس سے زیور شاعری جگمگا اٹھتا ہے، زبان کی سادگی اور فارسی الفاظ اور ترکیبوں میں کوئی تضاد نہیں ہے جیسا کہ بظاہر نظر آتا ہے، تضاد تو اُن بدمذاقوں نے پیدا کر دیا ہے، جنھیں اُردو میں فارسی الفاظ اور ترکیبوں کے کھپانے کا سلیقہ نہیں ہے اور وہ فارسی کے ہر قسم کے الفاظ خواہ وہ اُردو کے آہنگ سے جوڑ کھاتے ہوں یا نہ کھاتے ہوں عبارت میں ٹھونس دیتے ہیں، ورنہ اگر دونوں کے ترنم اور آہنگ کا خیال رکھتے ہوئے فارسی کے شیریں الفاظ اور دل نشین ترکیبیں اُردو میں کھپائی جائیں تو اُردو نثر و نظم کہیں سے کہیں پہونچ جاتی ہیں، حضرت جگر نے حتے الامکان فارسی ترکیبوں سے احتراز کیا ہے لیکن ان کا کلام اس کی لطیف آمیزش سے بالکل خالی نہیں ہے، لیکن جن جن موقعوں پر انھوں نے فارسی سے کام لیا ہے اپنی خوش مذاقی سے اسے اُردو میں ایسا کھپا دیا ہے کہ فارسی

اور اُردو کی متناسب آمیزش سے عجب خوش منظر گنگا جمنی رنگ پیدا ہوگیا ہے، ذیل کی مثالیں اس کی شاہد ہیں :-

بندگیِ جنوں ادا، ہے خودیِ ادب سرشت
حُسن کی اصطلاح میں عشق اسی کا نام ہے

شیشہ مست بادہ مست، حسن مست و عشق مست
آج پینے کا مزہ پی کر بہک جانے میں ہے

دستِ رنگین و جمالِ بے حجاب
اے خوش آں وقتے و خوش جام شراب

ہاں نگاہِ شوق وہ اُٹھی نقاب
آفتاب آمد دلیلِ آفتاب

نہ دیکھو مجھے صرف اتنا تو کہہ دو
ہلاکِ تماشا، خرابِ محبت

تیری نگاہِ ناز بایں شانِ اضطراب
ہم جانِ دردِ عشق ہم ایمانِ اضطراب

حرم و دیر نظر آتے ہیں سر بسجدہ
جلوہ گر کون مرے شوقِ جبیں ساز میں ہے

لٹادے دولتِ کونین اور سب کچھ لیئے
بس اک تبسمِ عاجز نواز رہنے دے

ان اشعار میں نہ صرف فارسی کی ترکیبیں ہیں بلکہ بعض بعض پورے پورے مصرعے فارسی کے ہیں، لیکن اس حسنِ مذاق کے ساتھ کھپائے گئے ہیں کہ شعر کے ترنم میں کوئی فرق نہیں آیا ہے بلکہ اُردو اور فارسی کے زیر و بم نے

مل کر ایک ہم آہنگ نغمہ پیدا کر دیا ہے۔

جگر کی معنوی خصوصیات

اوپر جو کچھ لکھا گیا وہ جگر کی شاعری کے ظاہری خط و خال کے متعلق تھا، گو اس میں بھی وہ اپنے اکثر معاصروں سے ممتاز ہے، لیکن یہ اس کا کوئی مخصوص اور انفرادی وصف نہیں ہے، بلکہ اس کے بعض دوسرے خوش مذاق ہمعصر بھی اس وصف میں اس کے شریک ہیں، جگر کی شاعرانہ انفرادیت اس کی شاعری کی معنوی خصوصیات میں نظر آتی ہے۔

اس کی معنوی خصوصیات میں جو خصوصیت سب سے زیادہ نمایاں نظر آتی ہے وہ خیالات کی وحدت و یکسانی کے ساتھ انداز بیان کا تنوع اور طریق ادا کی نیرنگی ہے، حافظ شیراز کی طرح جگر کے خیالات بھی محدود اور بندھے ہوئے ہیں، انھیں کو وہ مختلف پیرایوں میں ادا کرتا ہے اور اس طرح ادا کرتا ہے کہ بیان کی نیرنگی سے ایک عالم نظر آتا ہے، شراب ایک ہی ہوتی ہے، لیکن مختلف ساغروں میں بٹ کر جدا جدا کیفیت و اثر دکھاتی ہے، ساز ایک ہی ہوتا ہے لیکن اس کا ہر نغمہ اپنی تاثیر اور ترنم کے اعتبار سے ایک دوسرے سے بالکل مختلف سنائی دیتا ہے، دوسری خصوصیت اس کے جذبات کی لطافت اور پاکیزگی اور خیالات کی فلک پیما بلندی اور وسعت ہے، غزل کے مضامین محدود ہیں یعنی وہی حسن و عشق کی واردات اور کیفیات اور اس کے لوازم و نتائج کی مصوری، اسی لئے تغزل کی زمین میں مشکل ہی سے کوئی اچھوتا مضمون نکل سکتا ہے، لیکن یہ جگر کے خیالات کی وسعت اور بلندی ہے کہ اس پامال زمین میں بھی نئے نئے گل بوٹے کھلاتا ہے، اور پرانے پھولوں کو

بھی اس طرح سجا کر پیش کرتا ہے کہ ہر گلدستہ اپنے رنگ و بو کے اعتبار سے نیا نظر آتا ہے۔

تیسری خصوصیت اس کا جوش، اس کی سرمستی اور بے خودی اور خود فراموشی ہے، وہ جو کچھ کہتا ہے عالم بے خودی میں کہتا ہے اور کہتے کہتے خود اس میں گم ہو جاتا ہے، اسی کا یہ اثر ہے کہ اس کا ہر شعر سننے والوں کو بھی مست و بے خود بنا دیتا ہے۔

جگر کے خیالات کی بلندی اور وسعت

خیالات اور جذبات کے اعتبار سے جگر کی شاعری کی دو قسمیں ہیں، ایک مادی دوسری روحانی، جگر جب تک انسانی پیکر میں عالم آب و گل کی باتیں کرتا ہے تو وہ اپنے خیالات میں کسی نہ کسی حد تک عام شعراء کا ساتھ دیتا ہے، لیکن جہاں سے روحانی سرحد شروع ہوتی ہے وہاں سے وہ عالم ناسوت چھوڑ کر عالم لاہوت میں پرواز کر جاتا ہے اور روح القدس سے ہم کلام ہوتا ہے، اس کی شاعری کا یہ حصہ اتنا نازک لطیف اور اس کی کیفیتیں تمام محسوسات سے اتنی ماوراء ہیں کہ ان کو نقد و تبصرہ کی قید میں لانا بہت مشکل ہے، اس لئے پہلے اس حصہ پر تبصرہ کیا جاتا ہے جس پر مجاز کا ہلکا رنگ جھلکتا ہے تاکہ ناظرین جمال حقیقت کے مشاہدہ کے لئے تیار ہو سکیں۔

حسن و عشق کی بنیاد تمام تر دل پر ہے، خواہ وہ عشق حقیقی ہو یا مجازی عشق کی آگ اسی چقماق سے پیدا ہوتی ہے، دونوں میں فرق اس قدر ہے کہ عشق حقیقی میں دل کی کیفیتیں زیادہ لطیف اور پاکیزہ ہو جاتی ہیں، اور

ہوا و ہوس کے تمام خس و خاشاک جل کر خاکستر ہو جاتے ہیں، لیکن دل کا تعلق بہر حال قائم رہتا ہے، لیکن جگر کا عشق اس سے بھی بلند تر و پاکیزہ تر ہے، چونکہ اس کا مطلوب عالمِ مادی سے ماوراء اور مجسم لطافت ہے، اس لئے اس کے یہاں دل کا مادی واسطہ بھی درمیان میں باقی نہیں رہتا۔

حیراں ہوں کہ یہ آخر کیوں بیچ میں حائل تھا
میرا ترا رشتہ تو بے واسطۂ دل تھا

اس سے بھی ایک قدم اور آگے بڑھتا ہے اور درمیان میں اپنی ہستی کا پردہ بھی گوارا نہیں کرتا۔

تمام اٹھ گئے پردے تو اس سے کیا حاصل
مزہ تو جب تھا کہ میں بھی نہ درمیاں ہوتا

وصل و ہجر عاشقی کی ضروری واردات ہیں لیکن جگر کے ہجر و وصل کی صورت عالمِ مادی کے وصل و ہجر سے بالکل مختلف ہے۔

وہ ہجر کے پردے میں جس وقت کہ واصل تھا
اس درجہ لطافت تھی، احساس بھی مشکل تھا

ہجر بلائے جان نہیں بلکہ راز و نیاز کا "خاص وقت" ہے۔

تنہائیِ فراق میں کیوں گریہ کیجئے
اے دل یہ وقت خاص ہے راز و نیاز کا

وصالِ دوست کی حس، عشق کے نقص اور ناتمامی کی دلیل ہے۔

خلوتیانِ راز کا خاص یہ اک پیام ہے
حسنِ وصالِ دوست بھی منزلِ ناتمام ہے

"خلوتیانِ راز" کے اس "خاص" پیام کا لطف خلوتیانِ راز ہی اُٹھا سکتے ہیں۔

نگاہ کے تحیر اور رگِ جاں کے تواجد سے نظر مشاہدۂ جمال اور دل اس کے احساس سے محروم ہے۔

نہیں آپے میں کوئی کس کو ہو احساسِ نظارہ
تحیر ہے نگاہوں کو، تواجد ہے رگِ جاں کو

شادؔ عظیم آبادی نے اس تخیل کو اس سے زیادہ پاکیزہ ادا کیا ہے۔

کبھی ایک عدہ وصال کا جو وفا ہوا بھی تو کیا ہوا
مجھے حیف اپنی نظر پہ ہے اُنھیں اپنے جلوہ پہ ناز ہے

لیکن جگرؔ کو اس تحیر کا کوئی غم نہیں بلکہ یہ اس کی عین آرزو ہے اور اس کا سبب یہ ہے۔

بھلا ہوا کہ نظر حیرتوں میں ڈوب گئی،
کہاں کہاں نہ ترا حُسن رائگاں ہوتا

مشاہدۂ جمال کی آخری حد یہ ہے کہ دیکھنے والا سراپا نظر بن کر جلووں میں گم ہو جائے۔

ترے جلووں میں گم ہو کر خودی سے بے خبر ہو کر
تمنا ہے کہ رہ جاؤں میں سرتا پا نظر ہو کر

جمال کی لطافت مانع نظارہ سہی لیکن دل کا ربط نہانی خود
قربت کا پتہ دیدیتا ہے

لطافت مانعِ نظارۂ صورت سہی لیکن
دھڑکنا دل کا کہتا ہے وہ گزرے ہیں ادھر ہوکر

سالکِ راہ حقیقت کی آخری منزل پر پہونچ کر خود گم ہوجاتا ہے۔

مجھے تلاش کرے بےخودیِ شوقِ سجود
پہونچ کے منزلِ مقصد پہ کھو گیا ہوں میں

اس منزل پر پہونچنے کے بعد سالکِ راہ حقیقت پر سے ظاہری
آداب و رسوم اٹھ جاتے ہیں۔

اسے حال و قال سے واسطہ نہ غرض مقام و قیام سے
جسے کوئی نسبت خاص ہو ترے حسن برق خرام سے

اس لئے کہ نسبت خاص کے بعد پھر حال و قال اور مقام و قیام کی ضرورت
ہی کیا باقی رہ جاتی ہے، آشنائے راز ہونے کے لئے دوری چاہیئے۔

کھلا یہ راز تری جلوہ گاہ قربت میں
جو تجھ سے دور رہے آشنائے راز رہے

گو حسن حقیقت مستور رہے لیکن عشق حقیقی کی تسلی کا سلسلہ
برابر جاری ہے۔

مجھے دے رہے ہیں تسلیاں وہ ہر ایک تازہ پیام سے
کبھی آ کے منظر عام پر کبھی ہٹ کے منظر عام سے

شکستِ ساز کا نغمہ ساز کے نغمے سے زیادہ پُر لطف ہوتا ہے۔

دل مرا توڑ کر کہا اُس نے زبانِ راز میں
ساز میں نغمہ وہ کہاں جو ہے شکستِ ساز میں

"زبانِ راز" کے ٹکڑے نے اس شعر میں ایک خاص خوبی پیدا کر دی ہے۔
اکبر اور اقبال نے اس مفہوم کو اس سے زیادہ صاف اور واضح ادا کیا ہے، اکبر نے کہا ہے۔

دل شکستہ میں رہتا ہے بادۂ عرفاں
سُنا ہے میں نے کہ شیشہ یہ چور رہی اچھا

اقبال کہتا ہے۔

تو بچا بچا کے نہ رکھ اسے ترا آئینہ ہے وہ آئینہ
جو شکستہ ہو تو عزیز تر ہے نگاہ آئینہ ساز میں

گو واقعہ کے اعتبار سے اکبر و اقبال کے اشعار حقیقت سے زیادہ قریب ہیں، لیکن جگر کے انداز بیان میں شعریت زیادہ ہے، اس لئے کہ اس میں خود ساز کا بنانے والا، شکستِ ساز کے رمز کو "زبانِ راز" میں بتا رہا ہے۔
انجامِ محبت کی محویت میں قربت اور دوری کا امتیاز باقی نہیں رہتا۔

انجامِ محبت کی اللہ رے محویت
یہ بھی نہیں کھلتا ہے قربت ہے کہ ہے دوری

سجدہ اور جبیں سائی میں جبین و سجدہ کا امتیاز باقی رہنا، جبین و سجدہ کی توہین ہے۔

جبین و سجدہ کی توہین ہے جبیں سائی،
جبین و سجدہ میں کچھ بھی جو امتیاز رہے
یہی سجدہ خلاصہ عبادت ہے۔

یہ بے خودی اس سے بھی آگے بڑھ کر عبادت کے سدرۃ المنتہیٰ تک پہونچتی ہے، جہاں جبین و آستان میں بھی امتیاز باقی نہیں رہتا۔

میں کس کے سامنے اب اپنی جبیں جھکاؤں
میری جبیں نہیں ہے تیرا ہی آستاں ہے

یہی وہ مقام ہے جہاں طالب و مطلوب میں گم ہو کر اپنی شخصیت فنا کر دیتا ہے اور عالم وارفتگی میں وہ مطلوب کی زبان بن کر بولنے لگتا ہے۔

اسرار حقیقت | اوپر جو اشعار نقل کئے گئے، وہ اگرچہ اپنے خیالات کی بلندی و وسعت کے لحاظ سے جگر کے مقام عشق کا پتہ دیتے ہیں، لیکن اس اصول کے ماتحت

ہر چند ہو مشاہدۂ حق کی گفتگو
بنتی نہیں ہے بادہ و ساغر کہے بغیر

ان میں ہلکا سا حجاب مجاز نظر آتا ہے اور جگر خود اس حجاب کو اٹھانا نہیں چاہتا ہے کیونکہ یہ حسنِ حقیقت کے احترام کے منافی ہے چنانچہ کہتا ہے۔

رواں اگرچہ ہیں اس میں بھی سب وہی موجیں
مگر ہے قطرہ پہ فرض احترام دریا کا

لیکن اتحاد معنی خود زبان بن کر بول اٹھتا ہے۔

ہر ایک قطرہ انا البحر کہہ اُٹھے گا ضرور
یہی جو رنگ رہا اتحادِ معنی کا ؛

اس کے عشق کی ابتدا روزِ ازل ہی سے ہوتی ہے۔

ربطِ باطن اس کو کہتے ہیں کہ روزِ اوّلیں
روح مضطر ہی رہی پیدا نہ جب تک دل ہوا

اُٹھتے تھے ادھر پردے پیہم رُخِ فطرت سے
میں محوِ تماشائے صورت گریِ دل تھا

روزِ ازل سے اس بارِ امانت کو اُٹھا تو لیا، لیکن انجام سے غافل تھا۔

کونین کا غم دل نے سب لے لیا اپنے سر
آغاز کا دیوانہ انجام سے غافل تھا،

وحملها الانسان انه کان ظلوما جهولا، لیکن

خراب ہو کے بھی دل کب جہاں خراب ہوا
اک آفتاب کا سایہ تھا آفتاب ہوا

پھر یہی "دلِ خراب" اور "سایۂ آفتاب" ذاتِ حق میں فنا ہو کر دائرۂ مجاز کا مرکز بن گیا۔

ہو کے فنائے ذاتِ حق دل مرا سوز و ساز میں
مرکزِ اصل بن گیا دائرۂ مجاز میں ؛

اور اس وقت اس کا یہ کہنا بالکل بجا و درست ہے کہ:-

حرم و دیر نظر آتے ہیں سب بسجود   جلوہ گر کون مرے شوقِ جبیں ساز میں ہے

اور یہ دعوے بھی اس پر زیب دیتا ہے۔

آجائے اگر ضد پہ اپنی کوئی دیوانہ
خود گر دپھر کر آ کر کعبہ ہو کہ بُت خانہ

اب اس راہ سلوک کے کچھ قوانین و ضوابط اور احوال و کوائف ملاحظہ ہوں، چونکہ یہ عالم اس عالم مادی سے جدا ہے اس لئے اس کے قوانین و ضوابط بھی اس سے جدا ہیں، اس عالم مادی میں نظارہ مشاہدہ جمال کا وسیلہ ہے، لیکن جمال حقیقت کے مشاہدہ کے لیئے یہی وسیلہ حجاب بن جاتا ہے۔

تو سامنے ہے پھر بھی بتلا کہ تو کہاں ہے
کس طرح تجھ کو دیکھوں نظارہ درمیاں ہے

اس مسئلہ پر معتزلہ اور اشاعرہ کی پرانی بحث چلی آتی ہے کہ قیامت میں ان آنکھوں سے دیدار الٰہی ممکن ہے یا نہیں۔
پردۂ مجاز کے بغیر مظہر جمال حقیقت کا مشاہدہ ان مادی آنکھوں سے ناممکن ہے۔

شمع جب فانوس میں تھی آنکھ تھی محو جمال
جب ہوئی عریاں نگاہوں کو پریشاں کر دیا

جب آئے محفل وحدت سے بزم کثرت میں
نظر کا بن گئے دھوکا نظر کی صورت میں

اسی لیے حسن حقیقت ہمیشہ پردۂ مجاز میں نظر آتا ہے۔

کچھ اس طرح وہ پسِ پردۂ مجاز رہے

حجابِ ساز میں جیسے نوائے ساز رہے

اسی تشابہ کی بنا پر سالک کو ہر ہر قدم پر دھوکا ہوتا ہے۔

دھوکا تھا ہر قدم پر تری بزم ناز کا

کیا سخت مرحلہ تھا حریم مجاز کا ؛

اور صوفی اس تشابہ میں گرفتار ہو کر مجاز کو حقیقت سمجھنے لگتا ہے،

صوفی نے جس کو شاہدِ مطلق سمجھ لیا

ایک پرتوِ لطیف تھا حسنِ مجاز کا ؛

دل کی آنکھ یا چشمِ بصیرت تو انوارِ جمال کے گنجینہ کو سمیٹ لیتی ہے لیکن مادی آنکھوں کی محدود نظر اس کے احاطہ سے قاصر ہے، اس لئے طالبِ دیدار التجا کرتا ہے۔

دل ہے گنجینۂ انوار نگاہیں محدود ؛

کاش اس کل کا ہر اک جزو پریشاں ہو جائے

لیکن مشکل یہ ہے کہ حسن حقیقت کے قید تعین میں آنے کے بعد نظر تعینات و تشخصات میں اُلجھ کر رہ جاتی ہے، اس لئے طالب اس پردۂ تعین کو بھی ہٹانا چاہتا ہے۔

پھونک دے قید تعین کو بھی اے برقِ جمال

دل ہے آزاد نگاہیں مگر آزاد نہیں ؛

لیکن پھر اسے اپنی غلطی کا احساس ہوتا ہے کہ حسنِ حقیقت جیسی شے

تعینات و تشخصات کی قید میں آ ہی نہیں سکتی کہ سمندر کوزہ میں نہیں سما سکتا آفتاب کی روشنی مٹھی میں نہیں سمیٹی جا سکتی ہے، اس لئے کہتا ہے کہ تعینات کی قید صرف اوہام کا فریب ہے۔

حسن اور قیدِ تعین یہ خیالِ خام ہے
بے خبر یہ سب فریبِ جلوۂ اوہام ہے

اس اذعان و یقین کے بعد پھر وہ اپنی ہمت سے خطاب کرتا ہے۔

یہ سب جو حسنِ حقیقت پہ ہیں حجاب، اُٹھا
نظر کو ہے جو اُٹھانا تو کامیاب اُٹھا
یوں بڑھے پائے طلب حسنِ قدم کی جانب
ایک ہی جست میں طے عالم امکاں ہو جائے

وحدت فی الکثرت اور کثرت فی الوحدت یا وحدۃ الوجود یعنی تمام کائنات عالم ایک ہی اصل کی فرع، ایک ہی آفتاب کا پرتو اور ایک ہی تصویر کے مرقعے ہیں۔

پرتوِ حسنِ ازل کی اُف یہ نقش آرائیاں
بن گئے کتنے مرقعے ایک ہی تصویر میں
کثرت و اختلاف میں وحدت و ربط باطنی
اُف یہ کرشمہ سازیاں تیری نگاہِ ناز کی

آخری شعر مذاہب عالم کے اصولی اتحاد اور فروعی اختلافات کی مصوری بھی کرتا ہے۔

تمام کائنات صرف اسی حسن حقیقت کا سایہ ہے اور اس کی گردش کے ساتھ سایہ بھی گردش کرتا رہتا ہے۔

عالم کا تلون کیا ہستی کا تعین کیا ؟
تو خود جو خراماں ہے سایہ بھی خراماں ہے

جگر کا عام رنگ اوپر کے اشعار کا تعلق جگر کی شاعری کے منزہ عن المادہ حصہ سے تھا، جہاں ہر شخص کی نظر نہیں پہونچ سکتی، اور اس سے لطف اُٹھانے والے صرف مخصوص اہل دل ہیں۔ باقی عام لوگوں کے لیئے اس عالمِ آب و گل کی روداد عشق زیادہ پر لطف ہے۔ جگر جب اس رنگ میں کہتا ہے تو اپنے بیان کی ندرت سے اس میں بھی ایک خاص لطف اور انوکھا پن پیدا کر دیتا ہے، اس میں ایک طرف دل کی گرمی کا پورا سامان موجود ہے، اور دوسری طرف ابتذال اور سفاہت سے دامن بچا ہوا ہے، غرض اس پامال اور شاہراہ عام میں بھی اس نے اپنا راستہ الگ نکالا ہے۔

محبوب کا عتاب عاشق کے لیئے ایک جانگسل مصیبت ہے، لیکن جگر کی نگاہ دل اس میں بھی کرم کا سامان تلاش کر لیتی ہے۔

نگاہِ دل بھی یکایک اسے سمجھ نہ سکی
وہ ہر کرم جو پسِ پردۂ عتاب ہوا

غالب نے کہا تھا :۔

دوستی کا پردہ ہے بیگانگی   مُنھ چھپانا ہم سے چھوڑا چاہیے

جگر بھی کسی قدر ترمیم کے ساتھ قریب اسی مفہوم کو ادا کرتا ہے۔

جذبۂ شوق کامیاب ہوا　　آج مجھ سے انھیں حجاب ہوا

"حجاب" جذبۂ شوق کی کامیابی کا کتنا سچا اور کتنا پُرلطف ثبوت ہے۔ آشوب عشق میں دل پر کبھی اضطراب کی کیفیت طاری ہوتی ہے اور کبھی سکون ہو جاتا ہے لیکن جگر کا حرماں نصیب دل سکون سے ہمیشہ محروم رہا اس لیے کہ سکون ہوتے ہی اضطراب دل بن گیا جو اضطراب کا اصل سبب ہے گویا اضطراب نے صرف شکل بدل دی۔

ٹھہرا جہاں یہ جسم میں دل بن کے رہ گیا
دیکھے کوئی سکون مرے اضطراب کا

ناظرین نے معشوق پر تصدق اور نچھاور کی بہت سی سوغاتیں ملاحظہ کی ہوں گی، لیکن جگر کے صدقہ کی لطافت اور کیفیت ملاحظہ ہو۔

سب اُن پہ ہے تصدق وہ سامنے تو آئیں
اشکوں کی آرزوئیں آنکھوں کی التجائیں

"زبانِ شوق" عرض شوق کی بہت قدیم ترجمان ہے لیکن جگر کے بیان کی ندرت دیکھئے۔

دیکھنا بے خودیِ شوق کا اعجازِ سکوت
کہہ رہا ہوں وہ فسانہ جو مجھے یاد نہیں

اس سے بھی لطیف اور پُرکیف پیرایہ ملاحظہ ہو۔

ان کی نگاہِ لطف ہے، اور کشفِ رازِ دلبری
میری نگاہِ شوق ہے اور داستانِ عاشقی

"نگاہِ لطف" اور "کشفِ رازِ دلبری" نے شعر میں کتنا بانکپن پیدا کر دیا ہے
اس خاموش ترجمان کا مقابل دیکھیے۔

مہرباں ہم پہ رہی چشمِ سخن گو اُن کی
جب ملی آنکھ نگاہوں نے کچھ ارشاد کیا

"چشمِ سخن گو" اور "نگاہوں کے ارشاد" نے عجب لطف پیدا کر دیا ہے،
نگاہِ ناز کا یہی رمز حاصلِ عاشقی ہے، اس کے بعد پھر دنیا میں کس چیز کی
ضرورت باقی رہ جاتی ہے؟

درد بھی ساتھ چھوڑ دے روح بھی تن سے ہو جدا
دیکھ چکا ہوں میں بھی "کچھ" ان کی نگاہِ ناز میں

"کچھ" کے مجمل لفظ میں کس قدر وسیع معنی پنہاں ہیں۔
یہ بہت پامال تخیل ہے کہ ناصحوں کی ملامت حسن سے ان کی بے خبری
کا نتیجہ ہے، کسی پرانے استاد کا شعر ہے۔

دکھاؤں گا تجھے زاہد اس آفتِ جاں کو
خلل دماغ میں تیرے ہے پارسائی کا

دیکھیے جگر اپنے بیان کی ندرت سے اس پامال تخیل کو کتنا بلند
اور پاکیزہ بنا دیتے ہیں کہ اس کی صورت نہیں پہچانی جا سکتی۔

ہنسی پھر اڑنے لگی عشق کے فسانے کی
نقاب الٹ دو بدل دو فضا زمانے کی

یہ بھی ایک پامال تخیل ہے کہ حسن کی بقا عشق سے ہے، عشق کے

مٹنے سے حسن کا کوئی نام لیوا باقی نہیں رہ جاتا۔ سب سے پہلے حسرت نے اسے پاکیزہ الفاظ میں پیش کیا ہے۔

میں جو مٹتا ہوں تو مٹتا ہے ترے عشق کا نام
فیصلہ بس مری تقدیر کا آساں نہ رہا

جگر نے اس کو اور زیادہ بلند اور ستھرا بنا دیا۔

مجھے یوں نہ خاک میں تو ملا میں اگرچہ ہوں ترا نقش پا
ترے جلوہ ہی کی ہے بقا مرے شوق نام بنام سے

ایسے عالی ظرف عشاق کم نکلیں گے جن کی زبان ستم یار کے شکوہ سے آلودہ نہ ہوئی ہو، جگر کی عالی ظرفی دیکھیے کہ وہ نہ صرف شکایتِ ستم سے زبان آلودہ نہیں کرتا بلکہ "ستم خاص" کی تمنا کرتا ہے۔

نہیں معلوم وہ کس طرح کے انساں ہوں گے
جن پہ تیرے ستم خاص کے احساں ہوں گے

عرضِ تمنا رعنائی خیال کی رسوائی ہے

رعنائیٔ خیال کو رسوا نہ کیجیے
ممکن بھی ہو تو عرض تمنا نہ کیجیے

عشق کو افسانۂ بزم و انجمن بنانا عشاق کا قدیم شیوہ ہے لیکن جگر زبان پر مطلوب کا ذکر بھی لانا احترام حسن کے منافی سمجھتا ہے۔

ہاں سزا دے اے خدائے عشق اے توفیقِ غم
پھر زبانِ بے ادب پر ذکرِ یار آ ہی گیا

خدائے عشق اور توفیقِ غم سے طلب سزا نے شعر کو اور زیادہ بلند کر دیا ہے۔

عشق پر حسن کی نظر ترحم آداب عشق کے خلاف نہیں ہے بلکہ عشاق کی عین
تمنا یہی ہوتی ہے لیکن جگر کے عشق کی بلندی دیکھیے کہ وہ اس ننگ کو بھی گوارا
نہیں کرتا اور یار کی "نظر رحم" کو دیکھ کر غیرت سے التجا کرتا ہے۔

پھونک دے اے غیرتِ سوزِ محبت پھونک دے
اب سمجھتی ہیں وہ نظریں رحم کے قابل مجھے

محبت لازوال، اور جذب محبت۔

محبت ابتدا سے انتہا تک غیر فانی ہے
یہی اک نقش اول ہے، یہی اک نقش ثانی ہے

محبت اصل حقیقت ہے اس کو کیا کرتے
ہم التجا جو نہ کرتے وہ التجا کرتے

عاشقی خود اپنا اعلان ہے۔

چھپ کے رہ نہیں سکتی عاشقی وہ مستی ہے
دل سے بادل اٹھتے ہیں آنکھ سے برستی ہے

لغزش مستانہ وار کے اثرات۔

رگ رگ میں آج دوڑ گئی موج سرخوشی
قربان تیری لغزش مستانہ وار کے

گداز عشق | سوز و گداز تغزل کی روح ہے۔ اسی سے تغزل کے جسم میں جان پڑتی
ہے، گداز عشق سے خالی تغزل ایک شراب بے کیف ہے اس لیے کہ تغزل نام ہے
حسن و عشق کی واردات کی مصوری کا، اور سوز و گداز ہی عشق میں جلا دیتا ہے

اور اسی برق خرمن سوز سے نخلِ عاشقی ہرا ہوتا ہے، گدازِ عشق کا بیان فانی کا خاص حصہ ہے، لیکن جگر نے بھی ایک درد آشنا دل پایا ہے، اس لئے اُن کے اشعار بھی اس برق خرمن سوز کی شرر باریوں سے خالی نہیں ہیں، اور کبھی کبھی ان کے ٹوٹے ہوئے دل سے بھی آہِ سوزاں نکل جاتی ہے۔ ہوس پیشہ عشاق کیلئے دردِ عاشقی ایک مصیبت ہے، لیکن جگر کا درد پسند دل اس سے لذت یاب ہوتا ہے، اور کمال لذت کے لیے سراپا درد بن جانا چاہتا ہے۔

ایک کیفِ ناتمام درد کی لذت ہی کیا

درد کی لذت سراپا درد بن جانے میں ہے

اس کی محرومیوں کی یہ انتہا ہے کہ سکون کیا اضطراب بھی میسر نہ ہوا۔

جہانِ شوق کی محرومیاں نہ پوچھ جگر

سکوں تو کیا کہ میسر نہ اضطراب ہوا

دل کی بربادی۔

اس ایک دل کی حقیقت کا کیا کہنا

جو لاکھ بار بنا اور پھر خراب ہوا

دردِ غم کی وسعت اور پہنائی۔

اللہ اللہ تیرے غم کی وسعتیں کوئی عالم درد سے خالی نہیں

بھری ہوئی ہیں فضا میں جمالِ غم سے تمام

گناہگار نظر لذتِ عذاب اُٹھا

اس کا درد آشنا دل عیشِ وصال کو بھی شباہت غم کی وجہ سے قبول

کرتا ہے۔

کر لیا دل نے عیشِ وصل قبول   پا گیا کچھ شباہتِ غم کیا

غم حسن کی ایک امانت ہے، اور حقِ امانت اس کی غم خواری ہے، اس لئے وہ عام عشاق کے برعکس شبِ ہجر کی درازی کی دعا مانگتا ہے۔

تری امانتِ غم کا تو حق ادا کر لوں
خدا کرے شبِ فرقت ابھی دراز رہے

شبِ فرقت میں عشاق کم سے کم یار کے تصور ہی سے دل بہلاتے ہیں، لیکن جگر کو یہ بھی گوارا نہیں۔

چاہیئے تیرے تصور سے بھی ایسے میں گریز
کیوں کرے تجھ کو شریکِ غمِ ہجراں کوئی

عام شعرا کے یہاں غمِ ہجر جانگسل ہے لیکن جگر کا غمِ ہجر جاں نواز ہے۔

ترے بغیر تو جینا روا نہیں لیکن
میں کیا کروں جو ترا غم ہی جاں نواز رہے

غالب نے کہا ہے۔

ہائے اس بے کسیِ عشق پہ رونا غالب
کس کے سر جائے گا سیلابِ بلا میرے بعد

جگر کہتا ہے۔

جب حسن و عشق دونوں کو دیا کریں گے مجھ کو   وہ بھی جگر زمانہ نزدیک آ رہا ہے

میرے نزدیک اس شعر میں جگر کا تخیل غالب سے بہت آگے بڑھ گیا، غالب کو خود اپنے بعد اور تنہا عشق کی بے کسی پر رونا آتا ہے، لیکن جگر کے بعد حسن اور عشق دونوں بے یار و مددگار ہو جائیں گے۔

عاشق کی جستجو کی آخری حد ناکامی ہے۔

یہ حدِ آخری ہے عاشق کی جستجو کی
بن بن کے مٹ رہی ہے ہر شکل آرزو کی

یہ نیا تخیل ملاحظہ ہو کہ جگر خود رہینِ درد ہے لیکن اس کی تسلی کیلئے غمِ یار کی شیفتگی کافی ہے۔

میں رہینِ درد سہی جگر مجھے اور چاہئے کیا جگر
غمِ یار ہے مرا شیفتہ میں فریفتہ غمِ یار پہ

غم کی مداومت اس سے زیادہ بلیغ پیرایہ میں کیا دکھائی جا سکتی ہے۔ فانی نے کہا ہے۔

مآلِ سوزِ غمہائے نہانی دیکھتے جاؤ
بھڑک اٹھی ہے شمعِ زندگانی دیکھتے جاؤ

جگر کہتا ہے۔

مری سمت سے اسے اے صبا یہ پیامِ آخرِ غم سنا
ابھی دیکھنا ہو تو دیکھ جا کہ خزاں ہے اپنی بہار پہ

عشق کا خوش آیند آغاز اور اس کا حسرت ناک انجام۔

عجب انقلاب زمانہ ہے مرا مختصر سا فسانہ ہے
یہی اب جو بار ہے دوش پہ یہی سر تھا زانوئے یار پہ

بعض مدعیان تجدید و اصلاح کی بہت سی بدمذاقیوں میں سے ایک بدمذاقی یہ بھی ہے کہ رنگین نوائی کو مذاق سلیم کے منافی سمجھا جاتا ہے، میرے نزدیک رنگینیٔ خیال اور رنگینیٔ ادا بھی شاعری کا ایک نہایت ضروری عنصر بلکہ رخسارِ شاعری کا گلگونہ ہے، کہ شاعری میں روح کی بیداری اور دل کی تڑپ کے ساتھ لبوں کے تبسم اور چہرہ کی شگفتگی کا سامان بھی ضروری ہے ورنہ شاعری محض محفلِ وجد کے لیئے رہ جائے گی، ہاں اس میں اعتدال اور سلامت مذاق البتہ ضروری شرط ہے کہ وہ محض پُر لطف شوخی تک محدود رہے، بازاری پھکڑ نہ بننے پائے، اس لحاظ سے جگر کی شاعری بھی اس رنگین عنصر کی لطیف آمیزش سے خالی نہیں ہے اور انھوں نے اپنی خوش مذاقی سے اس عنصر کو ایسا نکھایا ہے کہ کہیں سے رنگ پھوٹے نہیں پاتا، اب مثالیں ملاحظہ ہوں۔

جوانی کا کتنا صحیح اور پُر کیف مرقع ہے۔

جوانی کا عالم ہے سرشاریاں ہیں ۔۔۔ قدم ڈگمگائے نظر بہکی بہکی

کس قدر بلیغ اور شاعرانہ تشبیہ ہے۔

منھ سے بُول اُٹھنے کو ہے جامِ شراب ۔۔۔ ان لبوں کی جاں نوازی دیکھنا

کس قدر پُر کیف التجا ہے۔

میرا اپنی جان، تو قربان کر چکوں تجھ پر

یہ چشم مست ابھی نیم باز رہنے دے

حسنِ یار کی بہار آفرینی دیکھیے۔

دوڑا کے حسنِ یار کی ہلکی سی اک لہر
کانٹوں کو میں نے رشکِ گلستاں بنا دیا

حسنِ تصوّر کا فریب رنگ و بو ملاحظہ ہو۔

ہائے یہ حسنِ تصوّر کا فریبِ رنگ و بو
میں یہ سمجھا جیسے وہ جانِ بہار آ ہی گیا

نگاہِ مست کے دور کا کیف۔

کیفِ شباب و سرخوشیِ بادۂ حیات
کیا دور تھا تری نگہِ مست ناز کا

خیالات کی رعنائی کا پرتو۔

حسن کے ہر جمال میں پنہاں میری رعنائیِ خیال بھی ہے
دوسرے الفاظ میں یہ کہہ سکتے ہیں کہ حسن کو عشق کی رنگیں نظروں نے حسن بنایا۔

نگاہِ گستاخ کا اثر۔

ہائے وہ چہرہ اور اس میں وہ تڑپتی بجلیاں
کاش اک دن پھر انھیں گستاخ بن کر دیکھتے

نگاہِ مست کی مے باری۔

چھلک گیا ایک ایک مینکش اس نگاہِ مست سے
تم ادھر دیکھا کئے اور لٹ گیا مے خانہ آج

حسن کا جواب۔

فروغ بادہ ترے حسن کا جواب ہوا
سنبھالنا مجھے ساقی میں بے نقاب ہوا

بعض بعض غزلیں پوری کی پوری خیالات اور بیان کی رنگینی میں ڈوبی ہوئی ہیں لیکن لطافتِ ادا کی وجہ سے ان کی رنگینی بالکل گراں نہیں گزرتی۔

خیال رنگیں، نظام رنگیں، کلام رنگیں، پیام رنگیں
قدم قدم پہ، روش روش پہ، نئے نئے گل کھلا رہے ہیں

شراب آنکھوں سے ڈھل رہی ہے نظر سے مستی اُبل رہی ہے
چھلک رہی ہے اچھل رہی ہے پئے ہوئے ہیں پلا رہے ہیں

وہ روئے رنگیں وہ موجِ نسیم کہ جیسے دامانِ گل پہ شبنم
یہ گرمیِ حسن کا ہے عالم، عرق عرق میں نہا رہے ہیں

خود اپنے نشے میں جھومتے ہیں وہ اپنا منہ آپ چومتے ہیں
خرابِ مستی بنے ہوئے ہیں ہلاکِ مستی بنا رہے ہیں

یہ موجِ دریا یہ ریگِ صحرا یہ غنچہ و گل، یہ ماہ و انجم
ذرا جو وہ مسکرا دیے ہیں یہ سب کے سب مسکرا رہے ہیں

اب آگے جو کچھ بھی ہو مقدر رہے گا لیکن یہ نقش دل پہ
ہم ان کا دامن پکڑ رہے ہیں وہ اپنا دامن چھڑا رہے ہیں

خمریات موجودہ دور میں خمریات حضرت ریاضؔ کا مخصوص حصہ سمجھا جاتا ہے اور ایک حد تک یہ صحیح بھی ہے جو شاعر یہ شعر

اتنی پی ہے کہ بعد توبہ بھی
بے پیے بے خودی سی رہتی ہے

کہہ سکتا ہے، اس کی خمریات کے نشہ میں کسی کو شبہہ نہیں ہو سکتا، لیکن ریاض جگ بیتی کہتے ہیں اور جگر آپ بیتی کہتا ہے، وہ قال ہے اور یہ حال، اس لیے قدرۃً دونوں کے کیف اور اثر میں نمایاں فرق نظر آتا ہے ، خمخانہ، ریاض کی مے بھی پُر کیف ہے، لیکن جگر کی "خانہ ساز" جیسی نشہ آور اور ہوشربا نہیں ہے، جگر جو کچھ کہتا ہے عالمِ مستی میں کہتا ہے، اس لیے اس کے رندانہ اشعار بادۂ ناب کے لبریز جام کا اثر رکھتے ہیں جن کا ایک ہی جرعہ دوسروں کو بھی مست بنا دیتا ہے۔ جگر کے خمخانہ میں ہر رنگ و بو، ہر مزہ اور ہر درجہ کی شراب ہے اور اس کے اثرات بھی مختلف ہیں، کسی میں سرخوشی کی حد تک نشہ، کسی میں مستی اور کسی میں بدمستی تک لیکن اس عالمِ بدمستی میں بھی جہاں بڑے بڑے پاکبازوں کے قدم ڈگمگا جاتے ہیں جگر اپنے حواس قائم رکھتا ہے اور بڑبڑانے نہیں لگتا، جس خمخانہ کا جگر مے نوش ہے اس کی مے نوشی کے لیے کچھ خاص قواعد و شرائط ہیں، چنانچہ سب سے مقدم شرط یہ ہے،

اسی کے واسطے بھی ہے مے کشی بھی جگر
جسے خبر نہیں مے کیا ہے مے کشی کیا ہے

شاد نے کہا ہے۔

میں نثار اپنے خیال پر کہ بغیر مے کے ہیں مستیاں
نہ تو خم ہے پیشِ نظر کوئی نہ سبو ہے پاس نہ جام ہے

اور

رد و صافی کا لحاظ آفتِ جاں تھا ساقی ٭ دلے ان بادہ کشوں پر جنھیں یہ ہوش رہا

اس کی مے پرستی بلا وجہ نہیں بلکہ اس کا سبب یہ ہے ۔

نگاہِ خاص سے چھلکا رہا ہے مے کوئی	وہ پاکباز نہیں اب جو پاکباز رہے

اس سے بھی زیادہ صاف کہتا ہے ۔

پیتا بغیر اذن یہ کب تھی مری مجال	درپردہ چشمِ یار کی شہ پا کے پی گیا

شادؔ نے کہا ہے ۔

ہیں فدائے ساقیٔ مہ لقا، یہی مے کشی کا ہے مسئلہ

وہی حکم دے تو حلال ہے وہی روک دے تو حرام ہے

جگرؔ کی مے پرستی اس فلسفۂ اخلاق کے ماتحت ہے ۔

دل بدست آور کہ حج اکبر است	از ہزاراں کعبہ یک دل بہتر است

آزردگیٔ خاطرِ ساقی کو دیکھ کر	مجھ کو یہ شرم آئی کہ شرما کے پی گیا

شادؔ نے کہا ہے ۔

ناصاف بھی دی ہے تمہیں ساقی نے تو رندو

لے لو بہ ادب کچھ نہ کہو پیرِ مغاں سے

ترکِ شراب کی بے کیفی رندِ قدح نوش کے لئے موت سے کم نہیں اس لیے جگرؔ اپنی مے نوشی کے جواز کے لئے یہ عذرِ شرعی پیش کرتا ہے ۔

بے کیفیتوں کے کیف سے گھبرا کے پی گیا

توبہ کے ہر خیال کو ٹھکرا کے پی گیا

شرب بالخطا شریعت میں معاف ہے اس لئے جگرؔ کہتا ہے ۔

اے رحمتِ تمام مری ہر خطا معاف	میں انتہائے شوق میں گھبرا کے پی گیا

مے پرستی کا منتہائے کمال یہ ہے۔

اس جانِ میکدہ کی قسم بارہا جگر
کل عالمِ بسیط پہ میں چھا کے پی گیا

خمریات کی بعض بعض کیفیتیں ناقابلِ تشریح ہیں۔

چھلک گیا ایک ایک میکش اس نگاہِ مست سے
تم ادھر دیکھا کئے اور لٹ گیا مے خانہ آج

یہی تخیل کسی قدر ترمیم کے ساتھ شاد کے یہاں بھی موجود ہے۔

دیکھا کئے وہ مست نگاہوں سے بار بار
جب تک شراب آئی کئی دور چل گئے

مختلف نمونے۔

کھینچ کر اک آہ کس نے رکھ دیا جامِ شراب
دیدنی ہے اضطرابِ ساقی و پیمانہ آج

بادۂ ناب عجب چیز ہے ساقیٔ سیکن
اور ہی کچھ ترے ہاتھوں سے مزا آتا ہے

پی کے اک جامِ شرابِ شوق آنکھیں کھل گئیں
دیکھتا ہوں جس طرف میخانہ ہی میخانہ ہے

شوخیٔ رندانہ رندوں اور واعظوں میں بہت پرانی نوک جھونک چلی آتی ہے اور جب تک ان دونوں کا وجود دنیا میں باقی رہے گا دونوں کی چپقلش چلی جائے گی، اس لئے کہ نہ اس کے منھ سے یہ کافر لگی ہوئی چھوٹے گی اور نہ حضرت

واعظ اپنے مذہبی فریضے سے چوکیں گے، اور حشر تک یہ زور آزمائی قائم رہے گی واعظ کے پند اور رندوں کی چوٹوں میں بڑا فرق ہے، حضرت واعظ اپنا فرض ادا کر کے خاموش ہو جاتے ہیں اور کسی کو خبر بھی نہیں ہوتی، لیکن رندوں کی شوخ پھبتیاں گلی گلی اور کوچہ کوچہ میں پھیل کر شوخ طبع بے فکروں میں واعظ کو سامانِ تفریح بنا دیتی ہیں، بعض بے باک رندوں نے تو عالم بدمستی میں واعظ کی پگڑی تک اچھال دی، اور بعض کی شوخیاں محض رندانہ چوٹوں تک محدود رہتی ہیں، جگر بھی انھیں مہذب رندوں میں ہے، اس نے بھی واعظوں پر نہایت لطیف اور ظریفانہ پھبتیاں کہی ہیں لیکن تہذیب کا دامن کہیں ہاتھ سے نہیں چھوٹا ہے،

واعظ جو کچھ کہتا ہے وہ اپنی کتابی پوٹ کے بل پر کہتا ہے، لیکن جگر اپنے سامانِ رندی کے مقابلہ میں واعظ کے "بارِ علم" کی یہ حیثیت سمجھتا ہے۔

کدھر سے برق چمکتی ہے دیکھوں اے واعظ
میں اپنا ساغر اٹھاتا ہوں تو کتاب اُٹھا

واعظ بدمست جگر کو اُٹھانے کے لیے بڑھتا ہے جگر یہ شوخ و رندانہ جواب دیتا ہے۔

مجھے اُٹھانے کو آیا ہے واعظِ ناداں
جو اُٹھ سکے تو مرا ساغرِ شراب اُٹھا

"اُٹھ سکے" کے لفظ سے واعظ کی کتنی تحقیر ہوتی ہے، یعنی ساغر کا بار علم کے بار سے بڑھ کر ہے، اشاد نے اسی مضمون کو کسی قدر ترمیم کے ساتھ اس سے زیادہ شوخ کہا ہے۔

بارِ سبو وہی اُٹھائے جس پہ ہو فضلِ مے فروش
زاہدِ خشک پہ بھی کیا بوجھ ہے جانماز کا

زاہد بادۂ کوثر کی لو لگائے ہوئے ہے جگر اس کے لیئے مے نوشی کے جواز کا یہ پہلو نکالتا ہے اور درپردہ اس کے انتظار بادۂ کوثر پہ چوٹ بھی کرتا ہے۔

پی بھی جا زاہد خدا کا نام لے کر پی بھی جا
بادۂ کوثر کی بھی اک موج پیمانہ میں ہے

زاہد کے چہرہ کے نور کا کیسا رندانہ اور دلچسپ سبب بیان کرتا ہے۔

ہو گیا کیا مُرید مے زاہد :: اب تو چہرہ پہ نور رہتا ہے

جگر نے عالمِ بدمستی میں زیادہ سے زیادہ بارگاہِ زہد میں جو بے ادبی کی ہے اُس کا یہ نمونہ ہے۔

غرق کر دے تجھ کو زاہد تیری دنیا کو خراب
کم سے کم اتنی تو ہر مے کش کے میخانہ میں ہے

اخلاق

جگر غزل گو شاعر ہے جس کا کام صرف جذبات کی مصوری ہے وہ کوئی معلم اخلاق، حکیم اور واعظ نہیں کہ اخلاقی درس دینا اس کا فرض ہو، اس لیئے اس کی شاعری میں اخلاق کا حصہ بہت کم ہے۔ لیکن اس حیثیت سے کہ اخلاق بھی ایک حد تک شاعری کے حدود میں داخل ہے اس لیئے جگر کا کلام درس اخلاق سے بالکل خالی نہیں ہے۔

رہِ طلب میں نہ کر خوف لغزش پا سے :: یہاں جو گر کے اُٹھا بس وہ کامیاب اُٹھا

مجھے آغوشِ طوفاں ہی جگر آغوشِ مادر ہے
وہ کوئی اور ہوں گے امن ساحل دیکھنے والے

ہر طرف بے فائدہ کیوں سعی بیہم کیجیے
تشنگی سے اپنی پیدا بحرِ اعظم کیجیے

فضائے عالمِ ہستی پہ جب کریں گے نظر
ہر ایک موج کو موجِ سراب دیکھیں گے

پروردۂ طوفاں کو کشتی کی نہیں حاجت
موجوں کے تلاطم میں ساحل نظر آتا ہے

مختلف نمونے اور مختلف سرخیوں کے ماتحت کافی منتخب اشعار لکھے جا چکے پھر بھی ابھی بہت سا حصہ رہا جاتا ہے، اس لیے آخر میں ناظرین کی ضیافت طبع کے لیے چند منتخب اشعار بلا کسی ریویو کے نقل کیے جاتے ہیں۔

ہر تڑپ کے ساتھ اک جلوہ نمایاں ہو گیا
آج ثابت یار کا قربِ رگِ جاں ہو گیا

کس نظر سے آج وہ دیکھا کیا
دل مرا ڈوبا کیا اُچھلا کیا

آہ یہ عالمِ کثرت تری رعنائی کا
ایک مرکز نہ رہا چشمِ تماشائی کا

نگاہِ شوق کی جذب و کشش ارے توبہ
جس آئینہ پہ نظر کی ترا جواب ہوا

عین قربت بھی عین فرقت تھی
ہائے وہ قطرہ جو حباب ہوا

جز ترے کچھ نظر نہیں آتا آرزو بن گئی مجسم کیا

کمالِ عشق میں احساس اتنا تیز ہو جاتا
جو چھو جاتی ہوا، دل درد سے لبریز ہو جاتا

آلودہ خاک ہی میں رہنے دے اس کو ناصح
دامن اگر جھٹک دوں جلوے کہاں سمائیں

جو دل سے اٹھتے ہیں شعلے وہ رنگ بن بن کر
تمام منظر فطرت پہ چھائے جاتے ہیں

میں اپنی آہ کے صدقے کہ میری آہ میں بھی
تری نگاہ کے انداز پائے جاتے ہیں

بھڑکا رہا ہوں آتش عصیاں ہر ایک سمت
پھیلا رہا ہوں رحمت پروردگار کو

خمستان فارس "خمخانۂ ہندی کی شراب ناب کے بعد ناظرین "بادۂ شیراز" کا بھی تھوڑا سا مزہ چکھ لیں، جگر نے فارسی کلام میں حافظ شیراز کے تتبع اور ...... جہاں تک بیان کی رنگینی اور خیالات کی باریکیوں کا تعلق ہے اس کا چربہ اتارنے کی پوری کوشش کی ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہ ان کا میدان نہیں، تاہم ان کا فارسی کلام بھی لطف سے خالی نہیں۔ یہ حصہ نہایت مختصر ہے، صرف چند غزلیں اور بعض مسلسل نظمیں ہیں، اس لئے اس پر مستقل تبصرہ کی گنجائش نہیں، صرف نمونۃً کچھ اشعار نقل کر دیے جاتے ہیں "خطاب بہ مسلم" کی مسلسل اور سبق آموز نظم خوب ہے، غزل کا نمونہ یہ ہے۔

شراب و ساغر و سبو، گل و بہار و آب جو
دو صد جہانِ رنگ و بو، نمود یک جہان ما

بیا بنوش جام مے چہ جام مے تمام مے
کہ ما و اذنِ جام مے خوش است ارمغانِ ما

آوارہ ہر نگاہ ز جرمِ نگاہ کیست
دیدن گناہِ ماست نہ دیدن گناہ کیست

دیوانہ وار جاں بہ فشاندن گناہ ماست
بیگانہ وار رُخ نہ نمودن گناہ کیست

صد نقش سجدہ تا در بت خانہ دیدہ ایم
ایں ہم جبیں گر اشارۂ طرفِ کلاہ کیست

بے کیفیتِ عاشق صد کیف و اثر دارد
زیں سرِّ نہاں لیکن ہر کس نہ خبر دارد

در عینِ وصال او یابم اثرِ دوری
اے پیرِ رہِ عشقم ایں پردہ کہ بر دارد

مفتی بحقِ منصور بنوشت عجب فتوے
کافی است پے قتلش ایں جرم کہ سر دارد

من عاشقِ آں شوخم کو از سرِ محبوبی
مانوس دلے دارد، بیگانہ نظر دارد

غافل ز دلم ہمنشیں جانم ز سر مستی :
صد نغمہ سر برانگیزد سازے کہ تو بشکستی

بلبل ہمہ تن خوں شدہ گلہا ہمہ تن چاک
اے وائے بہارے اگر این ست بہارے
اغیار بدل خندہ زن دل بہ تو مشغول
خلقے بپس دیوانہ و دیوانہ بکارے

ریاضِ رضواں

اس عہد کے اُستادِ سخن حضرت ریاض خیر آبادی مرحوم کے دیوان کی اشاعت کا شائقین کو عرصہ سے اشتیاق تھا، خوشی کا مقام ہے کہ "ریاض رضواں" کے پردہ میں یہ بہار آگئی، یہ دیوان کئی مہینے ہوئے ریویو کے لئے آیا تھا، لیکن اب تک اس کی نوبت نہ آسکی، گذشتہ اپریل میں مرتب دیوان محترمی قاضی تلمذ حسین صاحب رکن دارالترجمہ حیدر آباد نے اس لطیف پیرایہ میں ریویو کا تقاضا فرمایا کہ "اب تو ہولی کا موسم بھی گذرا جارہا ہے" موصوف کا یہ فقرہ کلامِ ریاض پر نہایت بلیغ تبصرہ ہے۔

میں شاعر نہیں ہوں، البتہ شعر و سخن کا ذوق ضرور کبھی تھا، لیکن اب عرصہ سے طبیعت ایسی بدل گئی ہے، کہ شعر سے لطف اندوزی کا ذوق بھی باقی نہیں رہا۔ اس لئے دیوان ریاض کے مطالعہ کی طرف طبیعت متوجہ ہی نہ ہوتی تھی، کئی مرتبہ کوشش کی، مگر طبیعت راغب نہ ہوئی، بالآخر بادلِ ناخواستہ دیوان لے کر بیٹھا، دیوان کیا ہے میکدہ ہے، غزلوں میں شراب کی تاثیر اور ہر شعر چھلکتا ہوا جام ہے، اس لئے جوں جوں آگے بڑھتا گیا، افسردہ طبیعت شگفتہ ہوتی گئی، اور شاعری سے مدتوں کی اکھڑی ہوئی طبیعت عارضی طور سے پھر مانوس ہوگئی، یہ بھی حسنِ اتفاق کہ اس میکدہ کی سیر کا اتفاق عین توبہ شکن موسم ساون میں ہوا، بہر حال اس میکدہ کی سیر سے جو

کچھ حاصل ہوا ہے وہ خوش مذاق ناظرین کی ضیافت کے لئے پیش کیا جاتا ہے۔

میکدۂ ریاض کی شراب اتنی تیز اور رنگین ہے کہ اسے پی کر نہ بہکنا بڑے ظرف کا کام ہے، اس لیے اگر سنجیدہ ناظرین کو کہیں قلم میں لغزش نظر آئے تو وہ میرا قصور نہیں، بلکہ بادۂ ہوش ربا کا فیض ہے۔

یہ دیوان مقدموں اور تبصروں کے علاوہ ساڑھے سات سو صفحوں میں پھیلا ہوا ہے، شروع میں مہاراجہ کشن پرشاد بالقابہ، نواب اختر یار جنگ بہادر خلف حضرت امیر مینائی، مولوی سبحان اللہ صاحب رئیس گورکھپور اور نیاز فتحپوری کے قلم سے مقدمات اور تبصرے ہیں، اور فاضل مرتب کے قلم سے دیوان ریاض کی ترتیب و اشاعت کی روئداد ہے، ان مقدموں میں کلام ریاض کے مختلف پہلوؤں پر تبصرہ ہے، ان میں مولوی سبحان اللہ صاحب کا مقدمہ اپنی ندرت اور معنی آفرینی کے اعتبار سے قابل توجہ ہے، موصوف نے کلام ریاض سے نہ صرف تصوف کے رموز و اسرار منکشف کئے ہیں، بلکہ سیاست کے نکتے بھی حل کئے ہیں، یہ اُن کی دقت نظر ہے جہاں ہر شخص کی نگاہ نہیں پہونچ سکتی۔

اصل دیوان کے دو حصے ہیں پہلے حصہ میں جو ۹۰ ۴ صفحوں میں ہے، غزلیات ہیں اور دوسرے میں قصائد، ساقی نامے، سہرے، قومی نظمیں، رباعیات قطعات اور دوسری مختلف منظومات ہیں، دیوان کے حسن ترتیب کے لئے قاضی تلمذ حسین صاحب مرتب "کلید مثنوی" کا نام پوری ضمانت ہے۔

ریاض اس دور کی یادگار تھے جب شاعری کی دنیا میں داغ و امیر کا

طوطی بول رہا تھا، اور اقلیم شاعری میں انھی دونوں استادوں کی ٹکسال کا سکہ رواں تھا، پھر ریاضؔ امیرؔ کی مینا کے بادہ کش تھے، ان کی شاعری کا نشوونما اس دور کی فضائے شاعری میں ہوا، اس لیے ان کا ذوق و رنگ تمام تر اسی اسی دور کا نمونہ اور ان کا کلام اس دور کی تمام خصوصیات کا حامل ہے۔

ریاضؔ نے بڑی عمر پائی، پرانی محفلیں دیکھیں، نئے جلسے دیکھے، شاعری کا نیا رنگ ان کی نگاہوں کے سامنے بدلا اور پھیلا، لیکن اولاً تو پرانے اساتذہ اس رنگ کو آنکھ نہ لگاتے تھے، پھر بوڑھے ریاضؔ پر پرانا رنگ اتنا گہرا تھا کہ اس پر نیا خضاب نہیں چڑھ سکتا تھا، اس لیے ان کی شاعری میں نئے رنگ کا کوئی اثر نہیں ہے۔

ریاضؔ امیر مینائیؔ کے شاگرد تھے، لیکن اس دور میں داغؔ کا رنگ اتنا مقبول ہوا کہ خود امیر مینائیؔ کو اپنا پرانا طرز چھوڑ کر داغؔ کا رنگ اختیار کرنا پڑا جس کا شاہد ان کے پہلے اور آخری دور کا کلام ہے، پھر ریاضؔ کا فطری ذوق امیر مینائیؔ کے مقابلہ میں داغؔ کے ذوق سے زیادہ مناسبت رکھتا تھا، اس لیے ان کے کلام میں داغؔ کا رنگ غالب ہے، انھوں نے داغؔ اور امیر مینائیؔ دونوں کی خصوصیات کو اپنی شاعری میں سمو لیا تھا، اس میں زبان کی صفائی سادگی، سلاست، شیرینی، حلاوت اور برجستگی اور خیالات میں شوخی، بانکپن رندی و سرمستی اور ظرافت و بذلہ سنجی داغؔ کی ہے، اور نازک خیالی اور معنی آفرینی امیر مینائیؔ کی، اس طرح داغؔ اور امیرؔ میں جو خصوصیات الگ الگ تھیں وہ ریاضؔ میں یک جا نظر آتی ہیں اس لیے ان کی شاعری شراب دو آتشہ ہو گئی ہے۔

چونکہ ان کا کلام امیر اور داغ کے دور کی یادگار ہے، اس لئے اس میں
تمام خصوصیات وہی ہیں جو اس دور کی شاعری کا طغرائے امتیاز تھیں۔

زبان کی نفاست

ان کے کلام کی ظاہری اور سب سے نمایاں خصوصیت زبان کی
خوبی و پاکیزگی، سادگی و صفائی، لطافت و نفاست، محاوروں اور اصطلاحوں
کا برجستہ استعمال ہے، کلام کیا ہے زبان کی ٹکسال اور محاوروں کا خزانہ ہے
اشعار ہیں کہ کھرے سکے ڈھل ڈھل کر نکلتے ہیں، فصاحت و بلاغت یہ
ہے کہ کسی شعر میں ایک لفظ بھی حشو و نامناسب نہیں، جو لفظ جہاں ہے
گویا نگینہ جڑا ہے، اگر اسے بدل دیا جائے تو زبان کا لطف خاک میں مل جائے گا
وہ الفاظ استعمال نہیں کرتے بلکہ ان سے کھیلتے ہیں، داغ کے علاوہ کسی
دوسرے شاعر کے کلام میں مشکل سے زبان کا یہ لطف مل سکتا ہے، ریاض
کے کلام میں یہ وصف اتنا عام ہے کہ ایک شعر بھی اس سے خالی نہیں اس لئے
زبانوں کے نمونوں کی مثالیں پیش کرنے کی ضرورت نہیں، آئندہ مختلف مثالوں
کے جتنے شعر آئیں گے کوئی لطف زبان سے خالی نہ ہوگا۔

شوخی و رنگینی

دوسری خصوصیت شوخی و رنگینی اور حسن و عشق کے جذبات و
معاملات کی بے ریا مصوری ہے، اس لئے ان کا کلام پری خانہ بلکہ بدمست
مے خانہ ہے، جہاں جلوت و خلوت کا کوئی امتیاز نہیں، حسن کی ہر ادا بے محابا
کرشمہ و ناز کی ہر تصویر بے حجاب اور جذبات کا ہر منظر بے باک ہے، عشاق کی
بے تابیوں نے حریم حسن کا پردہ چاک کر دیا ہے، کہیں کہیں یہ مناظر ایسے
شوخ اور بے باکانہ ہیں کہ متانت آنکھیں نیچی کر لیتی ہے، یہ سب اعتدال

موجودہ مذاق کے لیئے بہت گراں ہیں، لیکن یہ ریاض کا قصور اور کلام ریاض کا نقص نہیں ہے، بلکہ ان کا ہنر ہے، وہ جس دور کے شاعر تھے اس دور کا عام مذاق، بلکہ کمالِ شاعری یہی تھا، اس لیئے ایلورا اور اجنٹا کے مناظر کی طرح ان آثار قدیمہ کی بھی قدر کرنی چاہیئے، کہ اب یہ نمونے ڈھونڈے سے نہ ملیں گے، کیا معلوم آج کا مذاق کل کیا درجہ پا پڑے گا، ان کا سارا دیوان ان رنگینیوں بلکہ ہولی کی رنگ بیزیوں سے گلنار ہے، اس کی مثالیں آئندہ آئیں گی۔

خمریات ان کی تیسری اور مابہ الامتیاز خصوصیت ان کے "خمریات" یعنی مے نوشی اور بادہ پرستی کے مضامین ہیں، یہ چیز ان کی شاعری کا طغرائے امتیاز ہے، اس میں مشکل سے ان کا کوئی حریف نکل سکتا ہے، وہ صحیح معنوں میں اردو ابو نواس اور خیام ہیں، ان کا شاعرانہ کمال اسی میں نظر آتا ہے، اور ان کے کلام میں سب سے زیادہ یہی چیز دکھلانے کی ہے۔

ان کا دیوان ایسا مے خانہ ہے جس میں تنہا بادہ و مینا کا اہتمام نہیں ہے بلکہ اس کی زمین سے شراب کے چشمے اُبلتے ہیں، اس کے آسمان سے شراب کی گھٹا برستی ہے، ہر سمت شراب کی نہریں رواں ہیں اور ایسی لطیف، خوش رنگ اور خوشبو کہ دیکھنے والا بے پیئے مست ہو جاتا ہے، ان کے خمریات میں مضامین کا ایک عالم نظر آتا ہے، اور ایسے لطیف و نازک کہ ذوق سلیم وجد کرنے لگتا ہے ریاض نے شراب کی ایسی ایسی لطیف کیفیتیں بیان کی ہیں کہ شاید عالم مستی میں بھی مے پرستوں کا تخیل وہاں تک نہ پہنچا ہوگا، اس مے خانہ کے کچھ جام پیش کیئے جاتے ہیں۔

ہر مشرب میں پختگی کے لیے اخلاص اور عقیدہ کی مضبوطی شرط ہے جسے اصطلاحِ شرع میں ایمان کہتے ہیں، ضروری ہے، ایمانِ مے پرستی یہ ہے کہ پی کر منہ پر نور کی جھلک آجائے۔

پی کر بھی جھلک نور کی منہ پر نہیں آتی
ہم رندوں میں جو صاحبِ ایماں نہیں ہوتا

مے پرستی کی عظمت و کرامت۔

بنائے کعبہ پڑتی ہے جہاں ہم خشتِ خم رکھ دیں
جہاں ساغر پٹک دیں چشمۂ زمزم نکلتا ہے
ہر ایک قطرہ سے بہتی دریا صفا جوئے شراب
جو پی کے ہم سر زمزم کبھی وضو کرتے،

شراب کی علتِ جواز۔

جب اُن کے ہاتھ میں جامِ شراب ہوتا ہے
حرام شے کا بھی پینا حلال ہوتا ہے

حرمت کا سبب۔

مے نوش ضرور رہیں نہ نااہل جن پر یہ حرام ہوگئی ہے

مے دوآتشہ کا جوش۔

تھی سر بہ مہر ٹوٹ گئی اپنے زور میں،
توبہ سے پہلے ٹوٹی ہے بوتل شراب کی

بادہ پرستوں کی نگاہِ جلال کا اثر۔

توبہ کی طرح ٹوٹتے ہیں سر بہ مہر خم
کیا قہر ہے نگاہ کسی مے گسار کی

ساقی کی تحریر کا رمز و کنایہ۔

اے سرشارِ محبت خط ساغر کو سمجھ
دستِ ساقی کی یہ تحریر تو کچھ کہتی ہے

اس "کچھ" کے پر لطف "ابہام" کی تشریح ہر شخص اپنے ذوق سے کر سکتا ہے۔

ساقی کے پس خوردہ کی لذت۔

اپنی جھوٹی جو کبھی مجھ کو پلا دیتا ہے
لب ساغر لب ساقی کا مزہ دیتا ہے

ساقی کے تبسم کا کتنا پرکیف اور لطیف اثر ہے۔

میرے ساقی ترے تبسم سے جام چھلکے چھلک پڑے خم سے

"تبسم" اور چھلکنے کی مناسبت بھی لائق غور ہے۔

راہ کا پھیر۔

جاتے تھے سوئے میکدہ نکلے حرم میں ہم
کیا جانیں آج راہ میں کیا پھیر ہو گیا

بوئے شراب کی رہنمائی۔

کیا بھٹکتے پھرے تھی رہ نما میکدے جاتے کئی رستے ملے

یہ شعر حقیقت پر بھی محمول کیا جا سکتا ہے، موج بادہ کی "رہنمائی"!

کوئی جو بہکے، بنے بڑھ کے راہ بر ہر موج
بتا رہے بادہ کشوں کو رہِ ثواب شراب

"رہِ ثواب" کے ٹکڑے نے شعر میں کتنا لطف پیدا کر دیا ہے۔

مے پرستوں کی شانِ قلندرانہ۔

مست اپنے حال میں ہر ایک آتا ہے نظر
میکدے میں جا کے دیکھو جو گدا ہے شاہ ہے

منت کے اچھوتے جام۔

اچھوتے جام ہیں منت کے کچھ الگ رکھے
کسے پلائیں کوئی پارسا نہیں ملتا

اس پارسائی کی نازک و لطیف شرح دوسرے شعر میں ملاحظہ ہو۔

سب ہم نے مسکرا کے کھنگالے اچھوتے جام
یہ سُن کے میکدے میں کوئی پارسا نہیں

بے خودی میں ہشیاری

ہم گرے جب لڑکھڑا کر بزم میں   سر سُبو پر ہاتھ ساغر پر پڑا

اس شعر پر شاد عظیم آبادی کا اس سے زیادہ لطیف شعر یاد آ گیا۔

لڑکھڑا کر جو گرا پانوں پہ ساقی کے گرا
اپنی مستی کے تصدق کہ مجھے ہوش رہا

کمال مے پرستی کے نقطہ نظر سے بعض الفاظ اور محاوروں کا استعمال اتنا برمحل ہوا ہے کہ شعر زمین سے آسمان تک پہونچ گیا ہے۔

بُرا چال چلن ۔

اک ہمیں ہیں کہ بہک جاتے ہیں توبہ کی طرف
ورنہ رندوں میں بُرا چال چلن کس کا ہے

عمر بھر کی کمائی لٹنا ۔

توبہ کرتا ہوں میں دمِ نزع لٹتی ہے کمائی عمر بھر کی

مے خلد مقام ۔

جس دن سے حرام ہو گئی ہے مے خلد مقام ہو گئی ہے

اپنی پونجی کے لئے کارِ خیر میں صرف کرنے کی وصیت ۔

پاک طینت رند پی کر مجھ کو پہونچائیں ثواب
میری پونجی نیک کاموں میں الٰہی صرف ہو

اس شعر کا تخیل اور ہر لفظ ریاضؔ کے کمال استادی کی سند ہے ۔

زاہدِ شب زندہ دار کا شغل ۔

پی پی کے اُس نے سجدے کئے ہیں تمام رات
اللہ رے شغل زاہدِ شب زندہ دار کا

آخری دشوار مرحلۂ نزع کی آسانی کے لئے ایک رند کی دعا

حلق سے اُترے جو وقتِ نزع ٹپکائیں شراب
اتنی آسانی الٰہی میری مشکل میں رہے

ٹپکا دے بوند بھر کوئی مُنہ میں ریاضؔ کے
دم مے کدہ میں توڑ رہا ہے پڑا ہوا ،

میخانے سے روح کے تعلق کا اثر۔

مر گئے پھر بھی تعلق جو ہے مے خانے سے
میرے حصّہ کی چھلک جاتی ہے پیمانے سے

قبر کی حسرت ہے کسی کا علاج۔

مری قبر پر آ کے مے کش پئیں — گھٹا حسرتوں کی ہے چھائی ہوئی

"گھٹا" کے لفظ نے اور جان ڈال دی ہے۔

جرائتِ رندانہ۔

پی کے آنا تھا کہ ہے روزِ حساب — مے کشو دیر میں فرصت ہوگی

خمریات کا ایک ضروری عنوان تو یہ ہے، اس کے بعض نمونے اوپر گذر چکے ہیں، چند مثالیں اور ملاحظہ ہوں۔

توبہ کے بعد پیمانے کے ٹکڑوں سے محبت۔

بعد توبہ بھی یہ پھینکا نہیں جاتا ہم سے،
ہم لئے بیٹھے ہیں ٹوٹے ہوئے پیمانے کو

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ بلبل خزاں میں پھولوں کی پراگندہ پنکھڑیوں کو پروں میں چھپائے بیٹھی ہے۔

موسم گل کے اثرات خزاں میں۔

اتنی پی ہے کہ بعد توبہ بھی — بے پیئے بے خودی سی رہتی ہے

یہ شعر بھی حضرت ریاض کے کمالِ مے پرستی کا نمونہ ہے، اس وقت پر کسی فارسی شاعر کا ایک شعر یاد آ گیا۔

خزاں رسید زبوئے بہار رفتہ ہنوز ،
ذخیرہائے جنوں دردماغ دل دارم ،

پاس وضعداری۔

وضع کے ساتھ رہی مست نگاہی کیسی
دیکھ ساقی ہیں توبہ بھی نباہی کیسی
ہے ریاض اک جوانِ مست خرام   نہ پیے اور جھومتا جائے

متفرق اشعار۔

کیا کیا خوشامدیں ہیں کہ پی لوں بہار میں
بادل کے ٹکڑے سر پہ مرے چھائے جاتے ہیں
عادت سی ہے نشہ ہے نہ اب کیف   پانی نہ پیا شراب ہی پی لی
بیعت پیر مغاں کی ہے جو توبہ کر کے
یہی پانی مئے گلگوں کا مزا دیتا ہے
مزا تو آئے جو لیں رند بڑھ کے ہاتھوں ہاتھ
مزا تو آئے کہیں سے جو مے اچھل کے چلے
رندانِ پاکباز کو پہونچائیں گے ثواب
کورے گھڑے میں شیر رہے انگبیں رہے
برسائے نور تو مری ریشِ سفید پہ ،
منھ دیکھتا ہے کیا مرے ساقی پلا مجھے
توبہ کر کے آج پھر پی لی ریاض   کیا کیا کم بخت تونے کیا کیا

کمر سیدھی کرنے ذرا مے کدہ میں　　عصا ٹیکتے کیا ریاض آرہے ہیں

شراب و شباب شراب کی روح شباب بلکہ اس کی دلکش تعبیر ہے، جوانی کی شراب بادہ و ساغر کی محتاج نہیں، اس کی ہر نگاہ موج شراب ہے اس لئے شعراء نے اس مئے دو آتشہ سے بڑے رنگین اور پر کیف مضامین پیدا کئے ہیں، ریاضؔ کے میکدہ کی مے پرستیاں آپ دیکھ چکے اب اُن کے خمکدہ شباب کی رنگینیاں ملاحظہ فرمائیے، شباب کے ایسے رنگین اور دل آویز مرقعے کم نظر آئیں گے۔

جوشِ شباب کا ایک مرقع۔

چھلکائیں لاؤ بھر کے گلابی شراب کی
تصویر کھینچیں آج تمھارے شباب کی

دوسری تصویر۔

جیسے ساقی تری ہنستی ہوئی تصویر شباب
ہم نے دیکھا ہے چھلکتے ہوئے پیمانے کو

"چھلکتے ہوئے پیمانہ" کی تشبیہ ہنستی ہوئی تصویر شباب سے کتنا رنگین اور پر کیف تخیل ہے۔

تیسرا منظر۔

مے جوانی کی طرح جس سے اُبلتی ساقی
تری تصویر مرے ہاتھ میں ساغر ہوتا

چوتھا رُخ۔

چھلکتے جام میں ساقی ذرا نمایاں کر ؛
جو کچھ کہ آئی ہے تصویر ہے جوانی کی

میکدہ شباب کی تصویر۔

بد مست دل ہے آنکھ ہے ساغر شراب کا
ساقی کا میکدہ ہے زمانہ شباب کا

جام شراب میں شباب کا عکس۔

کیا چھلکتا یہ کوئی جام شراب آتا ہے
سامنے میں قربان مرا عہد شباب آتا ہے

شراب نوشی کے لیے شرط۔

آئے ہمارے آگے وہ ساغر شراب کا
ساقی نے جس میں رنگ بھرا ہو شباب کا

اس کا نتیجہ۔

بھرے ساغر میں ہے بھرپور رنگ ان کی جوانی کا
غنیمت ہے کہ بے پیے مستی میں میرا پچھا نہ ہو جاتا

شراب کی سربمہر بوتلوں میں شباب کی راتیں بند ہیں۔

یہ سربمہر بوتلیں ہیں جو شراب کی
راتیں ہیں اس میں بند ہمارے شباب کی

چند مرقعے خالص شباب کے ملاحظہ ہوں۔

وفور شباب :-

کوئی شباب یہ ہے دیکھنے کی تاب نہ آئے
شباب آئے مگر اس طرح شباب نہ آئے

جوانی کی رنگین راتوں پر بہارِ گل صدقے۔
وہ شام و صبح صدقے ہو جس پہ بہارِ گل
چُن چُن کے ساتھ لائے ہیں راتیں شباب کی

شباب کی گریز پائی۔
بس ایک رات کا مہماں شباب ہوتا ہے
غروب صبح کو یہ آفتاب ہوتا ہے
"آفتاب" اور "غروب صبح" کی مناسبت لائق غور ہے۔

وداعِ شباب۔
کئے دن ہوئے شباب کو رخصت کئے ہوئے
اے ذوقِ معصیت ابھی توبہ گناہ ہے

بھولے ہوئے خواب کی یاد۔
نشۂ مے میں ذرا لطفِ شباب آتا ہے
ہم جسے بھول گئے یاد وہ خواب آتا ہے

جوانی کی پُرحسرت یاد۔
کیا پوچھتے ہو باتیں پیری میں جوانی کی
وہ اور زمانہ تھا یہ اور زمانہ ہے

آنکھ اور شراب | اثر و کیفیت کے لحاظ سے شراب کے نشہ اور نشیلی اور مخمور

آنکھوں کی مے بارے میں کوئی نسبت نہیں، خماری انکھڑیاں بے پیے مست بنا دیتی ہیں، جس کا نشہ کبھی نہیں اُترتا، اس لئے خمریات میں چشم مخمور کی شراب بڑی پُر کیف ہوتی ہے، ریاض کے خمریات اس سے خالی نہیں ہیں لیکن ان کے شراب کے مضامین اور مخمور آنکھوں کے مضامین میں کوئی نسبت نہیں تاہم لطف سے خالی نہیں، دو چار مثالیں ملاحظہ ہوں۔

نگہِ مست سے کچھ موج کو نسبت ہی نہ تھی
نرگسی آنکھ سے دیکھا کئے پیمانہ کو

خمار آلودہ آنکھوں پر ہزاروں میکدے صدقے
وہ کافر بے پئے بھی رات دن مخمور رہتا ہے

چشمِ ساقی نے ہمیں آپ میں رہنے نہ دیا،
ہم کدھر آج گرے چھوڑ کے پیمانے کو

اہتمام اتنا مرے ساقی کی محفل میں رہے
مست آنکھوں سے جو ٹپکے ساغر دل میں رہے

اُڑ کے آجائے وہ شے کھنچتی ہو جو انگور سے
کچھ نگاہ مست سے کچھ نرگسِ مخمور سے

اس سلسلہ میں شاد عظیم آبادی اور اصغر مرحوم کے دو شعر لکھے بغیر آگے بڑھنے کو جی نہیں چاہتا۔

دیکھا کئے وہ مست نگاہوں سے بار بار
جب تک شراب آئی کئی دَور چل گئے (شاد)

عجب لطیف اشارے تھے چشمِ ساقی کے
نہ میں کبھی ہوا بے خود نہ ہوشیار ہوا (اصغر)

تشبیہ خمریات | خمریات میں حضرت ریاض نے اتنی کثرت سے اور اتنی لطیف تشبیہیں پیدا کی ہیں کہ انھیں مستقل لکھنا مناسب معلوم ہوا۔

ریزۂ مینا کی تشبیہ پھول کی پنکھڑی سے۔

اَرے کس پھول کی یہ پنکھڑی ہے
میں رکھ لوں ریزۂ مینا کو دل میں

فروغِ مے کی نور سے اور ساغر کی چراغ طور سے۔

فروغِ مے ہے یا عرشِ بریں سے نور آتا ہے
کہ ساغر طاق سے بن کر چراغ طور آتا ہے

مینا کی شجر طور سے۔

پھول برسائے عوض صاعقے کے مے کا فروغ
شجر طور مری بزم میں مینا ہو جائے

موجِ مے کی شررِ طور سے۔

شررِ طور ہے جو موج ہے پیمانے میں
بجلیاں کوندتی ہیں آج تو مے خانے میں

بوتل کے کاگ کی دل سے اور خطِ پیمانہ کی نگہِ شوق سے۔

کاگ بوتل کا اچھل کر دلِ مشتاق بنا
نگہِ شوق لپٹ کر خطِ پیمانہ بنے

صراحی کے قہقہے کی بادل کی گرج سے، بوتل کی گھٹا سے، اور

موجِ مے کی بجلی ہے۔

بادل کی گرج ہے کہ صُراحی کے قہقہے
بوتل میں موج ہے کہ ہے بجلی گھٹا کے ساتھ

خُم کے خَم کی ابرِ رحمت کے جھکنے سے۔

خم مے سے کے نہ اُڑ جائے گا اے پیرِ مغاں
ابرِ رحمت جو جُھکا ہے تو جُھکا رہنے دے

ایک اور نادر اور لطیف تشبیہ جس کا تعلق اگرچہ خمریات سے نہیں ہے لیکن سُننے کے لائق ہے۔

نازک کلائیوں میں حنا بستہ مٹھیاں،
شاخوں میں جیسے مُنہ منڈھی کلیاں گلاب کی

شوخی رندانہ | خمریات کا ایک شوخ اور دلچسپ پہلو واعظ و زاہد اور شیخ و محتسب کے ساتھ شوخی رندانہ ہے، ان دونوں طبقوں کی نوک جھونک بہت قدیم ہے یہ چیز سب سے پہلے خیام نے شروع کی تھی، خواجہ حافظ نے اُسے کمال تک پہونچا دیا، درحقیقت ان لوگوں کا مقصد اس سے ریاکار واعظوں اور زاہدوں کی اصلاح اور اُن کے عیوب کی پردہ دری تھی جیسا کہ خواجہ حافظ کا کلام شاہد ہے۔

واعظاں کیں جلوہ بر محراب و منبر می کنند
چوں بہ خلوت مے روند آں کارِ دیگر می کنند

مشکلے دارم ز دانشمندِ محفل باز پرس
توبہ فرمایاں چرا خود توبہ کمتر مے کنند

گرچہ بر واعظِ شہر ایں سخن آساں نہ شود
تا ریا ورزد و سالوس مسلماں نہ شود

غلامِ ہمت دردی کشانِ یک رنگم
نہ آں گروہ کہ ازرق لباس و دل سیہ اند

بادہ نوشی کہ درو ہیچ ریائے نہ بود
بہتر از زہد فروشی کہ درو روئے و ریا ست

مے خور کہ صد گناہ ز اغیار در حجاب
بہتر ز طاعتے کہ بروئے و ریا کنند

من از پیرِ مغاں دیدم کراماتے مردانہ
کہ ایں دلق ریائی را بجامے در نمی گیرد

مے خور کہ شیخ و حافظ و قاضی و محتسب
چوں نیک بنگری ہمہ تزویر می کنند

خواجہ حافظ کے اس قسم کے سیکڑوں اشعار زبان زد خاص و عام ہیں۔ لیکن بہت سی باتوں کی طرح جو کسی مصلحت و غرض کی بنا پر شروع کی جاتی ہیں، مگر بعد میں ان کی اصلی روح غائب ہو جاتی ہے، اور محض اس کی نقالی رہ جاتی ہے، ریاکار زاہدوں کی اصلاح کا مقصد تو فوت ہو گیا، محض ان پر طعن و طنز اور چھیڑ اور پھبتی رہ گئی، بلکہ اس طرح لوازم شاعری میں داخل ہو گئی، کہ مشکل ہی سے کسی شاعر کا کلام اس سے خالی نکل سکتا ہے، ریا مثل خمریات کے پیرِ مغاں ہیں اسی لیے ان کی شاعری میں اس شوخیِ رندانہ کی

بڑی کثرت ہے، چند نمونے ملاحظہ ہوں :-

جناب شیخ نے جب پی تو منہ بنا کے کہا
مزا بھی تلخ ہے کچھ بو بھی خوشگوار نہیں

ذرا اس منہ بنانے کا تصور دماغ میں لائیے۔
ایک پُر لطف مذاق یا شیخ کی خفیہ مے پرستی پر لطیف تعریض دیکھیے۔

قرض لایا ہے کوئی بھیس بدل کر شاید
مے فروشوں کا ہے زاہد سے تقاضا کیسا

ایک شوخ اور بے باک مذاق :-

جناب شیخ سمجھتے ہیں کس تعلق سے
یہ دختِ رز کے کوئی رشتہ دار بھی تو نہیں

ریش کے خضابِ رنگیں پر بدگمانی :-

یہ کیا دخترِ رز تک رسائی ہوئی | جواب ریش زاہد حنائی ہوئی

واعظ کی کم ظرفی :-

کیوں اُبل پڑتے ہو میخانوں میں اکثر بے پیے
واعظو تم بھی بڑے اوچھے بڑے کم ظرف ہو

حضرت واعظ کی بلند پروازی :-

جام چھلکانے لگے بھر کر مئے کوثر سے آپ
حضرتِ واعظ بہت اونچے گئے منبر سے آپ

عمامہ کا دلچسپ بدل :-

نہیں عمامہ تو سر پہ شبورے مے رکھ لیں
جناب شیخ بہت آج ہلکے جاتے ہیں

پھبتیاں، "طرہ دستار" پر "دم روباہ" کی پر معنی پھبتی :-

واہ رے دستارِ واعظ بے ریا
بڑھ گیا طرہ دمِ روباہ سے

"واعظ بے ریا" اور "دمِ روباہ" کی معنوی بلاغت کتنی دلچسپ ہے۔

کوئی دیکھے اس کی جنبش اس کی گردش وقتِ وعظ
طرۂ دستارِ واعظ بھی دمِ روباہ ہے

وقتِ وعظ طرۂ دستار کی گردش اور جنبش نے واعظ کی تصویر کھینچ دی ہے۔

واعظ کے تن و توش پر خُم کی پھبتی :-

سر بزم واعظ سے دبنا پڑا
وہ خُم سے سوا تھا تن و توش میں

اس شعر کے ایک معنی تو ظاہر ہیں کہ واعظ مے پرست سے تن و توش میں سوا تھا، اس لئے دبنا پڑا، دوسرے لطیف معنی ہیں کہ اس کا تن و توش خم کے مشابہ یا اُس سے بھی بڑھ کر تھا، جس پر مے پرست احتراماً ہاتھ نہیں اُٹھا سکتے تھے

واعظ کی شگفتگیِ بیان پر قلقلِ مینا کی پھبتی :-

اتنی تو ہو بیان میں واعظ شگفتگی
ہم رند سُن کے قلقلِ مینا کہیں جسے

واعظ کا احترام :-

میکدے میں جا رہے منبر خم ہی تھا اے میکشو
میرے گھر واعظ جو آتے میرے سر پر بیٹھتے

بعض بعض اشعار میں یہ پھبتی متانت کے حدود سے گزر کر پھکڑ بن گئی ہے۔

ریش سفید کو ہے ضرورت خضاب کی
اے شیخ ڈال دوں کوئی کلّی شراب کی

مُنھ نہ پڑتا کھولا واعظ بہت ہی چوکا
بیلوں نے داڑھی پکڑی خوشوں نے مُنھ میں تھوکا

منبر نہیں ہے تختِ شہی ہے یہ وقتِ وعظ
واعظ نہیں ہے بھوٹوں کا یہ بادشاہ ہے

جناب ریاضؔ نے غریب حاجی کو بھی نہ چھوڑا، معلوم ہوتا ہے
انھیں کسی "ثواب فروش" حاجی سے سابقہ پڑ گیا تھا۔

کیسی مے، مُول لوں گا حج کا ثواب
ہے کہاں حاجی ثواب فروش،

بادۂ عرفاں | مادی شراب سے زبردستی بادۂ عرفاں کشید کرنا اور خمریات کے
مضامین کو خواہ مخواہ تصوف کے معنی پہنانا، خوش مذاقی کے خلاف ہے
لیکن ہر شاعر کے خمریات میں مادی بادہ و جام کے ساتھ بادۂ عرفاں کے
بھی دو چار ساغر نکل آتے ہیں۔ ریاضؔ کا کلام بھی اس سے خالی نہیں اتنی
مے پرستی کے بعد اس کے کفارہ میں دو چار جام شرابِ طہور کے پیش کیے جاتے ہیں۔

ملتی ہے در ساقیِ کوثر سے یہ خدمت
اس طرح کوئی پیرِ مغاں ہو نہیں سکتا

مے نورِ خدا ہوتی دل نورِ خدا ہوتا
تھوڑی سی جو پی لیتے کیا جانیے کیا ہوتا

اسی سے ملتا جلتا ہوا حضرت مجذوبؔ کا ایک شعر یاد آ گیا۔

یہ آج تصور میں مرے کون حسیں ہے
ہر ہو شجرِ طور ہے دل عرش بریں ہے

جام جن کے رونق طاقِ حرم | ہوشیار ایسے بھی متوالے ہوئے
جھومتے ہیں بیٹھے حرم میں ریاضؔ | آ کے یہاں نشہ سوا ہو گیا

بلا نوشوں میں شاید آ گیا ہے کوئی کعبہ میں
خم آتا ہے پئے طوفِ حرم خم خانہ آتا ہے

اے شیخ وہ کعبہ ہو یا ہو در مے خانہ
تو نے مجھے جب دیکھا سجدہ ہی میں سر دیکھا

پی پی کے میں روتا ہوں رو رو کے میں پیتا ہوں
داغ جو کوئی پڑتا ہے تو یہ دامن دھوتی ہے

تخیل کی رنگینی اور بیان کی شوخی

تخیل کی رنگینی اور بیان کی شوخی شاعری کے عارضِ زیبا کا گلگونہ ہے بغیر اس کے شاعری کا رنگ نہیں نکھرتا لیکن اس کے لئے بڑے ذوقِ سلیم کی ضرورت ہے، ورنہ اس کا رنگ چھوٹ کر شاعری کے پاک دامن کو داغدار بنا دیتا ہے، جناب ریاضؔ اس دور کے شاعر تھے، جب غیر معتدل رنگینی اور شوخی ہی کمال شاعری تھا، اس لئے ان کے کلام میں تخیل اور طرز ادا کی رنگینی اور شوخی کی اتنی بے اعتدالی ہے کہ اس کی حد پستی و ابتذال تک پہونچ جاتی ہے، لیکن یہ ان کے کلام کا نقص نہیں ہے، بلکہ اس دور کے مذاق شاعری کا لازمی نتیجہ ہے، لیکن خوشگوار

رنگینی کی جو مثالیں ہیں، وہ تخیل کی لطافت، بیان کے لطف اور زبان کی نفاست اور ہلکے پن کے بہترین نمونے ہیں، بعض مثالیں ملاحظہ ہوں :۔

وہ گل اندام ہو تم ٹوٹتے بلبل تم پر
تم جدھر جاتے اُدھر شورِ عنادل ہوتا

حنا ہاتھوں میں ہونٹوں پر تبسم گدگدی دل میں
وہ آئے پھول برساتے مرے پھولوں کی محفل میں

پھولوں کا زیور آج کھلا ان پر اس قدر
تصویر بن گئے ہیں عروسِ بہار کی

ابھی تو خونِ بسمل کچھ یوں ہی سا رنگ لایا ہے
شفق پھولی نظر آتی ہے یارب کوئے قاتل میں

انگڑائی لے کے اور بھی سوئے وہ چین سے
پھولوں کی پنکھیاں جو نسیم آکے جھل گئی

ترے نازک سے چہرے پر جہاں رنگِ عتاب آیا
صباحت رُخ کی بول اُٹھی کہ رُخ زیرِ نقاب آیا

چلے آتے ہیں خوش خوش کس کے گھر سے
وہ ہنستے کھیلتے بادِ سحر سے

نہ شرماؤ سکھاؤ شوخیاں ہم سن ہیں کم سن ہیں
ذرا یہ منھ بندھی کلیاں ہنسیں بولیں عنادل سے

کسے بتائے کوئی خونِ آرزو کیا ہے
انھیں یہ ضد ہے کہ دیکھیں گے رنگ و بو کیا ہے

سرِ تربت نہ سنبھلے گر پڑے پھول
میں شرمندہ ہوں دستِ نازنیں سے

اچھی نہیں ہیں آپ کی محشر خرامیاں سمجھیے
دنیا کو اس طرح تہ و بالا نہ سمجھیے

وہ پونچھتے ہیں آنسو کیا دستِ حنائی سے
یہ آگ بجھانا ہے یا آگ لگانا ہے

کبھی آنچل اُڑے اُن کے کبھی زلفیں بکھریں
وہ پریشان ہوئے بادِ سحر سے کیا کیا

نشہ میں جھکی پڑتی ہیں یوں ہی تری آنکھیں
چھیڑوں سے مری اور بڑھا بوجھ حیا کا

باطنی کیفیتیں

شوخی و رنگینی شاعری کے ظاہری خط و خال کا سنگار ہے لیکن اس کی روح باطنی کیفیتیں، تخیل کی رنگینی سے شاعری میں لطف تو ضرور پیدا ہوتا ہے، لیکن اس میں بلندی اور تاثیر نہیں آتی، اس کے لئے دل کی جراحت درکار ہے، کہ دل کا ساز اسی مضراب سے بیدار ہوتا ہے۔ بغیر لذتِ الم کے دل کیفیت سے محروم رہتا ہے، زندگی کی دائمی خوشگواری اور خوش عیشی دل کو مردہ اور روح کو پژمردہ کر دیتی ہے، روح کی کھیتی خونِ آرزو سے لہلہاتی ہے ع برق گرتی ہے تو یہ نخل ہرا ہوتا ہے۔

ریاض طربیہ شاعر ہیں، بزمِ رنداں میں ساغر کے تبسم اور صراحی کے قہقہوں کے سوا سوزِ دل اور زندگی کی گہرائیوں پر غور و فکر کا گذر کہاں

اس لیے ان کی شاعری میں خیالات کی بلندی، گہرائی اور باطنی کیفیتوں کی بڑی کمی ہے، اس سے میری مراد نالہ وشیون اور مرثیہ وماتم نہیں ہے بلکہ دل کی وہ چوٹ ہے، جس سے چشم دل وا، اور روح بیدار ہوتی ہے۔

لیکن شاعری دل کے جذبات وخیالات کا عکس ہے، اور ہر انسان کو دنیا کے نشیب وفراز سے گزرنا پڑتا ہے، پھولوں کی سیج بھی کانٹوں کی کھٹک سے خالی نہیں، شراب کے کیف وسرور کے بعد خمار کا خمیازہ بھی ضروری ہے، حضرت ریاض انسان تھے، ان پر بھی مختلف کیفیتیں طاری ہوتی تھیں، اس لیے ان کی شاعری اس جنس گرانمایہ سے بالکل خالی نہیں ہے، اور مے خوشگوار کے چھلکتے ہوئے جام میں کبھی کبھی دو چار گھونٹ تلخ بھی مل جاتے ہیں، گو ریاض کا یہ اصل رنگ نہیں ہے، بلکہ ان کے مذاق کے بالکل ضد ہے، لیکن وہ حقیقی شاعر تھے، اس لیے جس رنگ کی طرف بھی متوجہ ہو جاتے تھے، خوب کہتے تھے، ان کے اس رنگ کے اشعار میں میر کی روح بولتی ہے؛

پوچھا کسی نے حال کہ آنسو ٹپک پڑے

رونا مجھے ہے گریۂ بے اختیار کیا

اب سوئے آسماں نہیں اٹھتا   اپنے دست دعا کو روتے ہیں

یاد ایام وجام باقی ہے   مے کہاں ہے کا وہ سرور کہاں

مدت ہوئی رسائی قسمت کو رو چکے

وہ سنگ در کہاں یہ ہماری جبیں کہاں

نہ شگوفہ نہ گل نہ رنگ بہار   اب تو وحشت کا گھر چمن بھی ہوا

صدقے ترے صیاد یہ باتیں تھیں چمن تک
کچھ فکر بہار اب ہے نہ کچھ فکر خزاں اب

وہ نخل نہ وہ باغ نہ وہ شاخ نشیمن
اے اہلِ چمن چھوٹ گئے اب جائیں کہاں اب

لہو بھی تو آنکھوں سے آنے لگا ہے
ان آنکھوں کو اشکوں سے نم کرتے کرتے

اب دل ہے ریاض اور نہ دل کی وہ تمنا
منجدھار میں ہم کشتیِ امید ڈبو آئے

سوکھے ہوئے مرجھائے ہوئے پھول لحد پر
آ جاتے ہیں دو چار کبھی اڑ کے ہوا میں

ہم تھک کے گرے گر کے اٹھے اٹھ کے چلے بھی
تجھ پہ اثر ہے دوریِ منزل نہیں ہوتا

دلِ وارفتہ بھی پہلو سے گیا وائے نصیب
نہ رہا کوئی شریک اب غمِ تنہائی کا

خیالِ یار کے صدقے خیالِ یار ہی ہو گا
تسلی مجھ کو دینے کوئی وقتِ اضطراب آیا

ریاض احساس ہی مجھ کو نہیں ہے — یہ فصلِ گل ہے یا فصلِ خزاں ہے

تمنائیں بہت سی ہیں وقت کم ہے — کسے دیکھوں نگاہِ واپسیں سے

وہ دل ہی نہیں اے ہجومِ تمنا — جدا ہو گیا ہے جو اس کارواں سے

دن رات وہی ہیں مگر اللہ رے تغیر
خلوت میں بھی شغلِ مے و مینا نہیں ہوتا

نقش چھوڑے ہوئے تیرے نہیں دیکھے جاتے
عمرِ رفتہ نہ مرے دل میں تری یاد رہے

نشیمن میں گزر سے گئی موسمِ گل
قفس میں جو ٹوٹے تھے وہ پر نہ نکلے

خون تیرے ساتھ تیری آرزوئیں بھی ہوئیں
اے دلِ مرحوم تیرا حادثہ جانکاہ ہے

شمع فسردہ بجھتی ہے، سونی محفل ہوتی ہے
حسرت بیٹھی دل میں اب، میری جاں کو روتی ہے

لگی آگ میرے جگر میں یوں نہ لگے کسی کے بھی گھر کو یوں
نہ تو لو اُٹھی نہ چمک ہوئی نہ شرر اڑے نہ دھواں اُٹھا

مٹا ہوں میں مجھ میں کیا رہا ہے حزیں کو تو کیا ستا رہا ہے
تو اے مغنی جو گا رہا ہے تو رُو رہا ہے رباب میرا

بیانِ حقیقت | جیسا کہ میں نے اوپر لکھا ہے عاشقانہ، اور رندانہ اشعار میں سلوک و معرفت کے اسرار تلاش کرنا کچھ خوش مذاقی نہیں ہے، اس وقت تک اشعار کے ظاہری معنی ہی لینے چاہئیں، جب تک الفاظ یا شعر کا جلال واثر خود باطنی معنی کی شہادت نہ دے، اس میں عموماً بڑی بے اعتدالی برتی جاتی ہے، معنی پرستوں کو مجازمیں بھی حقیقت کا جلوہ نظر آتا ہے، اور ظاہر میں

نگاہوں سے حسنِ حقیقت بھی مستور رہتا ہے، جس طرح عاشقانہ اشعار میں تصوف کے معنی پہنانا مضحکہ انگیز ہے، اسی طرح یکسر اس سے انکار بھی کچھ کم بدمذاقی نہیں ہے، جب یہ تسلیم ہے کہ شاعری جذبات کا آئینہ ہے، تو ہر انسان میں سفلی جذبات کے ساتھ کبھی کبھی علوی جذبات بھی پیدا ہوتے ہیں کیسا ہی رند شاہد باز کیوں نہ ہو اس کی روح کبھی نہ کبھی عارضی طور سے سہی اصل مرکز کی طرف ضرور متوجہ ہوتی ہے اور وہ اپنی ہوسناکی کی داستان کی طرح اس کیفیت کو بھی اپنی زبان میں ادا کر دیتا ہے، یہ ضرور نہیں کہ کہنے والا صوفی یا اہل دل ہی ہو، نظیر اکبر آبادی، ناسخ، امانت اور داغ کا کلام بھی ایسے اشعار سے خالی نہیں۔

نفس شاعری کی عظمت و بلندی کے نقطۂ نظر سے صوفیانہ تخیل شاعری کی روح ہے، یہ ضروری نہیں کہ ہر شعر میں تصوف کا کوئی نکتہ ہو لیکن مجموعی حیثیت سے کلام بادۂ عرفاں سے خالی نہ ہونا چاہیے، ورنہ وہ ایک نشۂ بے کیف ہو گا، عارفانہ تخیل سے کلام سدرۃ المنتہیٰ تک پہونچ جاتا ہے، اردو شعرا میں خواجہ میر درد، اثر، غالب اور دوسرے بعض اکابر شعرا کے کلام کی گرمی، اثر و کیف اسی وادی ایمن کی شرر باریوں کا نتیجہ ہے اس مرد سالک کی بعض باطنی کیفیتیں اور واردات ملاحظہ ہوں۔

تعین سے منزہ شوخیاں ہیں ان کے جلوہ کی
ہماری وسعتِ دل میں بنا رے لامکاں رکھ دی

کتنے کعبے ملے رستے میں کئی طور ملے　　ان مقامات سے لیکن وہ بہت دور ملے

تیرے نظارہ نے مجھ کو نہ کہیں کا رکھا
جلوۂ یار کہاں تو نے کیا گم مجھ کو ،

بے خودی، گم گشتگی، سُکر و تحیّر، محویت
کچھ مقامات اور بھی پڑتے ہیں میخانے کے بعد

یہ ہوا ہے خدا جُدا کر کے رات دن بے خودی سی رہتی ہے
خلوت گہِ دل میں تم چُپکے سے جو آجاتے
پردہ میں سویدا کے کیا جانئے کیا ہوتا

نہیں ہے اور کوئی دوسرا مرے دل میں
ارے تو ہے تیری تمنّا نہیں ہے ،

چشم و دل ہیں مقام خلوت کے آدُپر دے پڑے ہیں غفلت کے
حضرت مجذوب فرماتے ہیں :-

ہر تمنّا دل سے رخصت ہو گئی اب تو آجا اب تو خلوت ہو گئی
فلک تک لے گئی آہِ رسا مجھ کو یہ کہہ کہہ کر
اب ان کا بام آتا ہے اب ان کا بام آتا ہے

اٹھانے نہیں دیتے سر مجھ کو سجدے
کہاں جائیں اُٹھ کر ترے آستاں سے

خاک کس کی ہے، یہ نقش کفِ پا کس کے ہیں
ناتواں ہم سے جو گھرتے ہیں تو سو جاتے ہیں

طور سے پہلے بھی دیکھا ہے تجھے کان ہیں کچھ آشنا آواز سے

تو درونِ خانہ بردنِ در، تو ہزاروں پردوں میں جلوہ گر
ارے یا حقیقت پردہ در تری شوخیاں ہیں مجاز میں

ترے سجدے میں وہ مزا ملا کہ تڑپ کے سینہ میں آرہا
کوئی داغ ہے کہ ہے دل مرا یہ مری جبین نیاز میں

کلام ریاض کے عیوب اور اُس کی بے اعتدالیاں

اوپر جو کچھ دکھایا گیا وہ کلام ریاض کے محاسن اور اس کا دلکش رُخ تھا، تنقید نگاری کا تقاضا یہ ہے کہ ان کے عیوب پر بھی سرسری نظر ڈال لی جائے، اس سے مراد فنی خامیاں نہیں ہیں اس لحاظ سے ان کا کلام منزہ عن الخطا ہے، وہ اس دور کے استاد کامل تھے، ان کے کسی شعر میں اس نوع کی کوئی خامی نہیں دکھائی جا سکتی، بلکہ اس سے مراد تخیل و طرز ادا کی بے اعتدالی اور اس دور کی شاعری کے دوسرے نقائص ہیں۔

ریاض کمال فن کے ساتھ خوش مذاق بھی تھے، لیکن جس دور اور جس اسکول کے وہ شاعر تھے، اس میں تخیل کا ابتذال، جذبات کی عریانی، معاملہ بندی، خارجی اوصاف کی مصوری، الفاظ کی رکاکت، صنائع لفظی اور اس قبیل کی دوسری باتیں شاعری کے حقیقی اجزا اور عناصر بلکہ کمالِ شاعری سمجھی جاتی تھیں، اس لیے ریاض خوش مذاقی کے باوجود ان عیوب سے اپنا دامن بچا نہ سکے، اور کم و بیش ان سب کی مثالیں ان کے کلام میں موجود ہیں، اور تخیل اور جذبات کی تو ایسی عریاں تصویریں ہیں کہ انھیں جلوت کیا خلوت میں بھی دیکھنا مشکل ہے، لیکن تھے وہ خوش مذاق، اس لیے دور آخر کی

لکھنؤ کی شاعری کی طرح ان کا کلام پھیکا اور بدمزہ نہیں پایا ہے اور ان خامیوں کے باوجود ان کا قدم شاعری کے دائرہ سے باہر نہیں نکلا ہے، وہ پھکڑ بھی بکتے ہیں، تو اس رنگین نوائی کے ساتھ کہ سننے والا ناگواری کے ساتھ ساتھ لطف اندوز بھی ہوتا ہے۔

بہرحال اگرچہ ایک ناخوشگوار فرض ہے اور ان کی شاعری کا لطیف و دلکش رُخ دکھانے کے بعد تاریک پہلو دکھاتے ہوئے تکلیف ہوتی ہے، لیکن اگر اسے قلم انداز کر دیا جائے تو ان کے کلام کا ایک رُخ نگاہوں سے مخفی رہ جائے گا، ان کی شاعری کا یہ رُخ اتنا غیر معتدل ہے کہ اس کی سُتھری سی سُتھری مثال بھی غالباً سنجیدہ طبائع پر بار ہوگی، بہرحال اس بدمنظر رُخ کی بھی ایک جھلک دیکھ لی جائے۔

تخیل کی پستی اور ابتذال ان کے کلام میں تخیل کی پستی اور ابتذال کی بکثرت مثالیں ہیں نمونۃً صرف چند مثالیں پیش کی جاتی ہیں۔

سو رہتے ہو روتے نہیں اب جان کو اس کی
اب غیر کے گھر رات کو ماتم نہیں ہوتا

پاپوش ان حسینوں کی آتی ہے مرے گھر
ان کی نظر میں کچھ مری اوقات بھی تو ہو

دعوت تھی رقیب کی مرے گھر جوتی میں دال کیا بٹی ہے

بے طرح ٹوٹتے ہیں دیکھتے ہی دور سے
تم نے اچھا سگِ درباں کو لگا رکھا ہے

مل جائے جس کسی کو وہی لالوں لال ہے

کیا چیز ان حسینوں کے مُنھ کا اُگال ہے

ہم کو مل جائیں تو آجائے مزا   اچھے معشوق اور سستے دام کے

لیلےٰ پکاری جامے سے باہر ہوا جو قیس

یہ بے حجابیاں مرے محمل کے سامنے،

برابر میری تربت کے کیا ہے دفن دشمن کو

یہ اچھا میرے حصہ میں جہنم کا عذاب آیا

بوسہ لینے میں یہ سمجھے ہم گلوری ہے دبی

گالیاں لاکھوں بھری تھیں بھولے بھولے گال ہیں

وہ شب کا خواب ہم کو یاد آئے   تمھاری بات کہہ دیں گے تم ہی سے

معاملہ بندی اور خارجی مصوری | معاملہ بندی اور خارجی اوصاف کی مصوری کے

نمونے اس سے بھی زیادہ عریاں ہیں، ناظرین انھیں بھی سُن لیں:۔

مسکی ہوئی محرم ہے کوئی آنکھ نہ ڈالے

آنچل سے چھپالے ارے آنچل سے چھپالے

آنچل ڈھلا رہا مرے مستِ شباب کا

اُوڑھا گیا کبھی نہ دوپٹہ سنبھال کے

جو مجھ کو گدگدائے وہ...... کسی کا ہے،

جو تجھ کو گدگدائے وہ میری نگاہ ہے،

جو گونج اٹھی بالوں میں جھنجھلا کے بولے   لگے پیار کو آگ ابھی کان جاتا

کہنا کسی کا ہائے وہ جھنجھلا کے ناز سے
کم بخت ہاتھ چھوڑ کوئی دیکھتا نہ ہو

تھی آج ہاتھ پاؤں میں مہندی لگی ہوئی
موقع بہت بُرا یہ تری بے کسی کا تھا

مرے ہاتھ سے پہننا انھیں اور بار ہوتا
مگر اور بھی لچکتی جو گلے کا ہار ہوتا

اڑی ہیکل کو چوم سے لے گئی وہ چیز جو کچھ اٹھی اٹھی ہے
ان کے آنچل میں ادا بن کر قیامت چھپ چکی

وہ مری جانی ہوئی وہ میری پہچانی ہوئی
اس طرح کہ گھسن گرد کوئی چھپا گل کا نہ بوسے

جب جسم سے چاہیں گود میں چپکے سے اٹھا لے
ڈر ہے نہ دوپٹہ کہیں سینہ سے سرک جائے

پنکھا بھی ہیں پاس سے جھلنے نہیں دیتے
کہتے ہیں یا جان پڑ گئی آفت ہے یہ وصل

مل دل کے دکھ دیا ہے اچھا یہ پیار ہے
چھپا کر دل کو تم نے رکھ لیا نازک سے حرم میں

بہت نازک ہے شیشہ جس نے کھائی چوٹ پتھر کی
جوانی بھی ہوا کرتی ہے دیوانی مثل سچ ہے

وہ برساتے ہوئے چلتے ہیں پتھر اپنے .... سے

یہ بت ہاتھ آئیں تو ہیں نرم و نازک — شوالا جو ان کو تو پتھر کے نکلے

یہ اس رنگ کے مہذب اشعار کی مثالیں ہیں۔

رعایت لفظی و معنوی

لفظی و معنوی رعایت لکھنؤ کے شعرا کی خاص خصوصیت تھی وہ اس دھن میں شاعری کی مٹی پلید کر دیتے تھے، ان کی شاعری الفاظ کا گورکھ دھندا ہو کر رہ گئی تھی، ریاض کے یہاں بھی اس کی مثالیں ہیں، لیکن ان کی خوش مذاقی ان کا قدم شاعری کے دائرہ سے باہر نہیں نکلنے دیتی، چند مثالیں ملاحظہ ہوں:—

دامن کے ٹکڑے دل کو وہ چوٹی میں دیں جگہ،
اب عرش پہ تو ان سے چڑھایا نہ جائے گا

پاؤں کا آگے بڑھانا مجھ کو دوبھر ہو گیا
دیکھ کر تیر پہ سب جو دل حفظ مرے تیر ہو گیا

سر تربت بھی گھوڑے پہ ہوا کے وہ سوار آئے
قیامت ہم عناں آئی نہ دشمن ہم رکاب آیا

گالیاں دیں نامہ بر کو تلخ تلخ — حسن پوچھو زہر تھا پیغام میں

مرا پانی بھریں یہ بجلیاں کالی گھٹا والی
جو دیں کانوں کی اپنے زلفوں والے بجلیاں مجھ کو

مسی مل کے منہ آ رہے ہیں وہ اس پر
زباں سے نہ کچھ آج سوسن کے نکلے

کہا سوسن کو جو کچھ منہ میں آیا — بڑی منہ پھٹ یہ مسی کی دھڑی ہے

میں اپنے خون کا بیڑا اُٹھاؤں خود کیو نکر،
وہ پان دیتے ہیں شوخی سے مسکرا کے مجھے
کیوں کوستے ہو آگ لگے رنگِ حنا کو
میں چوموں جواب ہاتھ پڑیں ہونٹوں میں چھالے

الفاظ کا ابتذال | ان کا کلام الفاظ کے ابتذال سے بھی خالی نہیں ہے، لیکن زبان پر ان کو غیر معمولی قدرت حاصل ہے، اس لیئے وہ اس کے استعمال سے ایک لطف پیدا کر دیتے ہیں، چند مثالیں ملاحظہ ہوں :-

واعظ شراب خانہ میں کھولے گا کیا زباں
ہم خوب جانتے ہیں وہ ترا ہے تھا ان کا
شریکِ شکارِ لب جو تھا ناصح مجھے قانا اسے رو غنِ قاز دینا
نہ جھوٹ بول کہ ہم شام سے کل آئیں گے
نہ کھا قسم ارے جھوٹے کبھی جو تو آئے
جُل دیا کرتے ہیں دن رات حسینوں کو ریاض
بڑی نٹ کھٹ بڑی چنچل ہے طبیعت میری

سرود زندگی

حضرت اصغر اردوان کی شاعری باذاق اور سخن فہم حلقہ میں بیگانہ نہیں وہ دورِ جدید کے ان مشاطگانِ سخن میں ہیں جنھوں نے "لیلائے تغزل" کے بکھرے ہوئے گیسوؤں کو سنوارا ہے اور اس کے دلفریب جمال کو جس کا پرانا اور دقیانوسی سامان زینت جمال شاعری کے ساتھ ارباب نظر کی نگاہوں کو بھی مجروح کر رہا تھا، جدید طرز سے آراستہ اور نئے آب و رنگ سے نکھار کر ارباب نظر کی محفل میں آنے کے قابل بنایا۔

آج سے دس سال پیشتر ان کا پہلا اسم بامسمےٰ دیوان "نشاط روح" ارباب ذوق سے خراج تحسین حاصل کر چکا ہے، ٹھیک دس سال کے بعد انھوں نے دوسرا دیوان "سرود زندگی" ارباب نظر کے سامنے پیش کیا ہے، یہ مختصر دیوان چھوٹی تقطیع کے ۱۰۲ صفحات پر مشتمل ہے، شروع میں مصنف کا ایک مختصر دیباچہ ہے، جو ان کے علوئے نفس اور بلند نظری کا آئینہ دار ہے اس کے بعد ہندوستان کے مشہور باذاق سر تیج بہادر کے قلم کا لکھا ہوا دس صفحات کا ایک مقدمہ ہے، جس میں انھوں نے اجمالاً معیار شاعری پر بحث کر کے حضرت اصغر کی شاعری کو اس پر منطبق کیا ہے، یہ مقدمہ دلچسپ اور بعض حیثیتوں سے مفید بھی ہے۔ آخر میں امام الہند مولانا ابو الکلام آزاد کی ایک مختصر تقریظ ہے۔

"سرودِ زندگی" پہلا دیوان بلکہ غالباً پہلی کتاب ہے، جسے مولانا کی تقریظ کا طرۂ افتخار حاصل ہوا ہے، دیوان کی اشاعت سے پہلے مولانا کے "مقدمہ" کی شہرت سن کر اس کے دیکھنے کا حیرت آمیز اشتیاق پیدا ہوا تھا کہ مولانا کے پُربہار قلم نے معلوم نہیں کیا کیا گلکاریاں کی ہوں گی، اور اُردو میں شاعری کی جانچ کے لئے حالی کے مقدمہ شعروشاعری، اور ڈاکٹر عبدالرحمٰن مرحوم بجنوری کے مقدمۂ دیوان غالب کے بعد ایک اور معیار قائم ہو جائے گا لیکن دیوان دیکھنے کے بعد معلوم ہوا کہ اس شہرت کی حیثیت اشتہار سے زیادہ نہ تھی، اور مولانا نے حسب معمول اس معاملہ میں بھی اپنی انفرادیت اور امتیازی شان قائم رکھی ہے، جس کا اندازہ ذیل کے اقتباس سے ہوگا، فرماتے ہیں:—

"احباب میری کوتاہ قلمی سے بے خبر نہیں، خصوصاً تقریظ کے معاملہ میں، لیکن بعض تقاضے ایسے ہوتے ہیں، جن کی تعمیل کرنی ہی پڑتی ہے......... اگر یہ تقاضا صاحب کلام کا ہوتا تو میں حسب معمول معذرت کر دیتا، لیکن خود کلام کا تقاضا ہے، اور اس کے لئے میرے پاس کوئی معذرت نہیں، کئی سال کی بات ہے، انھوں نے (اصغر) اپنے کلام کا پہلا مجموعہ جو نشاط روح کے نام سے شائع ہوا تھا، مجھے بھیجا تھا اس وقت تک ان کا کلام میری نظر سے نہیں گزرا تھا، چونکہ وقت کی عام ادبی سرگرمیوں کی طرف سے طبیعت مایوسی کی عادی ہو چکی تھی، اس لئے میں نے بے دلی کے ساتھ مجموعہ اُٹھایا اور چاہا کہ ورق گردانی کرنے کے بعد رکھ دوں، لیکن اب مجھے اس اعتراف میں تامل نہیں

کہ جوں ہی دو چار شعر نظر سے گزرے، میں چونک اٹھا، اور جوں جوں مطالعہ کرتا گیا، میری تعجب انگیز مسترت بڑھتی گئی، میں نے محسوس کیا کہ وقت کی عام مایوسیاں مستثنیات سے خالی نہیں۔

میری نگاہ نکتہ چینی میں کمی نہیں کرتی، میں معیار کی پستی پر اپنے کو کسی طرح راضی نہیں کر سکتا، اہل فن کو مجھ سے خوش گمانی کی نہیں بدگمانی کی شکایت ہے، تاہم میں محسوس کرتا ہوں، جس شاعر کے کلام میں حسب ذیل اشعار موجود ہوں، اُس کی شاعری کی وقعت بحث و اثبات کی محتاج نہیں ہو سکتی۔

ان سطور کی نگارش سے مقصود انتقاد و تبصرہ نہیں ہے: اس کام کے لئے اور لوگ موجود ہیں، مقصود یہ ہے، کہ اپنا تاثر ظاہر کر دوں، محاسن کا حق ہے، کہ ان کی شہادت دی جائے، میں نے اصغر صاحب کے کلام میں حسن و خوبی پائی، میرا فرض تھا کہ اس کی شہادت دوں"

میں نے چند پیراگراف کے علاوہ قریب قریب کل تقریظ نقل کر دی ہے، اس سے اندازہ ہوگا کہ مولانا تقریظ نگاری کے فرض سے کس خوش اسلوبی کے ساتھ عہدہ برا ہوئے ہیں، جو ان کا مخصوص کمال ہے، لیکن ان کے قلم سے یہ سند تصدیق بھی بہت ہے۔

اس کے بعد اصل دیوان شروع ہوتا ہے، جو چھوٹی تقطیع کے ۱۰۲ صفحات میں ہے، ابتدا میں دو ایک نظمیں ہیں، اس کے بعد غزلیں، پھر ناتمام غزلیں اور

متفرق اشعار ہیں، آخر کے چند صفحات میں فارسی کا کلام ہے، دیوان کی ترتیب جدید مذاق کے مطابق ردیف وار کے بجائے زمانی ہے، اس سے یہ فائدہ ہوتا ہے کہ پڑھنے والے کو شاعر کی تدریجی ترقی کا پورا اندازہ ہو جاتا ہے۔

کلام اصغر کی خصوصیات اور قدیم و جدید کلام کا فرق

اصغر صاحب کے کلام کی خاص خصوصیت اور ان کا امتیازی وصف جو انھیں دوسرے شعرا سے ممتاز کرتا ہے، ان کا تصوف اور فلسفہ آمیز تغزل ہے جو بیشتر اشعار میں نظر آتا ہے، اگرچہ اس وصف سے ان کے کسی دور کا کلام خالی نہیں، لیکن ان کا پہلا کلام اس دور نشاط کے تاثرات کا نتیجہ ہے، جبکہ ہر جلوہ زیبا جنت نگاہ اور ہر نغمہ رنگین فردوس گوش اور ہر خیال عشق کا بیان اور حسن کی تفسیر ہوتا ہے اور فضائے عالم میں ہر طرف رنگینی و مستی چھائی ہوئی نظر آتی ہے، ولولوں اور جذبات میں طوفان کا جوش و خروش ہوتا ہے، اس لئے نشاط روح میں رنگینی و سرمستی اور کیف و سرور کا وفور ہے لیکن اس نشیلی اور مے بار فضا سے بھی شراب حقیقت کے قطرات ٹپکتے نظر آتے ہیں۔

اور سرود زندگی اس عہد کا کلام ہے، جب کہ جذبات کا طوفان تھم جاتا ہے جوش و خروش کی جگہ فکر و تدبر لے لیتے ہیں، نگاہیں ظاہری آب و رنگ سے گزر کر حسن حقیقت کی تلاش میں لگ جاتی ہیں، اس لئے سرود زندگی میں پختگی ہے، گہرائی ہے، فکر و تدبر ہے، بیان حقیقت ہے، اخلاق ہے، فلسفہ ہے، تصوف ہے، غرض اس سرود کے تمام نغمے لاہوتی ہیں، اگرچہ کہیں کہیں مجاز کا رنگین حجاب بھی نظر آتا ہے، لیکن وہ اتنا لطیف اور ہلکا ہے کہ اندر سے

حسنِ حقیقت صاف جھلکتا دکھائی دیتا ہے، لیکن جیسا کہ آگے چل کر معلوم ہوگا ان تمام محاسن کے باوجود بڑا حصہ جذبات کی بے ساختگی سے خالی ہے، اور خیال آفرینی کا غلبہ ہے، بہرحال پہلے اُن کا حقیقی رنگ ملاحظہ ہو۔

رنگِ تصوّف :-

مجاز کا بھی حقیقت سے راز رہنے دے
یہ راز ہے تو اُسے حُسن راز رہنے دے

لفظ پرست اس راز کے محرم نہیں۔

نوائے راز کا سینہ میں خون ہوتا ہے
ستم ہے لفظ پرستوں میں گھر گیا ہوں میں

ابھی ظاہر پرست ان خیالات کے متحمل نہیں۔

زمانہ آرہا ہے جب اُسے سمجھیں گے سب اصغر
ابھی تو آپ خود کہتے ہیں، خود تنہا سمجھتے ہیں

اس مقامِ حقیقت اور راہ سلوک کے مختلف احوال و کوائف ہیں، حُسنِ حقیقت کی مختلف کیفیتیں ہیں، سالک پر مختلف اور بعض مرتبہ متضاد حالات گزرتے ہیں، سالکین کے خاص خیالات و معتقدات و مصطلحات ہیں، اصغر نے ان تمام احوال و کوائف اور صوفیانہ نکات کو نہایت کامیابی اور دل آویز طریقے سے بیان کیا ہے، مقامِ سلوک وہ ہے، جہاں خود سالک کا بھی گزر نہیں، اس راہ میں قدم رکھنے کے بعد قیل و قال اور وجد و حال سب ختم ہو جاتے ہیں۔

اب نہ وہ قیل و قال ہے اب نہ وہ وجد و حال ہے
میرا مقام ہے وہاں میرا جہاں گزر نہیں،

اس مقام خلوت کے ماجرے اور راز و نیاز کفر و ایمان کی سرحد ادراک سے ماوراء ہیں۔

ہوئے جو ماجرے خلوت سرائے راز میں اس سے
نہ کفر اس سے ہوا واقف خبر اس کی نہ ایماں کو

یہاں پہونچ کر قلب و دماغ، خیال و نظر سب پر مطلوب ہی مطلوب چھا جاتا ہے، اور سارے امتیازات مٹ جاتے ہیں۔

سما گئے مری نظروں میں چھا گئے دل پر
خیال کرتا ہوں ان کو کہ دیکھتا ہوں میں

نظر و منظر کچھ بھی باقی نہیں رہتا، بس ایک محویت رہ جاتی ہے۔

اب نہ کہیں نگاہ ہے، اور نہ کوئی نگاہ میں
محو کھڑا ہوا ہوں میں حسن کی جلوہ گاہ میں

جمال مطلوب اور خیال مطلوب کے علاوہ خود اپنا ہوش بھی باقی نہیں رہتا۔

ترا جمال ہے تیرا خیال ہے تو ہے
مجھے یہ فرصت کاوش کہاں کہ کیا ہوں میں

اس عالم بے خودی میں بس ایک سجدۂ شوق کی بے قراری رہ جاتی ہے سر نیاز اور آستان ناز کی بھی خبر نہیں رہتی۔

بے خودی کا عالم ہے محو جبہہ سائی ہوں
اب نہ سر سے مطلب ہے اور نہ آستانے سے

جلوۂ بے رنگ کی نمود سے حسنِ حقیقت کا چہرہ بھی نہیں پہچانا جاتا۔

نمودِ جلوۂ بے رنگ سے ہوش اس قدر گم ہیں
کہ پہچانی ہوئی صورت بھی پہچانی نہیں جاتی

صرف اتنا اڑا اڑا سا خیال آتا ہے۔

ازل میں اک تجلی سے ہوئی تھی بے خودی طاری
تمہیں کو میں نے دیکھا تھا بس اتنا یاد آتا ہے

لیکن پھر چشم حقیقت نگر تمام حجابوں کو چاک کر ڈالتی ہے، اور سازِ روح نغمہ سرا ہو جاتا ہے۔

بے محابا فروغ روئے جاناں دیکھئے
فکرِ ایماں کیا نظر سے عینِ ایماں دیکھئے

حسنِ حقیقت مجاز کے پردوں میں نظر آتا ہے۔

مے بے رنگ کا سو رنگ سے رسوا ہونا،
کبھی مے کش کبھی ساقی کبھی مینا ہونا

دیدۂ بینا، فروغ بادۂ حسنِ بتاں
ہر طرف پھیلا ہوا ہے، نورِ عرفاں دیکھئے

روزِ روشن، یا شبِ مہتاب، یا حسنِ چمن
ہم جہاں سے چاہتے، وہ روئے زیبا دیکھتے

جن پردوں میں وہ نظر آتا ہے، ان کی رنگینی اور تابانی کا عجیب عالم ہوتا ہے

ردائے لالہ و گل پردۂ مہ و انجم،

جہاں جہاں وہ چھپے ہیں عجیب عالم ہے

کبھی خود پاک نظر دیکھنے والا، احترام حسن میں مجازی کا پردہ ڈال لیتا ہے۔

کہہ کے کچھ لالہ و گل رکھ لیا پردہ میں نے

مجھ سے دیکھا نہ گیا حسن کا رسوا ہونا،

حسنِ حقیقت کا رنگ کچھ پردۂ مجاز ہی میں دلآویز نظر آتا ہے۔

جان کر رکھا ہے کچھ ہم نے حجاب دھر کو

توڑ کر شیشہ کو پھر کیا رنگِ صہبا دیکھتے

حسنِ حقیقت کی بے حجابی حجابِ نظر بن جاتی ہے۔

یہ جلوہ کی فراوانی یہ ارزانی یہ عریانی

پھر اس شدت کی تابانی کہ ہم پردہ سمجھتے ہیں

ہوں کامیاب دیدہ بھی محرم دید بھی،

جلووں کے اژدحام نے حیراں بنا دیا،

یہ تخیل کس قدر لطیف اور پاکیزہ ہے کہ نظارہ کی کامیابی ذوقِ نظر کی بربادی ہے۔

سمائے جا رہے ہیں اب وہ جلوے دیدۂ و دل میں

یہ نظارہ ہے یا ذوقِ نظر برباد ہوتا ہے

جو کچھ ہم دیکھتے ہیں وہ سب ظاہری آب و رنگ کا فریب ہے، حقیقت کی

کسی کو خبر نہیں۔

چمک دمک پہ مٹا ہوا ہے یہ باغباں تجھ کو کیا ہوا ہے

فریب شبنم میں مبتلا ہے، چمن کی اب تک خبر نہیں ہے

اس میکدۂ عالم میں بے خبری ہی چاہیئے، باخبری اور ہوش معصیت ہے۔

یہاں میں ہوں نہ ساقی ہے نہ ساغر ہے نہ صہبا ہے

یہ میخانہ ہے، اس میں معصیت ہے باخبر ہونا،

اس بے خبری اور بے ہوشی کی وجہ سے ساز اور آواز کی تمیز بھی

باقی نہیں رہتی۔

ہوش باقی ہوں تو اس پر کاوش بے جا بھی ہو

کیا خبر مجھ کو کہ یہ آواز ہے، یا ساز ہے

لیکن اس بے خبری اور بے ہوشی میں بھی ساقی کی محفل دیکھنے والے

کچھ باخبر ہیں، جو خطِ ساغر میں حق و باطل کا امتیاز کر لیتے ہیں۔

خطِ ساغر میں رازِ حق و باطل دیکھنے والے

ابھی کچھ لوگ ہیں ساقی کی محفل دیکھنے والے

ساقی نے مے صافی عنایت کی تھی، خود ہمارے پیمانے نے اس کو

لون و رنگ سے مکدر کر دیا ہے۔

میرے ساقی نے عنایت کی مے بے درد و صاف

رنگ جو کچھ دیکھتے ہو میرے پیمانہ میں ہے

اگر اس تخیل کے ساتھ وہ حدیث پیش نظر رکھی جائے کہ خدا نے تمام

انسانوں کو دینِ فطرت پر پیدا کیا تھا، ان کے والدین نے ان کو یہودی اور نصرانی بنا لیا تو یہ ایک لطیف تلمیح ہو جاتی ہے، دماغی علم و حکمت سے عقدہ کشائی نہیں ہوتی، اس کے لئے میخانۂ دل چاہیئے۔

گوشہ گوشہ علم و حکمت کا ہے سب چھانا ہوا،
یہ غنیمت ہے، درِ مے خانہ اب تک باز ہے

خرد کے سامنے حجابِ عالم ہے اور نگاہِ عشق بے پردہ دیکھتی ہے۔

نگاہِ عشق تو بے پردہ دیکھتی ہے اُسے،
خرد کے سامنے اب تک حجابِ عالم ہے

ایمان کی بسیط حقیقت کفر ہے، اور کیونکہ کفر ہی میں قیود لگانے سے ایمان بنتا ہے۔

اے شیخ وہ بسیط حقیقت ہے کفر کی
کچھ قیدِ رسم نے جسے ایمان بنا دیا

کسی قدر ترمیم کے ساتھ یہ تخیل غالبؔ کے اس شعر سے ماخوذ ہے،

ہم موحّد ہیں ہمارا کیش ہے ترکِ رسوم
ملّتیں جب مٹ گئیں اجزائے ایماں ہو گئیں

کفر و ایمان کی فرسودہ رسم اربابِ نظر کے شایاں نہیں۔

رسم فرسودہ نہیں شایانِ اربابِ نظر
اب کوئی منظر بندہ از کفر و ایماں دیکھئے

یہ تخیل کس قدر حقیقت میں ڈوبا ہوا ہے۔

دوزخ بھی ایک جلوۂ فردوسِ حسن ہے
جو اس سے بے خبر ہیں وہی ہیں عذاب میں

بعض عرفا کا یہ خاص مسلک ہے۔
حرم نشینوں پر سکون مطلق طاری ہے اور صنم کدۂ دل میں تجلیوں کی بارش ہو
بس اک سکوت ہے طاری حرم نشینوں پر
صنم کدے میں تجلی ہے، اور پیہم ہے

اسی سے نماز کی کیفیت میں جان پڑتی ہے۔
موجِ نسیمِ صبح میں بوئے صنم کدہ بھی ہے
اور بھی جان پڑ گئی کیفیتِ نماز میں
لیکن شیخِ حرم نشین کا تنگ ظرف اس کا متحمل نہیں ہو سکتا۔
صنم کدہ میں تجلی کی تاب مشکل ہے،
حرم میں شیخ کو محوِ نماز رہنے دے

کس قدر فلسفیانہ حقیقت ہے۔
اے کاش میں حقیقتِ ہستی نہ جانتا
اب لطفِ خواب بھی نہیں احساسِ خواب میں
بعض بعض غزلیں پوری کی پوری حقیقت میں ڈوبی

ہوئی ہیں:—
خدا جانے کہاں ہے اصغر دیوانہ برسوں سے
کہ اس کو ڈھونڈتے ہیں کعبہ و بتخانہ برسوں سے

تڑپنا ہے نہ جلنا ہے نہ جل کر خاک ہونا ہے
یہ کیوں سوئی ہوئی ہے فطرتِ پروانہ برسوں سے

کوئی ایسا نہیں یا رب کہ جو اس درد کو سمجھے
نہیں معلوم کیوں خاموش ہے دیوانہ برسوں سے

ترے قربان ساقی اب وہ موجِ زندگی کیسی
نہیں دیکھی ادائے لغزشِ مستانہ برسوں سے

کبھی سوز و تجلی سے اسے نسبت نہ تھی گویا
پڑی ہے اس طرح خاکستر پروانہ برسوں سے

مری رندی عجب رندی مری مستی عجب مستی
کہ سب ٹوٹے پڑے ہیں شیشہ و پیمانہ برسوں سے

حسینوں پر نہ رنگ آیا نہ پھولوں میں بہار آئی
نہیں آیا جو لب پر نعرۂ مستانہ برسوں سے

کھلی آنکھوں سے ہوں حسنِ حقیقت دیکھنے والا
ہوئی لیکن نہ توفیقِ درِ میخانہ برسوں سے

لباسِ زہد ہو پھر کاش نذرِ آتشِ صہبا
کہاں کھوئی ہوئی ہے جرأتِ رندانہ برسوں سے

جسے لینا ہو آکر اس سے اب درسِ جنوں لے لے
سنا ہے ہوش میں ہے، اصغر دیوانہ برسوں سے

تغزل | اصغر صاحب کا اصل ذوق عرفان و حقیقت اور فلسفہ و حکمت ہے، اور

انھوں نے ان مسائل کو جس کامیابی اور جس دل آویز طریقے سے ادا کیا ہے، اس کا اندازہ اوپر کے اشعار سے ہو گیا ہوگا، لیکن ان حقائق سے لطف اٹھانے والے مخصوص ارباب دل ہیں، ظاہر بیں نگاہوں اور عام تماشائیوں کے لیے عشق مجازی کی چاشنی اور ظاہری آب و رنگ کی نظر فریبی درکار ہے، بغیر اس کی آمیزش کے دل لذت گیر نہیں ہوتا، اصغر صاحب اس چمن کے بھی ایک خوش نوا نغمہ سرا ہیں، اور اپنی خوش مذاقی سے انھوں نے ایسے رنگ برنگ کے اور بوقلموں پھول کھلائے ہیں کہ ان کے کلام کا یہ حصہ تختۂ بہار نظر آتا ہے، لیکن ان پر تصوف کا رنگ ایسا چھایا ہوا ہے کہ مجاز و حقیقت میں امتیاز دشوار اور انھیں علٰحدہ کرکے دکھانا دشوارتر ہے، پھر بھی کچھ کلام کی رنگینی اور کچھ مذاق سلیم کی مدد سے ایک خیالی حد قائم کی جا سکتی ہے، انھوں نے اس رنگ میں بھی اتنا اور ایسا کہا ہے کہ اس سے پوری روداد عشق و محبت مرتب ہو سکتی ہے، عشق کا آغاز :-

وہ شوخ بھی مجبور ہے معذور ہوں میں بھی
کچھ فتنے اٹھے حسن سے کچھ حسن نظر سے

عشق و محبت کی وسعت و ہمہ گیری :-

نشۂ عشق میں ہر چیز اڑی جاتی ہے
کون ذرہ ہے جو سرشار محبت میں نہیں

عشق کی عظمت :-

دیکھا ہے کوہ طور کو بھی فرش خاک پر
افتادگیٔ عشق اگر نارسا نہ ہو

عشق کی تمنا :-

قلب پر گرتی تڑپ کر پھر رہی برق جمال

ہر بنِ مو سے رہی آشوب و غوغا دیکھتے

حسنِ تخیل :-

کم سے کم حسنِ تخیل کا تماشا دیکھتے

جلوۂ یوسف تو کیا خوابِ زلیخا دیکھتے

التجائے خلوت :-

خبر کسی کو نہ ہو گی کنارِ شوق میں آ

جہاں میں چشم دو دھر باز رہنے دے

تمنائے جذبِ شوق :-

اس طرح کچھ رنگ بھر جاتا نگاہِ شوق میں

جلوہ خود بیتاب ہو جاتا وہ پردہ دیکھتے

جوشِ تمنا :-

رقصِ ہستی دیکھتے جوشِ تمنا دیکھتے

سامنے لا کر تجھے اپنا تماشا دیکھتے

جذبِ عشق کا اثر :-

اشک اب نہیں تھمتے دل پہ اب نہیں قابو

خود کو آزما بیٹھے مجھ کو آزمانے سے

حسن کی لگاوٹ :-

پرورش پاتا ہے رگ رگ میں مذاقِ عاشقی
جلوہ پھر دکھلائیے پھر مجھ سے پردہ کیجیے

التجائے جاں نوازی :-

تبسم کی ادا سے زندگی بیدار ہو جائے
نظر سے چھیڑ دے رگ رگ مری ہشیار ہو جائے

مشاہدۂ جمال :-

بہارِ جلوۂ رنگیں کا اب یہ عالم ہے
نظر کے سامنے حسنِ نظر مجسّم ہے

عالمِ تحیّر :-

وہ سامنے ہیں نظامِ حواس برہم ہے
نہ آرزو میں سکت ہے نہ عشق میں دم ہے

نیرنگیٔ حسن :-

نظر اس حسن پر ٹھہرے تو آخر کس طرح ٹھہرے
کبھی جو پھول بن جائے کبھی رخسار ہو جائے

قصورِ نظر :-

نظر وہ ہے کہ جو کون و مکاں کے پار ہو جائے
مگر جب روئے تاباں پر پڑے بے کار ہو جائے

حسنِ نظر :-

کھل گیا رنگِ حسیناں کھل گیا رنگِ چمن ،
کم سے کم اتنا نظر میں حسن پیدا کیجیے

ذوقِ بندگی :-

تم اس کافر کا ذوقِ بندگی اب پوچھتے کیا ہو
جسے طاقِ حرم بھی ابروئے خمدار ہو جائے

بہارِ نقشِ پا پر سجدۂ نیاز :-

کیا بہارِ نقشِ پا ہے اے نیازِ عاشقی
لطف سر رکھنے میں کیا سر رکھ کے مرجانے میں ہے

بے قراریٔ محبت :-

کسی طرح بھی تری یاد اب نہیں جاتی
یہ کیا ہے روزِ مسرت ہے یا شبِ غم ہے

انجامِ عشق :-

بے خودی میں دیکھتا ہوں بے نیازی کی ادا
کیا فنائے عاشقی خود عشق بن جانے میں ہے

حسن و عشق کا امتیاز پردۂ بے گانگی ہے :-

میں رازدارِ حسن ہوں تو رازدارِ عشق
لیکن یہ امتیاز بھی کیوں درمیاں رہے

نثارِ دوست :-

دونوں عالم تری نیرنگ ادائی کے نثار
اب کوئی چیز یہاں جیبِ محبت میں نہیں

تشبیہات :-

یوں مسکرائے جان سی کلیوں میں پڑ گئی
یوں لب کشا ہوئے کہ گلستاں بنا دیا
روشنی ہو جیسے جگنو کی جس طرح شبستاں میں
وہ نقاب کا عالم اس کے مسکرانے سے

خمریات | تغزل کا ایک لطیف جزو خمریات بھی ہے، خمریات کے معنی محض "مے پرستی" اور "بادہ نوشی" کے مضامین کے نہیں ہیں، بلکہ شاعری کی اصطلاح میں اس کا نہایت وسیع اور جامع مفہوم ہے، جس میں حسن وعشق کی کیفیات سے لے کر عرفان وحقیقت کے اسرار تک سب داخل ہیں، اگرچہ خمریات تغزل کا کوئی ایسا ضروری جزو نہیں ہے، جس کے بغیر وہ ناقص رہ جاتا ہو، لیکن جو شعراء اس بادہ کے ذوق شناس ہیں، خمریات بھی انکے کمال کا ایک بڑا معیار رہے ہے، قریب قریب ہر زبان میں کچھ نہ کچھ شعراء ایسے ہیں، جنھوں نے اس وصف خاص میں کمال پیدا کیا ہے، عربی میں ابو نواس، فارسی میں خیام و حافظ، اردو میں ریاض ہیں۔ خیام وحافظ کی مقبولیت کا سب سے بڑا راز یہی ہے کہ انھوں نے سلوک وتصوف کے بڑے بڑے مسائل کو شراب اور اس کے لوازم کی تشبیہات میں ادا کیا ہے، جس سے عام تماشائی اور ارباب نظر دونوں اپنے اپنے ذوق و نظر کے مطابق لطف اندوز ہوتے ہیں۔

اصغر بھی میکدۂ شیراز کے جرعہ کش ہیں، اس لیے انھوں نے حافظ کے اتباع میں حسن وعشق کی کیفیات اور تصوف کے مسائل و کوائف کو موج شراب کے پردہ میں بیان کیا ہے، اُن کی بادہ پیمائی اور جام ومینا کی تفسیر خود ان کی زبان

میں یہ ہے :-

عقل ہو غرقِ تجلّی روح پا جائے جِلا
بیٹھ کر اک لحظہ شغلِ جام و مینا کیجیے

ان کے میخانہ میں وہ تجلّی ہے کہ پینے سے زیادہ کھو جانے میں مزا ہے اور ان کا میخانہ اسرارِ حقیقت کا عقدہ کشا ہے۔

ایک ایسی بھی تجلّی آج مے خانہ میں ہے
لطف پینے میں نہیں ہے بلکہ کھو جانے میں ہے

گوشہ گوشہ علم و حکمت کا ہے سب دیکھا ہوا
یہ غنیمت ہے درِ مے خانہ اب تک باز ہے

ان کی مینائے مے کی نور افشانی کے سامنے آتشِ وادیِ ایمن بھی چھپ جاتی ہے۔

پتہ ملتا نہیں اب آتشِ وادیِ ایمن کا
مگر مینائے مے کی نور افشانی نہیں جاتی

ان کے جامِ رنگیں کی تجلّی سے زمین سے آسماں تک عالمِ انوار ہو جاتا ہے۔

تجلّی چہرۂ زیبا کی ہو کچھ جامِ رنگیں کی
زمیں سے آسماں تک عالمِ انوار ہو جائے

طوفانِ مے و جوشِ مستی :-

یہ بن کر برق و باراں دیکھیے کیا کیا غضب ڈھائے
خمِ گردوں سے موجِ مے اٹھی ہے کس قیامت کی

ہٹا کے شیشہ و ساغر ہجومِ مستی میں،
تمام عرصۂ عالم پہ چھا گیا ہوں میں

ساقی کے کرم سے دنیا جوان ہوتی ہے۔

بہارِ سبزہ و گل ہے کرم ہوتا ہے ساقی کا،
جواں ہوتی ہے دنیا میکدہ آباد ہوتا ہے

اصغر کی خمریات کی بہت سی کیفیتیں شرح و بیان کی متحمل نہیں ہو سکتیں بیان کی ٹھیس سے اس بادۂ صافی کا نازک شیشہ چور چور ہو جاتا ہے۔

ابھی یہ طرزِ مستی مجھ سے سیکھیں میکدے والے
نظر کو چند موجوں پر جما کر بے خبر ہونا

ہاتھ میں لے کے جام سے آج وہ مسکرا دیا
عقل کو سرد کر دیا روح کو جگمگا دیا،

یکایک توڑ ڈالا ساغرِ مے ہاتھ میں لے کر
مگر ہم بھی مزاجِ نرگسِ رعنا سمجھتے ہیں

اس رخ پہ ہے نظر کبھی جامِ شراب میں
آیا کہاں سے نورِ شبِ ماہتاب میں

کہاں خرد ہے کہاں ہے نظام کار اس کا
یہ پوچھتی ہے تری نرگسِ خمار آلود

ترے قربان ساقی اب وہ موجِ زندگی کیسی
نہیں دیکھی ادائے لغزشِ مستانہ برسوں سے

خمریات میں اصغر کا مذاق نہایت لطیف ہے، اس لئے اُنھوں نے بڑی نادر تشبیہیں پیدا کی ہیں۔

ساقیا جام بہ کف پھر ہو ذرا گرم نوا
حُسنِ یوسف، دمِ عیسٰے، یدِ بیضا دیکھیں

اُس نے دکھا دیا مجھے ساغرِ مے اُچھال کر
آج بھی کچھ کمی نہیں چشمکِ برقِ طور میں

موجوں کا عکس ہے خطِ جامِ شراب میں
یا خون اُچھل رہا ہے رگِ ماہتاب میں

میں اس ادائے مست خرامی کو کیا کہوں
میری نظر تو غرق ہے موجِ شراب میں

لذتِ الم گداز عشق اور سوزِ غم تغزل کی جان ہے، اسی سے روحِ شعری بیدار ہوتی ہے، لیکن سوز و گداز بھی گو الفِ عشق کی ابتدائی کیفیت ہے، اس کا بلند ترین درجہ لذتِ الم ہے، جب دل دردِ عشق سے ذوق یاب اور روح جراحتِ غم سے لذت گیر ہونے لگتی ہے، اس لئے ہم نے سوز و گداز کی پرانی اصطلاح کے بجائے اسے لذتِ الم سے تعبیر کیا ہے، اصغر کا دردِ عشق اسی منزل میں ہے، اس کی بہار رنگین بھی خزاں کی پروردہ ہے۔

ہے خستگی کے دم سے رعنائیِ تخیل
میری بہار رنگیں پروردۂ خزاں ہے

وہ اشک باری میں بھی مسکرائے جاتا ہے۔

مُسکرائے جاتا ہوں اشک بہتے جاتے ہیں
غم کا کام لیتا ہوں اشک کے ترانے سے

وہ لذت الم کے لئے خود آپ زخم لیتا ہے اور درد کے بہانہ سے مطلوب کو یاد کرتا ہے۔

زخم آپ لیتا ہوں لذتیں اُٹھاتا ہوں
تجھ کو یاد کرتا ہوں درد کے بہانہ سے

مستقل غم خود ایک کیفیت بن جاتا ہے اور درد کی لذت جاتی رہتی ہے اس لئے وہ تلخیِ غم کو قائم رکھنے کے لئے کبھی کبھی صہبائے خوشگوار بھی چاہتا ہے۔

صہبائے خوشگوار بھی یارب کبھی کبھی
اتنا تو ہو کہ تلخیِ غم بے مزہ نہ ہو

وہ درد کو متاعِ زیست سمجھتا ہے:۔

متاعِ زیست کو ہم زیست کا حاصل سمجھتے ہیں
جسے سب درد کہتے ہیں اُسے ہم دل سمجھتے ہیں

آلامِ روزگار کو آسان بنانے کے لئے انھیں غمِ جاناں بنا دیتا ہے۔

آلامِ روزگار کو آساں بنا دیا،
جو غم ہوا اُسے غمِ جاناں بنا دیا

کچھ تم کہو یہ کیا ہوا تم بھی تھے ساتھ ساتھ کیا
غم میں یہ کیوں سرور تھا درد نے کیوں مزا دیا

خوشا حوادثِ پیہم خوشا یہ اشکِ رواں
جو غم کے ساتھ ہو تم بھی تو غم کا کیا غم ہے

بلندیٔ اخلاق موجودہ شاعری پر سب سے بڑا اعتراض یہ ہے کہ وہ نہ صرف اخلاقی بلندی سے خالی ہے بلکہ پستی سکھاتی ہے، یہ اعتراض ایک حد تک صحیح ہے۔ ایک زمانہ تھا کہ شاعری تہذیبِ اخلاق کا سب سے بڑا ذریعہ تھی، اور شاعر معلمِ اخلاق سمجھا جاتا تھا، اگرچہ گزشتہ شعراء میں سعدی کے علاوہ کسی نے اصلاحِ اخلاق کو مستقل موضوع نہیں بنایا، لیکن ان کے دواوین اخلاقی اسباق سے خالی نہیں ہوتے تھے، اس دورِ جدید کے شعراء میں آزاد و حالی، اکبر اور اقبال نے اس کو مستقل موضوع بنا لیا، اصغر اگرچہ کوئی اخلاقی اور مصلح شاعر نہیں ہیں لیکن ان کا دیوان اخلاقی عناصر سے خالی نہیں ہے۔

خودداری :-

خود آپ اپنی آگ میں جلنے کا لطف ہے
اہلِ تپش کو آتشِ سینا نہ چاہیے

آزادی :-

بنا لیتا ہے موجِ خونِ دل سے اک چمن اپنا
وہ پابندِ قفس جو فطرۃً آزاد ہوتا ہے

کوتاہیٔ عمل گرفتاری ہے :-

یہاں کوتاہیٔ ذوقِ عمل ہے خود گرفتاری
جہاں بازو سمٹتے ہیں وہیں صیاد ہوتا ہے

عافیتِ کنجِ قفس موت ہے۔

مار ڈالے گی مجھے عافیتِ کنجِ قفس،
جوشِ پرواز کہاں جب کوئی صیاد نہ ہو

زندگی خطرات کی زندگی ہے:۔

یہاں تو عمر گزری ہے اسی موج و تلاطم میں،
وہ کوئی اور ہوں گے سیرِ ساحل دیکھنے والے

حوصلہ کی بلندی:۔

ابھرنا ہو جہاں جی چاہتا ہے ڈوب مرنے کو
جہاں اٹھتی ہیں موجیں ہم وہاں ساحل سمجھتے ہیں

اصغر کی خامیاں | یہاں تک جو کچھ لکھا گیا ہے، وہ اصغر صاحب کی شاعری کے صرف ایک پہلو یعنی محاسنِ شاعری کے متعلق تھا، تنقید کا تقاضا یہ ہے کہ ان کی خامیوں پر بھی ایک سرسری نظر ڈالی جائے، یوں تو خامیوں سے بڑے بڑے اساتذہ کا کلام بھی پاک نہیں، لیکن کسی کلام کی خوبی و خامی اور حسن و عیب کا اندازہ کلام کے مجموعی محاسن و معائب ان کی نوعیت اور کمی و زیادتی سے کیا جاتا ہے، اگر کسی بڑے شاعر کے کلام میں معمولی فروگزاشتیں ہیں، تو وہ چنداں لائقِ التفات نہیں، لیکن اگر فروگزاشتیں بڑھ کر لفظی اور معنوی خامیوں بلکہ اغلاط تک پہونچ جائیں تو وہ نظر انداز نہیں کی جا سکیں۔ ہم کو افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ اصغر صاحب کا کلام اس حیثیت سے ان کے مرتبۂ شاعری سے فروتر ہے اور اس میں الفاظ، معنی، طرزِ ادا

وغیرہ کی بڑی خامیاں ہیں، بعض بعض تو ایسے فاحش اغلاط ہیں کہ اصغر صاحب کی جانب انتساب کرنے کو جی نہیں چاہتا۔

ان کے موجودہ کلام کا سب سے بڑا عیب اور نقص جو ہر صاحب مذاق کو اول نظر میں نظر آتا ہے وہ جملوں کی بے ترتیبی، ترکیبوں کی ناہمواری اور طرز ادا کی خامی ہے، یہ گمان تو کیا نہیں جا سکتا کہ ان کو الفاظ کے انتخاب، ان کے دروبست، ترکیبوں کی نشست اور طرز ادا کی دلآویزی پر قدرت نہیں جبکہ ابھی چند ہی برس پہلے وہ بلاغتِ ادا کا بہترین نمونہ "نشاطِ روح" پیش کر چکے ہیں، لیکن اب معلوم نہیں اُن کا حسن پرست مذاق شعر کے حُسنِ ظاہری سے اس قدر بے گانہ اور بے نیاز کیوں ہو گیا ہے، حیرت ہوتی ہے کہ وہ رنگین نوا ساحر جس نے نشاطِ روح کو حُسنِ معنے کے ساتھ حُسنِ الفاظ کا بھی ایسا مرقع بنا دیا تھا، جس کی غزلیں آج بھی رنگینیٔ ادا اور دلکشیٔ بیان کے لحاظ سے خوشرنگ گلدستہ اور الفاظ کی مرصع کاری کی حیثیت سے عروسِ تغزل کا زیور معلوم ہوتی ہیں، اب اس قدر بے پرواہ کیوں ہو گیا کہ بعض اشعار میں بیان کی دلکشی تو کجا خیالات بھی مناسب الفاظ میں ادا نہیں ہو سکے ہیں، اور بیان کی ژولیدگی اور طرز ادا کی خامی کی وجہ سے ان کے بہت سے اشعار نہ صرف حُسنِ ظاہری سے محروم ہو گئے ہیں، بلکہ ان کے معنی نکالنا مشکل ہیں۔

دوسری خامی معنوی ہے، اس میں شبہ نہیں کہ جہاں تک خیالات کا تعلق ہے، اصغر صاحب نے نمایاں ترقی کی ہے، اب ان کے خیالات رفعت و بلندی اور لطافت و پاکیزگی کی معراجِ کمال تک پہونچ گئے ہیں، مگر اب اس

پرواز میں ان کا مُرغِ خیال کہیں کہیں بھٹک جاتا ہے، وہ ندرت خیال اور اسرار تصوف کی دھن میں کبھی کبھی ایسے خیالات بھی پیدا کرتے ہیں جن کا ان کے ذہن کے سوا اور کوئی وجود نہیں، اس میں شبہ نہیں کہ عارفانہ حقائق ان کی شاعری کا امتیازی وصف ہیں، لیکن اس کے یہ معنی نہیں کہ ہر ایسے پُرپیچ اور ذہنی خیال کو جس کی نزاکت معنی کی بھی متحمل نہ ہوسکے، تصوف کا کوئی دقیق نکتہ سمجھ لیا جائے محض صوفیانہ خیال یا صوفیانہ مصطلحات کی آمیزش سے کوئی "خیال محض" با معنی حقیقت نہیں بن سکتا، اس دقت پسندی کی وجہ سے اصغر صاحب کے بعض اشعار بالکل بے معنی ہوگئے ہیں، اور عرب کاہنوں کی نثر معلوم ہوتے ہیں، ان کے علاوہ اور جو خامیاں ہیں وہ انھیں دونوں کے ماتحت ہیں، بعض مثالیں ملاحظہ ہوں۔

وہ موت ہے کہ کہتے ہیں جس کو سکون سب
وہ عین زندگی ہے، جو ہے اضطراب میں

یہ شعر مطلب کے لحاظ سے بالکل درست ہے، اور اس میں ایک بلند خیال کا اظہار کیا گیا ہے، لیکن طرز ادا کی خامی نے سارا لطف بے مزہ کردیا لفظی عیب یہ ہے کہ "کہتے ہیں جس کو سکون سب" میں نہایت فاحش تنافر حروف ہے اور "عین" زائد ہے، معنوی اعتبار سے دونوں مصرعوں کا تقابل صحیح نہیں، یہ اس طرح درست ہوسکتا تھا۔

جو زندگی سکون میں گزرے وہ موت ہے
ہے زندگی وہی جو رہے اضطراب میں



ازل میں اک تجلی سے ہوئی تھی بے خودی طاری
تمہیں کو میں نے دیکھا تھا کچھ ایسا یاد ہوتا ہے

"یاد ہوتا ہے" صحیح نہیں "یاد آتا ہے" ہونا چاہیے، محض ردیف کی پابندی کی وجہ سے یہ تصرف کیا گیا ہے۔

ہے خرد کی، عشق کی دونوں کی ہستی پر نظر
یہ شہید نغمہ ہے، وہ مبتلائے ساز ہے

اس شعر سے یہ صاف نہیں معلوم ہوتا کہ شاعر خرد اور عشق کی تحقیر کرنا چاہتا ہے یا عشق کو خرد پر ترجیح دینا چاہتا ہے یا دونوں کی حقیقت بتانا چاہتا ہے، قیاس سے معلوم ہوتا ہے کہ دونوں کی حقیقت سے باخبر کرنا مقصود ہے کہ ایک شہید نغمہ ہے، دوسرا مبتلائے ساز ہے، لیکن "ہستی پر نظر" سے یہ مطلب واضح نہیں ہوتا، اسے یوں کہنا چاہیے، ع ہے خرد اور عشق دونوں کی حقیقت پر نظر۔ اس سے ایک مصرعہ میں تین تین "کی" کے اجتماع کا عیب بھی جاتا رہے گا۔

طور پر لہرا کے جس نے پھونک ڈالا طور کو
اک شرار شوق بن کر میرے آب و گل میں ہے

اس شعر میں اولاً پہلے مصرع میں دو مرتبہ طور کی تکرار کچھ اچھی نہیں معلوم ہوتی دوسرے اس میں ایک گزرے ہوئے واقعہ کی طرف اشارہ ہے جو اگرچہ بغیر علامت ماضی کے اظہار کے بھی صحیح ہے، اور معنی بھی سمجھ لیے جاتے ہیں، لیکن اگر اس کا اظہار ہوتا تو زیادہ بہتر تھا، تیسرے لفظ "جس نے" کا اقتضا یہ ہے کہ مصرع ثانی میں "اک" کے بجائے "وہ" کی ضمیر لائی جاتی، اور اس موقع پر

اک کے کوئی معنی بھی نہیں ہیں۔

جان ہے محو تجلی چشم و گوش و لب ہیں بند
حسن کو حسنِ بیاں حسنِ نظر سمجھا تھا ہیں

اس شعر میں چند در چند لفظی اور معنوی نقائص ہیں، لفظی اور نہایت فاحش نقص یہ ہے کہ فارسی معطوف معطوف، علیہ کے بعد "ہیں بند" کا ٹکڑا لگا دیا ہے، جو اگرچہ قاعدہ کے اعتبار سے صحیح ہے، لیکن اس قدر غیر فصیح ثقیل اور ناہموار ہے کہ ذوق سلیم کیا کانوں کو یہ شتر گربگی سخت ناگوار معلوم ہوتی ہے معنوی خامی یہ ہے کہ اولاً مصرع ثانی میں حسنِ بیان صحیح نہیں ہے دوسرے دونوں مصرعوں کا معنوی ربط بے جوڑ ہے، شاعر کا مقصد یہ ہے کہ میں حسن کو حسنِ بیان اور حسنِ نظر سمجھا تھا، لیکن جان ایسی محو تجلی ہوئی کہ آنکھ، کان، لب سب محو حیرت ہو گئے، اور حسن، حسنِ نظر اور حسنِ بیان باقی نہیں رہا، حسن دیکھنے والے کے لیے حسنِ نظر تو ہر حالت میں ہے، اس لیے اس کا تعلق تو اس سے صحیح ہے، لیکن حسنِ بیان نہیں ہے، حسن بیان کا تعلق حسن سے البتہ ہو سکتا ہے لیکن یہاں پر یہ مقصود نہیں ہے، دوسرے محویتِ جلوہ خود ایک حسنِ نظر ہے، اس لیے کہ تجلی چشم ظاہر ہی سے دیکھی جاتی ہے، اگر محو تجلی کے بجائے محو حقیقت ہوتا تو شاعر کا خیال صحیح ہو سکتا تھا۔

کبھی گل کہہ کے پردہ ڈال دیتے ہیں ہم اس رخ پر
کبھی مستی میں پھر گل کو رخِ زیبا سمجھتے ہیں

اگرچہ اس شعر میں کوئی خاص نقص نہیں ہے، لیکن میرے خیال میں اگر

"پھر گل" کے بجائے "گل کو بھی" ہوتا تو زیادہ بہتر تھا۔

جسم کو اپنا سا کر کے بے اُڑی افلاک پر

اللہ اللہ یہ کمالِ رنج جولاں دیکھئے

جولان عربی مصدر ہے، اس کو فارسی اسم فاعل کے معنی میں استعمال کیا گیا ہے، جو صریحاً غلط ہے۔

غرق ہیں سب علم و حکمت دین و ایماں دیکھئے

کس طرح اٹھا ہے اک ساغر سے طوفاں دیکھئے

مصرع ثانی میں "اک" حشو یا کم از کم بے جوڑ ہے۔

در پہ جو تیرے آ گیا اب نہ کہیں مجھے اُٹھا

گردشِ مہر و ماہ بھی دیکھ چکا ہوں راہ میں

اس شعر میں "آ گیا" کے لفظ سے معلوم ہوتا ہے، کہ عمداً نہیں بلکہ پھرتا پھراتا اتفاقیہ آ گیا، اس کے بجائے در تک پہنچ جانے کا ہم مفہوم جملہ ہونا چاہئے تھا، "اب نہ کہیں مجھے اُٹھا" سے اگرچہ مطلب نکل آتا ہے، لیکن اس کے بجائے "اب نہ یہاں سے تو اُٹھا" ہوتا زیادہ مناسب تھا، معنوی نقص یہ ہے کہ گردشِ مہر و ماہ دیکھنا کوئی ایسا کمال نہیں ہے، جو نہ اُٹھانے کا سفارشی بن سکے، اگر گردش کے بجائے جلوہ ہوتا تو زیادہ مناسب اور معنی خیز ہوتا کہ تیرے آستان تک پہنچنے میں مہر و ماہ کے جلوے بھی نظر آئے لیکن میں نے اُن پر آنکھ نہیں ٹھہرائی۔

دہر ہی سے وہ نمایاں بھی ہے پنہاں بھی ہے جیسے صہبا کے لئے پردۂ مینا ہونا

مصرع ثانی میں "ہونا" نہ صرف حشو ہے، بلکہ نہایت ناموزوں ہے اور محض ردیف کی مجبوری سے لایا گیا ہے۔

جہاں کی خیر ہو جانِ حزیں کی خیر ہو یارب
کہ لَو اونچی ہوئی جاتی ہے اب سوزِ محبت کی

لفظی خامی یہ ہے کہ "لَو"، "سوز" کی نہیں ہوتی، اس کے لئے شعلہ ضروری ہے، جو سوز کے بعد کا درجہ ہے، وہ بھی عموماً شمع کے لئے آتا ہے، معنوی اعتبار سے یہ خرابی ہے، کہ ایک عاشق جانباز کے لئے سوزِ محبت کی زیادتی پر جان کی خیر منانا شانِ عشق سے بعید ہے، اس کا تو کام یہ ہے کہ سوزِ عشق میں جل کر خاکستر ہو جائے اور منھ سے اُف نہ نکلے۔

کبھی یہ فخر کہ عالم بھی عکس ہے میرا
خود اپنا طرزِ نظر ہے کہ دیکھتا ہوں میں

اس موقع پر "کبھی" کا لفظ تقابل چاہتا ہے، اس لئے مصرع ثانی میں مصرع اول کا مقابل مفہوم ہونا چاہیئے لیکن اگر اس سے قطع نظر بھی کر لیا جائے تو بھی مصرع ثانی کے الفاظ سے مصرعِ اول کا ثبوت تام نہیں ہوتا اس لئے کہ اپنے طرزِ نظر سے دیکھنا عالم کے عکس ہونے کا ثبوت نہیں، اس کے بجائے ع
خود اپنا پرتو ہے، جو کچھ کہ دیکھتا ہوں میں یا اس کا کوئی اور ہم مفہوم مضمون ہونا چاہیئے۔

ترے نغمے کی لے اے مطرب آفت نوا کیا ہے
یہ موجِ برق ہے یا اک چمک دردِ محبت کی

"اک" کے بجائے "ہے" ہونا چاہیے "اک" کے یہاں کیا معنی۔

اُٹھا رکھا ہے اس نے اپنے جلوے کو قیامت پر

قیامت ہے وہ جلوہ اس کو کیا حاجت قیامت کی

مصرع ثانی اس طرح ہونا چاہیے، ع قیامت ہے وہ خود ہی اُس کو کیا حاجت قیامت کی۔

حسن ساقی کا تو مستوں کو ذرا ہوش نہیں

کچھ جھلک اس کی ہیں پردۂ مینا دیکھیں

شاعر کا مقصود یہ ہے کہ جمال حقیقت کو کوئی نہیں دیکھ سکتا۔ اگر دیکھنا ہے تو پردۂ مجاز میں اس کی جھلک دیکھ لیں، لیکن طرز ادا کی خرابی سے مستی اور بے ہوشی محرومیِ جمال کا سبب بن گئی ہے، جس سے یہ اعتراض ہوتا ہے، کہ مست و بے خود پردۂ مینا کی جھلک بھی کیسے دیکھ سکتا ہے۔

یہ آنا جلوہ بن کر اور پھر میری نظر ہونا

یہی ہے دید تو پھر دید بھی اسے فتنہ گر ہونا

یہ شعر نقص ادا اور ژولیدگی بیان کا بدترین نمونہ ہے، نقص بیان کی وجہ سے اس کا مطلب بھی خبط ہوگیا ہے۔ شاعر جمال حقیقت کی نیرنگی اور شعبدہ بازی دکھانا چاہتا ہے، کہ جب وہ جلوہ بھی دکھاتا ہے تو خود ہی نظر بن جاتا ہے، اس کے بعد کہتا ہے کہ جب یہی شعبدہ بازی ہے تو دید کا لطف بھی تیرا ہی رہا، لیکن اس مفہوم کو ادا کرنے کے لئے جو الفاظ انتخاب کئے گئے ہیں اور ان کی جو ترکیب ہے اس سے زیادہ غیر فصیح قیاس میں بھی

نہیں آسکتے ع یہ آنا جلوہ بن کر اور پھر پیری نظر ہونا، خیر یہاں تک بھی قابل
انگیز ہے لیکن ع یہی ہے دید تو پھر دید بھی اے فتنہ گر ہونا، تو معلوم ہوتا ہے
کسی مبتدی کا کہا ہوا مصرع ہے، لفظی خوبیوں سے قطع نظر اس کے معنی کیا ہوئے
"یہی ہے دید تو پھر دید بھی اے فتنہ گر ہونا"

تماشا ہے نیاز و ناز کی باہم کشاکش کا
میں ان کا دل سمجھتا ہوں وہ میرا دل سمجھتے ہیں

یہ شعر نقص بیان کی وجہ سے موضوع الفاظ کا مہمل مجموعہ معلوم ہوتا ہے
غالباً اس کا مطلب یہ ہے کہ یہ ناز و نیاز کی کشاکش کا تماشہ ہے کہ میں ان کا دل
اپنا سمجھتا ہوں، اور وہ میرا دل اپنا سمجھتے ہیں، لیکن اس شعر کے الفاظ سے یہ مطلب
ادا نہیں ہوتا، بلکہ اس سے محض "دل شناسی" کے ملکہ کا پتہ چلتا ہے جو نہایت حیرت انگیز ہے

عکس جمال یار کا آئینۂ خودی میں ہے
یہ غم ہجر کیا دیا مجھ سے مجھے چھپا دیا

اولاً مصرع اولیٰ کا تخیل ہی محتاج نظر ہے، اس لئے کہ خودی میں عکس
جمال یار کی گنجائش کہاں، اس کے لئے تو ترک خودی پہلی شرط ہے، اور اگر
کسی صوفیانہ تخیل میں جس کی مجھے خبر نہیں بالفرض اسکو...... صحیح مان بھی لیا جائے تو مصرع ثانی کو
اس سے کیا تعلق اور اس کے کیا معنی، غم ہجر سے کوئی شخص اپنے سے چھپ نہیں جاتا۔

اب وہی شعلۂ بےتاب ہے رگ رگ میں مری
پھونکے دیتی تھی کبھی تابش مینا مجھ کو

اس شعر کا تخیل نہایت بلند ہے، لیکن عجز بیان کی وجہ سے

مطلب واضح نہیں ہوتا، شاعر کا مقصود یہ ہے کہ کبھی میرا حال یہ تھا کہ مینا کی تابش تک میری برداشت سے باہر تھی، اور اس کی تابش ہی سے میں پھنکا جاتا تھا، اور اب یہ حال ہے کہ پردۂ مینا کی حجلہ نشیں میری رگ رگ میں شعلۂ بیتاب بنی ہوئی دوڑ رہی ہے۔

یہ مطلب شعر کے الفاظ سے نہیں نکلتا۔

وہ نگہت سے سوا پنہاں وہ گل سے بھی سوا عریاں
یہ ہم ہیں جو کبھی جلوہ کبھی پردہ سمجھتے ہیں ؎

اس شعر میں دونوں مصرعوں کا مطلب ایک دوسرے کے خلاف پڑتا ہے، جب یہ تسلیم ہے کہ وہ نگہت سے سوا پنہاں اور گل سے سوا عریاں ہے، تو اس کا لازمی نتیجہ یہ ہے، کہ کبھی پردہ نظر آئے اور کبھی جلوہ، جلوہ اور پردہ سمجھنے کا الزام دیکھنے والے کے سر کہاں سے عائد ہوتا ہے۔

یہ ذوقِ دید کی شوخی وہ عکسِ رنگِ محجوبی
نہ جلوہ ہے نہ پردہ ہم اسے تنہا سمجھتے ہیں

اس شعر میں "تنہا" کا لفظ بالکل بے محل اور بے جوڑ ہے، تنہا کہنا اس وقت صحیح ہوتا، جب پردے اور جلوے کی حیثیت دوئی کی ہوتی، حالانکہ یہ دونوں کیفیتیں ہیں، انھیں یکتائی اور دوئی سے کوئی علاقہ نہیں۔

نظارۂ پُر شوق کا اک نام ہے جینا
مرنا اسے کہیے کہ گزرتے ہیں ادھر سے

اس شعر میں لفظی نقص یہ ہے کہ "اک" حشو ہے، معنوی خرابی یہ ہے

کہ جب جینا نام ہے نظارۂ پرشوق کا تو مرنا اس کے مقابلہ میں محرومی کا نام ہونا چاہیئے، لیکن مصرعِ ثانی سے اس کے برعکس مطلب نکلتا ہے، کیونکہ معشوق کے ادھر سے گزرنے سے نظارۂ شوق کے اور مواقع پیدا ہوتے ہیں، اور اگر "گزرنا" "چلے جانے" کی جگہ استعمال کیا گیا ہے، تو یہ درست نہیں۔

اس کے سوا تو معنی مجنوں بھی کچھ نہیں،
ایسا بھی ربط صورتِ لیلےٰ نہ چاہیئے

یہ شعر معنی سے بے نیاز اور خالص صوفیانہ چیتان ہے، اسی قبیل کا یہ شعر ہے۔

کائناتِ دہر کیا روح الامیں بیہوش تھے
زندگی جب مسکرائی ہے قضا کے سامنے

شاعر کا مقصد بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ سالکین راہ حقیقت کی موت وصل حبیب کا پیام ہوتی ہے اس لیئے ان کی زندگی قضا کا جو وصل کا دیباچہ ہے، مسکرا کر استقبال کرتی ہے لیکن الفاظ سے یہ معنی ظاہر نہیں ہوتے، لیکن اگر اسے مان بھی لیا جائے تو اس پر کائنات دہر اور روح الامین کی بے ہوشی کے کیا معنے۔

رشک صد ایماں ہے اصغر میرا طرزِ کافری
میں خدا کے سامنے ہوں بت خدا کے سامنے

اس شعر میں بھی "بت"، "خدا"، "کفر" و "ایمان" کے متضاد اور متجانس الفاظ کے علاوہ اور کوئی مطلب نہیں معلوم ہوتا، بت اور بت پرست کا خدا کے

سامنے ہونا رشکِ صد ایمان کہاں سے ہو گیا، بلکہ یہ تو اور اشدّ کفراً و نفاقاً ہوا
ہم نے نمونہ کے طور پر محض تھوڑے سے اشعار نقل کیے ہیں، ورنہ
اس مختصر مجموعہ میں اس قبیل کے اور اشعار بھی ہیں، طرزِ ادا کے نقص سے
تو ان کے بہت کم اشعار خالی ہیں، اُمید ہے کہ اصغر صاحب آیندہ اپنی
شاعری کے "بادۂ ناب" میں پردۂ مینا کی شفافیت کی جانب بھی پوری توجہ
رکھا کریں گے، ان کے جیسے بلند مرتبہ شاعر کے لیے اس قسم کے اسقام
زیبا نہیں ہیں۔

فارسی کا کلام نہایت مختصر بلکہ نہ ہونے کے برابر ہے، خیالات کے
اعتبار سے یہ کلام بھی اُردو کا ہم پایہ ہے، لیکن زبان میں فارسیت نہیں ہے
فارسی کلام کا نمونہ یہ ہے:۔

آرزو پیکر تراشد، شوقِ من جان آفریں
شب معاذ اللہ ہمیں مخلوق من معبود بود
در حریم عشق یک رمز حیات آموختند
بے زیاں سودے کہ من می خواستم بے سود بود
جہانے را بہ پیش بخشم جہانے را بوجد آرم
دریں خاکستر سے حسنِ شرارے کردہ ام پیدا
ہمہ روحانیاں را در کمندِ شوق آوردم
بہ اوجِ عرشِ اعلےٰ ہم شکارے کردہ ام پیدا
زدلہا، تسخیر کردم ایں جہانِ ماہ و انجم را
ز جوشِ بندگی پروردگارے کردہ ام پیدا

سہیل اور نعتِ نبوی ؐ

قدرت نے مولوی اقبال احمد خاں سہیل مرحوم کو ایسی غیر معمولی صلاحیتیں عطا کی تھیں، جو ہزاروں لاکھوں انسانوں میں کہیں دو چار خوش قسمتوں کے حصہ میں آتی ہیں، وہ صحیح معنوں میں عبقری یا جینیس تھے، ان میں ذہانت و ذکاوت، علمی قابلیت اور قوت حافظہ وہ تمام استعدادیں بدرجہ کمال موجود تھیں، جو کسی انسان کو بڑا بنانے کے لئے کافی ہیں، اگر وہ ان سے صحیح کام لیتے تو ہندوستان کے نامور فضلاء میں ان کا شمار ہوتا، لیکن یہ علم و ادب کی بدنصیبی ہے کہ یہ صلاحیتیں غلط مصرف میں صرف ہوئیں، اور جو لعل شب چراغ پوری علمی دنیا کو منور کر سکتا تھا وہ شاعری کی شمع محفل بن کر رہ گیا۔ اور شاعری کو بھی انھوں نے مستقل مشغلہ نہیں بنایا بلکہ اس کی حیثیت محض وقتی دلچسپی کی تھی، اس کے باوجود انھوں نے اس کی جو یادگاریں چھوڑی ہیں وہ اُردو زبان میں زر و جواہر کی حیثیت رکھتی ہیں۔

سہیل مرحوم کی فطرت شاعرانہ تھی، ان کی نثر بلکہ روزانہ کی گفتگو بھی شاعرانہ نکتہ سنجیوں سے خالی نہ ہوتی تھی، ان کی ذہانت اور علمی قابلیت نے اس شراب کو اور دو آتشہ کر دیا تھا، ان کو اُردو فارسی، عربی تینوں زبانوں پر پورا عبور حاصل تھا، اور وہ ان کے ادا شناس تھے، فن کے نکتوں پر بھی ان کی نگاہ بڑی گہری تھی، اس لئے جملہ اصناف سخن پر ان کی حکمرانی یکساں تھی، مگر

قصیدہ نگاری سے خاص مناسبت تھی، اور اس میں ان کا کوئی حریف نہ تھا، اور ان کے کمال کا اصلی تماشا گاہ یہی ہیں، اس مضمون میں اس کی ایک صنف یعنی نعت گوئی پر مختصر تبصرہ مقصود ہے، نعت کہنا آسان بھی ہے اور مشکل بھی، محض شاعری کی زبان میں ذات پاک نبویؐ کی عامیانہ توصیف کر دینا بہت آسان ہے، لیکن اس کے پورے لوازم اور شرائط سے عہدہ برآ ہونا بہت مشکل ہے، نعت دراصل محض آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کی شاعرانہ توصیف کا نام نہیں، بلکہ نبوت کے حقیقی کمالات کی ایسی مصوری کا نام ہے، جس سے ایمان میں تازگی اور روح میں بالیدگی پیدا ہو، اس کے لئے دل کی مستی اور دماغ کی ہوشیاری دونوں ضروری ہیں، یعنی حُب رسول کے ساتھ نبوت کے اصلی کمالات اور کارناموں، اسلام کی صحیح روح، عہد رسالت کے واقعات اور آیات و احادیث سے واقفیت ضروری ہے جو کم شعراء کو ہوتی ہے، اس کے بغیر صحیح نعت گوئی ممکن نہیں ہے۔

نعت کا راستہ بڑا نازک ہے، اس میں ادنیٰ لغزش سے نیکی برباد گناہ لازم آجاتا ہے، اس لیئے اس پل صراط کو عبور کرنا ہر شاعر کے بس کی بات نہیں، یہ وہ بارگاہ قدس ہے جہاں قدم رکھتے بڑے بڑے قدسیوں کے پاؤں لرز جاتے ہیں۔ ع نفس گم کردہ می آید جنید و بایزید اینجا۔

اور عرفی جیسے شاعر کو یہ کہنا پڑا۔

عرفی مشتاب ایں رہ نعت است نہ صحرا است

آہستہ کہ رہ، بر دم تیغ است قدم را

ہشدار کہ نتواں بہ یک آہنگ سرودن
نعتِ شہِ کونین و مدیحِ کے و جم را

اس راہ میں سب سے بڑی لغزش الوہیت اور نبوت کے حدود کو سمجھنے میں ہوتی ہے، اکثر شعرا نبوت کے ڈانڈے الوہیت سے ملا دیتے ہیں، مثلاً یہ

وہی جو مستویٔ عرش تھا خدا ہو کر
اُتر پڑا ہے مدینہ میں مصطفےٰ ہو کر

نعت کا بڑا مشہور و مقبول شعر سمجھا جاتا ہے، حالانکہ یہ شعر نہ صرف توحید کے سراسر منافی بلکہ نبوت کی حقیقت کے بھی خلاف ہے، ایک طرف یہ افراط و غلو ہے اور دوسری طرف یہ تفریط اور سوء ادب ہے کہ بعض شعراء ذات پاک نبوی کے ساتھ عقیدت و محبت کے اظہار میں وہی پیرایہ اختیار کرتے ہیں جو دنیاوی بلکہ بازاری معشوقوں کے لئے اختیار کیا جاتا ہے اور اس عیب سے اُردو کی کم نعتیں خالی ہیں۔

درحقیقت ذات پاک محمدیؐ عبدیت و نبوت کا ایسا برزخ کبریٰ ہے جس پر دونوں کے کمالات ختم ہو گئے، اس لئے جو تصور بھی ان دونوں کے منافی ہوگا، اس کا انتساب آپ کی جانب سخت گمراہی ہے، اس قسم کی لغزشیں زیادہ تر صحیح اسلامی تصورات سے ناواقفیت اور غلو کا نتیجہ ہوتی ہیں نبوت اور عبدیت کا کمال اس میں نہیں ہے کہ بندے اور نبی کو خدا بنا دیا جائے، بلکہ ان کا اصلی کمال یہ ہے کہ نبی جامۂ بشریت میں رہتے ہوئے عبدیت اور نبوت کا ایسا کامل اور اکمل نمونہ ہو کہ اس کے بعد کمال کا کوئی درجہ تصور

میں نہ آسکے، اور یہ صرف نبوت پر موقوف نہیں ہے، بلکہ دنیا کی ہر چیز کا اصل کمال یہی ہے کہ وہ اپنی جنس کا کامل ترین نمونہ ہو۔

پھر نبوت کا درجہ خود اتنا بلند ہے اور وہ انسانیت کی اتنی بڑی معراج ہے کہ انسان اسی کی توصیف سے قاصر ہے پھر انبیا علیہم السلام میں بھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا مقام اتنا ارفع واعلیٰ ہے اور آپ کے کارنامے اتنے عظیم الشان ہیں کہ اگر بڑے سے بڑا شاعر ان ہی کو دکھانا چاہے تو اس کو آخر میں اپنے عجز و درماندگی کا اقرار کرنا پڑے گا کہ

دفتر تمام گشت و بہ پایاں رسید عمر

ما ہم چناں در اول وصف تو ماندہ ایم

اس لئے آپ کی جانب غیر حقیقی کمال کے انتساب کی ضرورت ہی نہیں، حضرت سعدی علیہ الرحمہ نے کیسی مختصر اور جامع نعت کہہ دی ہے جس پر بڑی بڑی نعتیں قربان کی جاسکتی ہیں۔

بلغ العلیٰ بکمالہ کشف الدجیٰ بجمالہ

حسنت جمیع خصالہ صلوا علیہ و آلہ

سہیل مرحوم نبوت کے عظمت شناس تھے، ان کی نظر ان تمام پہلوؤں پر تھی، اس لئے اُن کے قلم سے اس قسم کی کوئی لغزش نہیں ہونے پائی ہے، اور اردو میں ان کی نعتیں نعت نبوی کا صحیح نمونہ ہیں۔ ان میں الوہیت کی تجرید و تنزیہ، نبوت کی عظمت و جلالت، خصائص و کمالات محمدی ہر چیز اپنے اپنے درجہ پر رہتی ہے، اور وہ اسلامی روح سے اس قدر معمور ہوتی ہیں کہ ان سے

مذہب کا درس لیا جا سکتا ہے، اسی کے ساتھ ان کی حیثیت محض واقعہ نگاری کی نہیں ہوتی، بلکہ وہ فکر وتخیل کی جدت وابداع، الفاظ کے حسن ونفاست، ترکیبوں کی مرصع کاری وخوش نمائی اور زبان وبیان کی دل کشی ورعنائی کے اعتبار سے شعر وادب کا نگار خانہ ہیں۔

نعت ان کی شاعری کا خصوصی موضوع نہیں ہیں، بلکہ انھوں نے دوسرے اصناف سخن کی طرح چند نعتیں بھی کہی ہیں، ان میں اصل نعتیں دو ہی ہیں، باقی چھوٹی چھوٹی نظمیں ہیں، لیکن یہ ان کا کمال ہے کہ نعت کا پورا عطر اور جوہر ان دو نعتوں میں کھینچ دیا ہے، جس کی خوشبو سے مشام جان معطر ہو جاتا ہے، وہ کون سا نغمہ لاہوتی ہے، جو اس ساز میں نہیں جسے سُن کر ایمان میں تازگی اور روح میں بالیدگی پیدا ہوتی ہے۔ ان کی نعتوں کے جلوے اتنے رنگا رنگ ہیں کہ اس مختصر مضمون میں ان سب کا دکھانا مشکل ہے اس لیے صرف ان کی ایک ایک جھلک دکھلانے کی کوشش کی جائے گی۔

نعت کا موضوع محدود و متعین ہے، اس لیے اس کے مضامین بھی مشترک ہوتے ہیں، مگر سہیل ان میں ایسی جدت وندرت پیدا کر دیتے ہیں کہ پرانا خیال بھی نیا معلوم ہونے لگتا ہے۔ نور محمدیؐ کی تخلیق کی مصلحت میں شعراء نے بڑی بڑی بلند پروازیاں دکھائی ہیں، سہیل کی کچھ نکتہ سنجیاں ملاحظہ ہوں۔

یہ ایک حقیقت ہے کہ بزم شہود ازل سے قائم تھی، جمال سرمدی بھی جلوہ آرا تھا، مگر اس کے مشاہدہ کے لیے جس چشم بصیرت کی ضرورت تھی اس سے عالم انسانیت محروم تھا، کائنات کی حقیقت ایک معمہ تھی، انسان خود

اپنی حقیقت سے ناآشنا تھا، کائنات کے حقائق اوہام والتباس کے حجابات میں مستور تھے، عقل شکستہ پا ان کے ادراک سے عاجز تھی، اس کے لئے ایسے عشق بے تاب کی ضرورت تھی جو ان تمام حجابوں کو چاک کر کے حسن حقیقت کا جلوہ عام اور عالم انسانیت کو اس کے نور سے معمور کر دے، یہ عشق نور محمدی کی شکل میں ظاہر ہوا، جس نے دائرۂ وجود کی دونوں کمانوں کو ملا دیا، دیکھئے ان نازک مسائل کو سہیل نے کس خوبصورتی سے نظم کیا ہے:۔

مکتب عشق میں ہنوز طفل خرد ہے مبتدی
ورنہ ہے باصرہ نواز جلوۂ حسن سرمدی

عقل ضعیف ہو کہاں کنز ازل کی رازداں
یہ وہ مقام ہے جہاں بے خردی ہے بخردی

دل کا کبھی گزر نہ ہو حُسن کی بزم ناز تک
دفتر عقل اگر نہ ہو غرق شراب بے خودی

عشق نے فاش کر دیا سِرّ حریم کبریا
ورنہ یہ خاکدان تھا فانیٔ عہد محمدی

عشق وہ ہے جو کھول دے پردۂ راز کائنات
فرق نیاز کو ملے جس سے عروج فرقدی

عشق سے جگمگا اُٹھے صفحۂ جان اس طرح
جیسے خط شعاع سے یہ ورق زبرجدی

پردۂ عشق میں ملا حُسن کو خلعت ظہور
پوری ہوئی جو بات تھی صبح ازل کہی بدی

ہوگئی دل کی جلوہ گاہ مطلع حسن لا الٰہ

تا تو چو ماہ نیم ماہ سر ز حجاب بر زدی

دائرۂ وجود کی دونوں کمانیں مل گئیں

بندہ دگر خدا دگر رہیں تیرا اللہ و ہم سرحدی

اس کے بعد بعثتِ نبوی کی منزل آتی ہے، اس سے پہلے رحمۃ للعالمین ؐ کی عظمت و جلالت اور ان کے علوئے منزلت کی تصویر دیکھ لیجئے:

کہاں کا دشت ایمن طور کیا برق تجلی کیا

سب کچھ تھی جمالِ مصطفٰے کی پرتو افشانی

محمد ؐ وہ کتاب کون کا طغرائے پیشانی

محمد ؐ وہ حریم قدس کا شمع شبستانی

محمد ؐ یعنی وہ سرِ نہفتہ ہائے کنکِ فطرت کا

محمد ؐ یعنی وہ امضائے توقیعاتِ ربانی

وہ فاتح جس کا پرچم اطلسِ زنگاری گردوں

وہ اُمی جس کے آگے عقلِ کل طفلِ دبستانی

وہ سلطان الامم فخرِ دو عالم برزخ کبریٰ

رسالت جس کی تصدیقی جلالت جس کی اذعانی

مبشر جس کی بعثت کا ظہورِ عیسیٔ مریم

مصدق جس کی عظمت کا لبِ موسیٔ عمرانی

تراشا جس کے ناخن کا ہلالِ آسماں منزل
غسالہ جس کے تلووں کا زلالِ آبِ حیوانی
تعالیٰ اللہ جمالِ مصطفیٰ کا حُسنِ لاثانی
کہ یکساں جمع ہیں جس میں تمام اوصافِ امکانی
دُعائے یونسی، خلقِ خلیلی، صبرِ ایوبی،
جلالِ موسوی، زہدِ مسیحی، حُسنِ کنعانی

آپ کے اوصاف و کمالات اور خصوصیاتِ محمدی کا دوسرا مرقع ملاحظہ ہو۔

احمدِ مرسل فخرِ دو عالم صلے اللہ علیہ وسلم
مظہرِ اول مرسلِ خاتم صلے اللہ علیہ وسلم
جسم مزکّی روح مصوّر، قلب مجلّی نورِ مقطّر
حسن سراپا خیر مجسّم صلے اللہ علیہ وسلم
طینت جس کی سب سے مطہر بعثت جس کی سب سے موخر
خلقت جس کی سب سے مقدم صلے اللہ علیہ وسلم
جس کی ہراول فوجِ سلیماں جس کے منادی موسیٰ عمراں
جس کے مبشر عیسیٰ مریم صلے اللہ علیہ وسلم
جس کا نام اچھالے داور آپ رفعنا لک فرما کر
بزمِ تجلی جس کا خیمہ صلے اللہ علیہ وسلم
جتنے فضائل جتنے محاسن ممکن میں ہو سکتے تھے ممکن
حق نے کئے سب اس میں فراہم صلے اللہ علیہ وسلم

علم لدنی شان کریمی خلق خلیلی، نطق کلیمی،
زہد مسیحا عفتِ مریم صلے اللہ علیہ وسلم
آپ اگر مقصود نہ ہوتے کون ومکاں موجود نہ ہوتے
اور موجود نہ ہوتے آدم صلے اللہ علیہ وسلم
اوجِ شرف کا بدر وہی ہے بزم رسل کا صدر وہی ہے
بدر منور صدر مکرم صلے اللہ علیہ وسلم
صدر امم سلطانِ مدینہ وہ جس کے کف پا کا پسینہ
گل کدۂ فردوس کی شبنم صلے اللہ علیہ وسلم

اس کے بعد بعثت نبوی اور نبوت کے کارناموں کا مرقع سجایا ہے مگر اس سے پہلے بعثت نبوی کے وقت دنیا کی حالت پر ایک نظر ڈال لیجیے، یہ محض افسانہ اور خوش اعتقادی نہیں بلکہ تاریخی حقیقت ہے کہ بعثت نبوی سے پہلے ساری دنیا میں ایک عام تاریکی چھائی ہوئی تھی، خدا شناسی کا کہیں وجود نہ تھا، انسان جس کے سر پر اشرف المخلوقات کا تاج رکھ کر نیابت الٰہی کے منصب جلیل سے سرفراز کیا گیا تھا اور ساری مخلوق اس کے تابع فرمان بنائی گئی تھی، اس نے شجر و حجر تک کو اپنا معبود بنا لیا تھا جس چیز سے بھی اس کو فائدہ کی اُمید یا نقصان کا خطرہ تھا، اس کے سامنے اس کی جبین عبودیت سجدہ ریز ہو گئی تھی، اخلاق و روحانیت اور عدل و مساوات کا نام و نشان تک باقی نہ تھا، ہر کمزور طاقتور انسان کا غلام تھا، بڑائی کا معیار اخلاق و تقویٰ کے بجائے نسلی و مالی برتری تھی خدا کا

کنبہ جغرافی اور قبائلی حد بندیوں میں بٹا ہوا تھا، مذہب بھی تعیش اور حصول اقتدار کا ذریعہ بن گیا تھا، مذہبی پیشواؤں کو خدائی کا درجہ حاصل تھا، عورتوں کی کوئی حیثیت نہ تھی وہ سارے انسانی حقوق سے محروم تھیں، لڑکی کو زندہ درگور اور بیوہ کو نذر آتش کر دیا جاتا تھا، انسان وحشت و درندگی اور ہوس پرستی میں جانوروں کو شرماتا تھا، غرض اخلاق وروحانیت کی دنیا بالکل ویران ہو چکی تھی، عین اس حالت میں غیرت الٰہی جوش میں آتی ہے، ریگستان عرب سے رحمت کی گھٹا اُٹھتی ہے، جس کے ایک ہی چھینٹے سے انسانیت کی سوکھی ہوئی کھیتی لہلہا اُٹھتی ہے، اور اخلاق وروحانیت کے نور سے ساری دنیا معمور ہو جاتی ہے، عالم انسانیت کی اس بہار کا منظر سہیل کے خامۂ رنگیں رقم سے ملاحظہ ہو :۔

بہارستان ہستی کے لئے دورِ شباب آیا
رگِ فطرت میں ریحانِ نمو کا اضطراب آیا
نظام آفرینش کو پیام انقلاب آیا
فضائے کن مکاں میں پرچم ختمی مآب آیا
شہنشاہِ دو عالم مہبطِ ام الکتاب آیا
وہ موجِ بے قرار اٹھی ہے عمانِ تجلی سے
زمانہ جگمگا اٹھا ہے فیضانِ تجلی سے
شبستانِ جہاں روشن ہوئی شانِ تجلی سے
ہوئی ظلمت گریزاں جوشِ طوفانِ تجلی سے

رسالت کے اُفق پر نورِ حق کا آفتاب آیا
وہ آئینہ دکھایا جس نے عکس روئے جاناں کو
نمایاں کر دیا جس نے فروغ حسن پنہاں کو
عطا کی دولت نظارہ جس نے دیدہ و جاں کو
چراغاں کر دیا جس نے تجلی گاہ امکاں کو
وہ جلوہ اب جمال احمدی میں بے نقاب آیا
معارف کا خیاباں تازہ جس کی رشحہ باری سے
مکارم کا چمن شاداب جس کی آبیاری سے
شناسا جس نے عالم کو کیا توحید باری سے
دلوں کی کھیتیاں سیراب جس کے فیض جاری سے
وہ دریائے کرم آیا وہ رحمت کا سحاب آیا

اس اجمال کی تفصیل یہ ہے :-

وہ ناسخِ مذاہب جس کے مقدم نے کیا باطل
فروغ دین زردشتی شکوہ دین نصرانی
وہ مقصودِ دو عالم مستغاث قاصی و دانی
کیا جس نے مکمل نسخۂ اخلاق انسانی
وہ حاذق جس کا تنہا نسخۂ تنزیل قرآنی
دوائے جملہ علتہائے اخلاقی و روحانی
وہ رابطہ عقل و مذہب کو کیا شیر و شکر جس نے
وہ فارق زہد سے جس نے مٹایا داغ رہبانی

وہ عادل جس کی میزانِ عدالت میں برابر ہے
غبارِ مسکنت ہو یا وقارِ تاجِ سلطانی

وہ جامع جس نے یکجا کر دیئے بکھرے ہوئے دانے
مٹا دی آ کے جس نے باہمی تفریقِ انسانی

وہ درس آموزِ فطرت جس نے پہلے سب سے دنیا میں
بتائے اہلِ عالم کو حقوقِ جنسِ نسوانی

اٹھا دی خودکشی کی بزدلانہ رسم دنیا سے
سکھایا مشہدِ توحید پر آئینِ قربانی

وہ گنجورِ معارف جس کے ہر ہر حرف میں پنہاں
نکاتِ فلسفی اسرارِ نفسی رازِ عمرانی

ایک دوسری نعت میں نبوت کے کارناموں کی تصویر اس ایجاز و جامعیت کے ساتھ دکھائی کہ اس کی مثال اردو کی نعتوں میں نہیں مل سکتی اس کے ایک ایک فقرے میں کئی کئی شعروں کے مطالب کھپا دیے ہیں اس کے کچھ اشعار ملاحظہ ہوں :-

کفر کی ظلمت جس نے مٹائی دین کی دولت جس نے لٹائی
لہرایا توحید کا پرچم صلے اللہ علیہ وسلم

باغِ جہاں کا حارس نامی جس نے مٹائی رسمِ غلامی
پھر سے سنوارا گلشنِ عالم صلے اللہ علیہ وسلم

بزمِ ملل تھی نظم سے خالی بکھرے ہوئے تھے حق کے لآلی
اس نے کئے سب آ کے منظم صلے اللہ علیہ وسلم

وہم کی ہر زنجیر کو توڑا رشتہ ایک خدا سے جوڑا
شرک کی محفل کر دی برہم صلے اللہ علیہ وسلم

فرد و جماعت امر و اطاعت کسب و قناعت عفو و شجاعت
حل کئے جو اسرار تھے مبہم صلے اللہ علیہ وسلم

ربط و تصادم طوع و تحکم فقر و تنعم عدل و ترحم
سب کے حدود بتائے باہم صلے اللہ علیہ وسلم

حفظ مراتب پاس اخوت سعی و توکل رفق و فتوت
تلک حدود اللہ میں منضم صلے اللہ علیہ وسلم

ارض و سما میں آیۂ رحمت روز جزا میں سایۂ رحمت
اس کے لوائے حمد کا پرچم صلے اللہ علیہ وسلم

راہ میں کانٹے جس نے بچھائے گالی دی پتھر برسائے
اس پر چھڑکی پیار کی شبنم صلے اللہ علیہ وسلم

فقر و غنا دونوں کا سلطاں روح و جسد دونوں کا درماں
دین اور دنیا کا سنگم صلے اللہ علیہ وسلم

اس سلسلہ میں معراج کی ایک نظم جو نعت ہی کا ایک حصہ ہے سُننے کے قابل ہے، معراج نبوی عام انسانی تخئیل سے ماوراء ہے، اس لئے اس کی کیفیت میں خود مسلمانوں میں اختلاف ہے کہ وہ روحانی تھی یا جسمانی، عالم خواب میں تھی یا بیداری میں، مادی جسم کا عالم افلاک پر جانا بڑے بڑے عقلاء و حکماء کی فہم سے باہر ہے، اور عالم لامکاں میں جو احوال و کوائف

پیش آئے۔ ان کا تصور بھی انسانی عقل نہیں کر سکتی، اس لیے جن شعراء نے معراج پر لکھا ہے ان میں کم ایسے ہیں جن کو معراج کے واقعات کا صحیح علم ہے اس لیے انھوں نے زیادہ تر شاعرانہ بلند پروازی سے کام لیا ہے، مگر سہیل کی نظر معراج کی حدیثوں پر تھی، اس لیے انھوں نے صحیح واقعات کو اس دلکشی سے نظم اور معراج کے نازک مقامات کو اس خوبصورتی سے طے کیا ہے کہ ذوق سلیم دید کرنے لگتا ہے، اس کے جستہ جستہ اشعار سے اس کا اندازہ ہوگا، سامعین بھی اس عالم روحانیت کی سیر فرمائیں:۔

حریم اُمِّ ہانی میں حضور آرام فرما تھے
درِ دولت پہ قدسی و ملک تھے محوِ دربانی
وہ چشم نرگسی تھی بند لیکن چشم دل وا تھی
سرہانے طالع بیدار کرتا تھا نگہبانی
ادب سے آکے جبریلِ امیں نے یہ گزارش کی
کریں سرکار بزم نور تک تشریف ارزانی
سُنی روح القدس سے جب طلب بزم حضوری کی
اُٹھے اور دی براق پاک پر داد سبک رانی

ذیل کے اشعار میں جسمانی اور روحانی معراج کے مسئلہ اور جسمانی معراج کے استحالہ کو کس دلنشین انداز میں، اور کیسی ندرت و لطافت سے حل کیا ہے۔

براق برق پیکر لے چلا یوں ذات والا کو
فضا میں تیر جائے جس طرح بجلی کی تابانی

حضورؐ اس طرح گزرے گنبدِ مینائے گردوں سے
نظر جس طرح شیشہ سے گزر جائے بہ آسانی

عالم بالا میں استقبال اور عالم مثال کے مناظر کی سیر:۔

ملائک اور رسل صف بستہ استقبال کو آئے
اُٹھا افلاک پر ہر سمت شورِ تہنیت خوانی

کھلی آنکھوں سے دیکھا محرمِ سرِ حقیقت نے
جزائے محسن و قامت سزائے مذنب و جانی

نظر سے عالم ناسوت کے سارے حجاب اُٹھے
برای العین کی سیر بہارستانِ رضوانی

اس کے بعد ان مناظر کی تصویریں ہیں جو حضورؐ کو عالم مثال میں مشاہد کرائے گئے، ان مراحل کے بعد لامکاں کی سرحد شروع ہوتی ہے، جہاں عالم ناسوت کے سارے وسائل جواب دے جاتے ہیں اور جس سے آگے بڑھنے میں جبریل کے بھی پر جلتے ہیں۔

اگر یک سرِ موئے برتر پرم
فروغِ تجلی بسوزد پرم

اسلئے براق و جبریل آخر رُکے سدرہ کی منزل پر
کہ تھی یہ انتہائے سرحدِ اقلیمِ امکانی

اور یہاں سے لے چلیں پھر آپ کو موجیں تجلی کی
وہ رفرف ہو کہ انوارِ ازل کا جوشِ فیضانی

رفرف کی کیفیت معلوم نہیں اس لئے تجلی کی موجوں اور انوارِ ازل کے

جوش سے اس کی تعبیر بڑی حکیمانہ، دلنشین و دلآویز ہے، اس کے بعد حریم احدیت کے حدود شروع ہو جاتے ہیں، جہاں کسی کا گزر نہیں، اس لئے رفرف کے قدم بھی رک جاتے ہیں۔

سوادِ لامکاں تک رک گیا رفرف کہ اس کو بھی
کہاں اس خلوت وحدت میں اذن گرم جولانی

اس خلوت سرائے وحدت میں راز و نیاز کے جو کوائف پیش آئے اس کو کس خوبی سے تعبیر کیا ہے:۔

کسی نے لے لیا خود بڑھ کے آغوش محبت میں
ہوا ملک قدم خلوت سرائے بزم امکانی
ظلال ذات میں پھر کیا ہوا اللہ ہی جانے
بجز صدیق اکبرؓ یہ حقیقت کس نے پہچانی

اس مصرعہ "بجز صدیق اکبرؓ یہ حقیقت کس نے پہچانی" میں اس واقعہ کی طرف اشارہ ہے کہ معراج کی صبح کو جب آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم نے یہ واقعہ لوگوں سے بیان کیا تو مشرکین نے اس کا بڑا مضحکہ اڑایا، اس موقع پر بھی نبوت کے سب سے پہلے مصدق صدیق اکبر نے اس کی تصدیق کی اور اور کہا حضور جو کچھ فرماتے ہیں سب سچ ہے۔

یہاں تک جو کچھ لکھا گیا وہ ان نعتوں کی معنوی خصوصیات سے متعلق تھا یہ نعتیں ادبی وشاعرانہ محاسن سے بھی معمور ہیں، اوپر جس قدر اشعار نقل کئے گئے ہیں ان میں سے کوئی شعر بھی ادبی محاسن سے خالی نہیں ہے، لیکن اب

خالص ادبی حسن و لطافت کے کچھ نمونے پیش کئے جاتے ہیں، ان نعتوں میں مختلف قسم کے جذبات و خیالات اور احوال و کیفیات کی تصویریں ہیں اور اور جو خیال اور جو منظر بھی پیش کیا گیا ہے وہ ادبی حسن و لطافت سے ایسا آراستہ ہے کہ پوری نعت شعر و ادب کا نگارخانہ معلوم ہوتی ہے، جس کا ہر مرقع اس قدر دلکش و دلآویز ہے کہ ذوق سلیم وجد کرنے لگتا ہے ایک نعت کی تشبیب میں ظہور قدسی کے اہتمام میں باغ عالم کی چمن آرائی کا منظر دیکھئے:-

بہار آئی، ہوئی آراستہ پھر بزم امکانی
ہوا گلزار عالم پھر جواب باغ رضوانی
کہیں پھولوں کے جھرمٹ میں شاعوں کی نظر بازی
کہیں خود جلوۂ خور سے گلوں کی چاک دامانی
کہیں دوشِ صبا پر رقص کرنا نکہتِ گل کا
کہیں شاخ نشیمن پر عنادل کی غزل خوانی
ادھر سبزہ کا جاگ اُٹھنا خمارِ خواب نوشیں سے
ادھر باد سحر سے زلف سنبل کی پریشانی
صبا کے گدگدانے سے ادھر کلیوں کا ہنس دینا
ادھر شبنم سے پھولوں کی عرق آلودہ پیشانی
رگ گل نے بچھا رکھا ہے ہر سو دام نظارہ
عبث ہے گر کرے مُرغ نگہ سعی پر افشانی

چمن کا جلوۂ رنگیں ہے یا اک شعر فطرت ہے
کہ جس پر ذوق فطرت خود ہے محو آفریں خوانی

جبینِ صبح پر قشقہ ہے یا خطِ شعاعی ہیں
ایاغ لالہ میں شبنم ہے یا صہبائے ریحانی

نگاہیں جذب کر لی ہیں بہارِ عارضِ گل نے
رگِ گل کی حقیقت آج ہم نے جا کے پہچانی

کہاں کا دشت ایمن طور کیا برق تجلی کیا
یہ سب کچھ تھی جمالِ مصطفےٰ کی پرتو افشانی

یہ اشعار نہیں تختۂ گل ہے جس کے پھولوں کی نزہت و رنگینی باغ رضواں کے پھولوں کو شرماتی ہے اور جس کی مہک سے مشام جاں معطر ہو جاتا ہے اب جمال محمدی کے کچھ جلوے ملاحظہ ہوں :-

قبلہ نمائے سجدہ گزاراں شعلۂ سینا جلوۂ فاراں
صبح بہاراں جس کا مقدم صلی اللہ علیہ وسلم

شرحِ الم نشرح وہ سینہ برق تجلی کا گنجینہ
جگمگ جگمگ چم چم چم چم صلی اللہ علیہ وسلم

نوری تن کمل میں چھپائے بادل میں بجلی لہرائے
نور کا مینھ برسائے رم جھم صلی اللہ علیہ وسلم

اوجِ شرف کا بدر وہی ہے بزم رسل کا صدر وہی ہے
بدر منور صدر مکرم صلی اللہ علیہ وسلم

جس نے بسائی دل کی بستی جس کا ظہور شباب ہستی
نزہت گیتی جس کا مقدم صلے اللہ علیہ وسلم

صدر اُمم سلطان مدینہ جس کے کفِ پا کا ہے پسینہ
گلکدۂ فردوس کی شبنم صلے اللہ علیہ وسلم

مہر رسالت قہر جلالت عین عدالت خضر دلالت
اے بکمالت ناطقہ ابکم صلے اللہ علیہ وسلم

سرو سیادت قامت رعنا صبح سعادت جلوۂ سیما
طاق عبادت ابروئے پُرخم صلے اللہ علیہ وسلم

یہ اشعار بلاغت ادا، الفاظ کی مرصع کاری، ترکیبوں کی چُستی اور تشبیہات کی خوبی و لطافت کا مرقع ہیں، اس کا ایک اور بلیغ نمونہ معراج کے ایک منظر میں ملتا ہے، معراج میں آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کو جو مناظر مشاہدہ کرائے گئے تھے، ان میں قصر فاروقی یعنی حضرت عمرؓ کا محل بھی تھا، اس کے شکوہ و عظمت، حسن و جمال اور آرائش و زیبائش کی تصویر دیکھنے سے تعلق رکھتی ہے۔

بڑھے آگے تو وسطِ ساحتِ فردوس میں دیکھا
بلند و پرشکوہ و دل کشا اک قصر نورانی
وہ نزہت جس کا ہر گوشہ ریاضِ خلد کا حاصل
وہ رفعت جس کا ہر زینہ حریفِ کاخِ ایوانی

اس شکوہ و عظمت کے ساتھ اس کے حسن و جمال، خوبی و زیبائش

اور زینت و آرائش کی یہ تشبیہ شاعری نہیں ساحری ہے۔

وہ شفاف و شفق گوں رنگ جیسے حل ہو کوثر میں
تباشیر سحر، سیم قمر، یاقوت رمانی
چمن میں اشک شبنم کی جگہ در نجف غلطاں
روش پر سنگ ریزوں کے عوض لعل بدخشانی

حضرت عمرؓ کے مرتبہ، اوصاف اور اُن کی سیرت و کردار کی مناسبت ان تشبیہوں میں خاص طور سے توجہ کے قابل ہے۔

محاسن کے توازن میں مثال عدل فاروقی
مناظر کے تناسب میں جمالِ ماہ کنعانی
قوایم اس کے عزمِ انبیاء کی طرح مستحکم
در و بام اس کے قلبِ اصفیا کی طرح نورانی

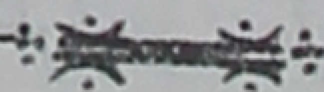
یہ مثالیں ان نعتوں کے ادبی محاسن کا اندازہ کرنے کے لئے کافی ہیں سہیل عربی زبان سے پوری طرح واقف تھے، اور آیات قرآنی اور احادیث نبوی پر بھی ان کی نظر تھی، اس لئے ان کی نعت اور منقبت دونوں میں جابجا اس کی بلیغ تلمیحات ملتی ہیں اور وہ انکے ٹکڑے اشعار میں نگینے کی طرح جڑ دیتے تھے مثلاً:-

خلق خدا کا راعی آخر دین ہدیٰ کا داعی آخر
جس کی دعوت اَسْلِمْ تَسْلَمْ صلے اللہ علیہ وسلم
آئینۂ الطاف الٰہی رحمت جس کی لا تقنطوا ہی
جس کی ہدایت اِرْحَمْ تُرْحَمْ صلے اللہ علیہ وسلم

حفظِ مراتب پاسِ اخوت سعی و توکل رفق و فتوت
تلک حدود اللہ ہیں منضم صلے اللہ علیہ وسلم
نظم سہیلؔ ان کا ہی کرم ہے ورنہ یہاں کب تابِ رقم ہے
ان اللہ تعالےٰ اعلم صلے اللہ علیہ وسلم
عشق نے فاش کردیا سرِّ حریمِ کبریا
ورنہ یہ خاکدان تھا فی عمدٍ ممدد
چمن پیرائے کن صدقے تری نیرنگ سازی کے
لبِ ہر غنچہ پر ہے "کل یوم ہو فی شان"
خدا جانے خود اس سرکار کا کیا مرتبہ ہوگا
غلامِ بارگہ جس کے کہیں "ما اعظم شانی"

سہیلؔ کی نعتوں کی خصوصیات محض ان ہی پہلوؤں تک محدود نہیں ہیں، اس کے اور بھی گوناگوں پہلو ہیں، مگر اس مختصر مضمون میں ان سب کی تفصیل کی گنجائش نہیں ہے اور مذکورہ بالا مثالیں سہیلؔ کی قادر الکلامی اور ان کی نعتوں کی اہم خصوصیات کا اندازہ لگانے کے لئے کافی ہیں اس لئے اس تبصرہ کو بارگاہ رسالت میں سہیل ہی کی اس التجا پر ختم کیا جاتا ہے۔

تیرے غلام آستاں اور جھکائیں سر کہاں
انک انت غایتی انک انت مقصدی



اُردو زبان کی لسانی علمی و تمدّنی اہمیت

حضرات! اُردو زبان کا موضوع نہایت وسیع ہے، اور اس کے مختلف پہلوؤں پر بہت سے اصحاب علم و نظر لکھتے چلے آرہے ہیں، خصوصاً ادھر چند برسوں کے اندر اس کے متعلق بہت کچھ لکھا گیا ہے، مگر اس کی حیثیت زیادہ تر سیاسی بحث و مباحثہ کی رہی ہے، اور ان میں ان خصوصیات کو بہت کم دکھانے کی کوشش کی گئی ہے جن کی بنا پر کوئی زبان ترقی یافتہ کہلائی جا سکتی ہے، جن اصحابِ قلم نے ادھر توجہ بھی کی انھوں نے بھی ان پہلوؤں کا پورا احاطہ نہیں کیا ہے، جن سے اُردو کی جامعیت اور کمال کا پورا اندازہ ہو سکے اور یہ معلوم ہو جائے کہ ہندوستان کی زبانوں میں اُردو کا کیا درجہ ہے، وہ کہاں تک ایک ترقی یافتہ زبان کہلانے کی مستحق ہے، اور اس میں آئندہ ترقی کی کتنی صلاحیت ہے، اس لئے یہ مضمون درحقیقت اُردو کی خصوصیات کا ایک اجمالی خاکہ ہے، جس پر مستقل کتاب لکھی جا سکتی ہے۔

زبان کی ترقی اور کمال کے گوناگوں پہلو ہیں، مگر اس مقالہ میں صرف اس کے تین اہم پہلوؤں یعنی لسانی اور لغوی وسعت، علمی درجہ اور تمدّنی حیثیت پر اختصار کے ساتھ گفتگو کی جائے گی کہ درحقیقت کسی زبان کی ترقی کے بنیادی عناصر اور اس کے کمال کا اصلی معیار یہی ہیں، یعنی اُردو زبان لسانی اور

لغوی حیثیت سے کتنی وسیع اور قواعد کی حیثیت سے کتنی جامع اور مکمل ہے، اور اس میں دقیق علمی مباحث اور علم و فن کی کتابوں کی تالیف و تصنیف کی کتنی صلاحیت ہے، اس کا علمی سرمایہ کس قدر اور اس میں تمدنی الفاظ کا ذخیرہ کتنا ہے، اور وہ ایک متمدن زندگی کی ضروریات کا کہاں تک ساتھ دے سکتی ہے، ان تینوں پہلوؤں سے ہندوستان کی زبانوں میں اردو کا درجہ نہایت بلند ہے، آئندہ سطور میں اس کی تفصیل پیش کی جاتی ہے۔

اُردو زبان کی پیدائش اُس کے اجزاء اور عناصر

اُردو زبان کی تعمیر اگرچہ ہندوستان میں مسلمانوں کی آمد ہی کے زمانہ سے شروع ہوگئی تھی، مگر مستقل زبان کی حیثیت اس کو مغلوں کے دورِ زوال میں حاصل ہوئی، اس لحاظ سے اس کی عمر چند صدیوں سے زیادہ نہیں ہے، اور اس کی علمی عمر تو اس سے بھی کم ہے، زبانوں کی پیدائش اور ترقی کے لئے چند صدیوں کی مدت بہت کم ہے، مگر اتنی مختصر مدت میں اُردو نے جتنی ترقی کی ہے، اس کی مثال زبانوں کی تاریخ میں مشکل سے مل سکتی ہے، اس موقع پر ہمارا مقصد اُردو کی تاریخ بیان کرنا نہیں ہے، اس سے آپ حضرات واقف ہیں، مختصراً اتنا کہہ دینا کافی ہے کہ اُردو دوسری زبانوں کی طرح کوئی مستقل زبان نہیں تھی، بلکہ مسلمانوں کے ہندوستان میں آنے کے بعد اُن کے اور ہندوؤں کے میل جول سے پیدا ہوئی، عرب، ترک، مغل اور پٹھان وغیرہ جب ہندوستان آرہے اُس وقت وہ ہندوستان کی زبانوں سے ناواقف تھے، مگر ہندوستان میں مستقل بس گئے تھے، ہندوؤں سے ہر وقت کا سابقہ اور میل جول تھا، اس لئے دونوں

ایک دوسرے کی بات سمجھنے اور سمجھانے کے لئے کچھ اپنی زبان، اور کچھ مخاطب کی زبان کے الفاظ استعمال کرنے پر مجبور ہوئے، اس طرح عربی، فارسی، ترکی، ہندی، سنسکرت اور ہندوستان کی دوسری زبانوں سے مل کر ایک نئی زبان کا ہیولیٰ تیار ہوا، جس نے رفتہ رفتہ ترقی کر کے ایک مستقل زبان کی شکل اختیار کر لی، جو اُردو کہلائی، اس لئے اس زبان میں مذکورہ بالا تمام زبانوں کے الفاظ موجود ہیں، مگر ہندوستانی زبانوں کے الفاظ کی کثرت ہے، مسلمانوں کے بعد جو یورپین قومیں ہندوستان آئیں، مثلاً پرتگالی اور انگریز ان کی زبانوں کے الفاظ بھی اردو میں داخل ہوتے گئے، گو پرتگالیوں کا اثر جنوبی ہند سے آگے نہیں بڑھا اور ان کا زمانہ بھی بہت کم رہا، اس کے باوجود اردو میں پرتگالی زبان کے بہت سے الفاظ ہیں، مثلاً مستری، آیا، پادری، نیلام اور بالٹی وغیرہ اور انگریزی کے الفاظ تو اس کثرت سے ہیں کہ ان کا شمار مشکل ہے، اور ہماری ہر گفتگو میں دو چار الفاظ انگریزی کے ضرور آجاتے ہیں، ان میں سے بیشتر الفاظ اس قدر عام ہو گئے ہیں کہ جنھیں دیہاتی بھی بے تکلف بولتے اور سمجھتے ہیں، اور اس اخذ و استفادہ کا سلسلہ برابر جاری ہے اور اب تک انگریزی کے نئے نئے الفاظ برابر اُردو میں داخل ہوتے رہتے ہیں، ہندی کا دور ابھی چند ہی دنوں سے شروع ہوا ہے، مگر اس مختصر زمانہ میں اس کے بہت سے نئے الفاظ مثلاً سماج، جنتا، نیتا، سبھاپتی، سجنو، سواگت وغیرہ اُردو میں استعمال ہونے لگے ہیں۔

اُردو زبان کی وسعت | اس تفصیل کا مقصد یہ ہے کہ اُردو چونکہ مختلف زبانوں سے

مل کر بنی ہے، اس لیے اس کا دامن بہت وسیع ہے، اور دوسری زبانوں سے اس کے لین دین کا سلسلہ برابر جاری ہے، اس لیے آئندہ بھی ترقی کی جتنی صلاحیت اُردو میں ہے وہ ان زبانوں میں نہیں ہو سکتی جو اپنا ناتہ اپنے ہی خاندان تک محدود رکھنا چاہتی ہیں، اور اپنی برادری کے رائج الفاظ کو بھی جات باہر کر رہی ہیں۔

مفرد الفاظ اور لغات کے علاوہ مرکب الفاظ، محاوروں، کہاوتوں، اور ضرب الامثال کا اتنا ذخیرہ اُردو میں ہے، جس کی مثال مشکل سے کسی دوسری زبان میں مل سکتی ہے، اس کی وجہ یہ ہے کہ ہر زبان میں زیادہ تر اسی زبان کے محاورے وغیرہ ہوتے ہیں، مگر اُردو میں فارسی، عربی، ہندی، سنسکرت اور انگریزی وغیرہ کے بہت سے ضرب الامثال اور کہاوتیں آگئی اس لیے اس حیثیت سے بھی اس کا دامن بہت وسیع ہے، مولفین لغت نے عموماً ہر لفظ کے ماتحت ان سے متعلق محاورے اور ضرب الامثال بھی لکھ دیے ہیں، اور خاص اس موضوع پر مستقل کتابیں بھی لکھی گئی ہیں۔

مولوی سید احمد صاحب دہلوی نے اپنی کتاب فرہنگ آصفیہ میں اس کے مندرجہ الفاظ کی تعداد اور اُردو میں مختلف زبانوں کے الفاظ کے تناسب کی تفصیل بھی تحریر کر دی ہے، جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ فرہنگ آصفیہ میں کل ۵۴۰۰۹ الفاظ ہیں، ان میں سے ۲۱۶۴۴ ہندی کے ہیں، ۱۷۵۰۵ وہ الفاظ ہیں جو ہندی اور عربی و فارسی وغیرہ سے مل کر بنے ہیں، یہ بھی گویا ہندی یا کم از کم ہندوستانی ہیں، ۵۵۴ سنسکرت کے ہیں ۷۵۸۴ عربی کے اور ۶۰۴۱ فارسی کے

۵۰۰ انگریزی کے اور ۱۵۰ دوسری مختلف زبانوں کے ہیں۔

اس سے معلوم ہوگا کہ اُردو میں عربی و فارسی الفاظ کے مقابلہ میں ہندی کے الفاظ کی تعداد کتنی غالب ہے اُردو کے تقریباً تمام مصادر، افعال، ضمیریں اور اکثر حروف ہندی کے ہیں، اسماء و صفات البتہ عربی و فارسی کے زیادہ ہیں جو بالکل فطری ہے، اس لیے کہ مسلمان بہت سی ایسی چیزیں اپنے ساتھ لائے تھے جو ہندوستان میں نہیں تھیں، اس لیے اُن کے نام خواہ مخواہ عربی یا فارسی کے ہوں گے، جس طرح آج سائنس کی بہت سی ایجادات و اختراعات اور انگریزوں کی لائی ہوئی چیزوں کے نام انگریزی ہیں جن کا اُردو اور ہندی میں کوئی بدل نہیں ہے۔

فرہنگ آصفیہ انیسویں صدی کے آخر اور بیسویں صدی کے شروع کی تصنیف ہے، اس لیے اس کے لغات کی تعداد آج سے نصف صدی پیشتر کی ہے، اور اُردو کی اصلی ترقی کا زمانہ یہی ہے، اس لیے اب اُس کے الفاظ کی تعداد فرہنگ آصفیہ کے مندرجہ لغات سے کہیں زیادہ بڑھ گئی ہے۔

اردو زبان کے سابقے اور لاحقے

اردو زبان کے مرکبات اور سابقوں اور لاحقوں نے بھی اس میں بڑی وسعت پیدا کی ہے، اس میں کسی لفظ کے شروع یا آخر میں کوئی جز بڑھا دینے سے ایک نیا لفظ بن جاتا ہے، سابقے اور لاحقے زیادہ تر آریائی زبانوں میں پائے جاتے ہیں، اُردو بھی اصل و نسل کے اعتبار سے آریائی اور ہندی، فارسی اور سنسکرت وغیرہ سے مرکب ہے اس لیے ان سب کے سابقے اور لاحقے اُردو کے حصہ میں آئے، ان سے

اس میں بڑی وسعت پیدا ہوئی، مولوی وحید الدین سلیم مرحوم نے اپنی کتاب وضع اصطلاحات میں اس کی پوری تفصیل لکھی ہے۔ ان میں سے کچھ بطور مثال کے یہ ہیں:—

ہندی کے سابقے:— اٹل، اچھوتا، ان بن، ان پڑھ، تیج رنگا، پنچ کلیان، پردیس، پرایا، تپائی، تکونا، تربھون، ترپھلا، چوپائی، چوپال، سڈول، سپوت، نڈر، نڈھال، نرادھا، نراس، مہابلی اور مہابھارت وغیرہ۔

ہندی کے لاحقے:— بہناپا، بڑھاپا، ٹھیالا، کوڑیالا، فراٹا، سناٹا، لڑکپن، بچپن، لہار، سنار، بنجارا، بھٹیارا، کوچوان، پیچوان، پیاس، مٹھاس، سپیرا، لٹیرا، پھرتیلا، شرمیلا، پیراک، چالاک، اٹھان، لگان، سسرال، ننھیال، ددھیال، ہمالہ، شوالہ، گھٹاو، بڑھاو، بناوٹ، لگاوٹ، جبڑاول، ہریاول، لکھائی، پڑھائی، لکھت، پڑھت، نوتوڑ، منھ توڑ، ادھر ادھر، دھرم سالہ، گدوسالہ، ٹھنڈک، کالک، چمکارنا، پھٹکارنا، دھونکنا، جھونکنا وغیرہ۔

فارسی کے سابقے:— باقاعدہ، باضابطہ، برآمدہ، برآورد، بے ادب، بے اثر، پابند، پاپیادہ، پایۂ تخت، پائمال، پس انداز، پس پا ل، پیشگی، پیشکار، تہ بند، تہ خانہ، خوردبین، خودپرست، خوش اسلوبی، خوش گلوئی، زیر بار، زیر دست، زودرنج، زودگو، سرسبز، سرپرست، شہنائی، شہتیر، نااتفاقی، ناانصافی، نوآموز، نوتوڑ، نیم بسمل،

نیم جان، ہم آہنگ، ہمسر، اک طرف، اک مشت وغیرہ۔

عربی کے سابقے:۔ صاحب اختیار، ذی وجاہت، ذی حیثیت، ذی مروّت، غیر موزوں، غیر آباد، لااُبالی، لاخیرا، میر شکار، میر مجلس وغیرہ۔

فارسی لاحقے:۔ معنی آفرین، نکتہ آفرین، رونق افروز، دل افروز، ہمت افزا، حوصلہ افزا، گل افشاں، گوہر افشاں، سایہ فگن، پرتو فگن، زنگ آلود، غبار آلود، عبرت آموز، سبق آموز، خلل انداز، رخنہ انداز، دور اندیش، عاقبت اندیش، درد انگیز، تعجب انگیز، حملہ آور، زبان آور، زیر بار، بردبار، دھوکے باز، دغا باز، شعبدہ باز، قمار باز، خوش باش، یار باش، فیل بان، باغبان، غاشیہ بردار، علم بردار، سربستہ، کمربستہ، ازار بند، ہتھیار بند، زمین بوس، فلک بوس، دوربین، باریک بین، کارپرداز، انشاپرداز، سرپرست، حق پرست، بندہ پرور، سخن پرور، پلنگ پوش، میز پوش، فلک پیما، جادہ پیما وغیرہ۔

فارسی میں سابقوں اور لاحقوں سے اتنے کثیر الفاظ بنے ہیں کہ ان کے نمونے بھی اس مختصر مضمون میں نہیں نقل کیے جا سکتے۔ اس کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ ہر حرف تہجی سے کئی کئی سابقے اور لاحقے، اور ان سے بکثرت الفاظ بنے ہیں، جن سے اصحاب نظر واقف ہیں۔

ان کے علاوہ اردو میں بکثرت مرکبات ہیں، یہ مرکبات خالص ہندی خالص فارسی اور خالص عربی کے بھی، اور ان سے مل کر بھی بنے ہیں۔

خالص ہندی کے مرکبات:۔ اکاس بیل، باگ ڈور، جل ترنگ،

چاندرات، ڈھنگ بدیا، جنم پتری، چاند گہن، دیا سلائی، چڑی مار، منھ توڑ، دھواں لیک، مکھی چوس، لال بجھکڑ، اندھیر نگری وغیرہ۔

خالص فارسی کے مرکبات:۔ پاک دامن، نیک بخت، شادی مرگ، گل روغن اور سبزہ آغاز وغیرہ

خالص عربی کے مرکبات:۔ عالی شان، میر مجلس، خیر مقدم، لطیف الطبع، صدر مقام وغیرہ۔

فارسی اور ہندی کے مرکبات:۔ نیک چلن، گلاب جامن، سبزی منڈی، جگت استاد، گھر داماد وغیرہ۔

عربی اور ہندی کے مرکبات:۔ کفن چور، جیب گھڑی، عجائب گھر، عمر پٹہ، امام باڑہ، موتی مسجد وغیرہ۔

عربی اور فارسی کے مرکبات:۔ سفر خرچ، عمر قید، نازک خیال، نمک حلال، دستخط وغیرہ۔

اردو میں اس قسم کے الفاظ کا بڑا ذخیرہ ہے۔

اردو میں عمل تھنید اس سلسلہ میں ایک اور نکتہ قابل لحاظ ہے، وہ یہ کہ ہر زبان کا ایک خاص مزاج ہوتا ہے، اور اس کے تمام الفاظ اس کے مطابق ہوتے ہیں، اور وہ بیرونی زبان کے انہی الفاظ کو قبول کرتی ہے جو اس کے مزاج کے مطابق ہوتے ہیں، یا اُن میں تصرف کرکے اُن کو اپنے مزاج کے مطابق بنا لیتی ہے، اور جو الفاظ اس کے مزاج سے میل نہیں کھاتے، ان کو رد کر دیتی ہے، یہ تصرف لفظ کی ظاہری شکل اور معنی دونوں میں ہوتا ہے، اور کبھی صرف معنی

میں ہوتا ہے، اس کو عربی میں تعریب، فارسی میں تفریس اور اُردو میں تہنید کہتے ہیں، اگرچہ اس عمل سے دنیا کی کوئی زبان بھی خالی نہیں ہے، لیکن اردو چونکہ مختلف زبانوں سے مل کر بنی ہے، اس لیے اس میں یہ عمل سب سے زیادہ ہے جو اُس کی وسعت و ترقی کا ایک بڑا راز ہے۔

اُردو میں ہر زبان کے اس قسم کے بکثرت الفاظ ہیں، جن میں تصرف کر کے اُردو نے ان کو اپنا لیا ہے، ان الفاظ کی مثالیں جن کی صورت بدل گئی ہے، مگر پُرانے معنی قائم ہیں، خیر سلّا، افرا تفری، کسگر، راج، بک بک، جھک جھک، دستپنا، ان کی اصل، خیر و صلاح، افراط و تفریط، راج (بمعنی معمار) اور زق زق بق بق، اور دست پناہ ہے۔

وہ الفاظ جن کی شکل قائم ہے مگر معنی بدل گئے ہیں، سیکڑوں ہیں مثلاً نقد، جناب، حضرت، دولت، غارت، عرض، مقدمہ، متین، میزان، مذاق، اہتمام، انتظام، غلام، فرض، فوج، شکل، منظور، مغرور، انکسار، عمارت، کسر، اجلاس، ضابطہ، تقریر، اقبال، ادبار، خراب، وقت، امیر، غریب، تربت، غرض، عرصہ، مدت، موضع، بخار، حلوا، دہشت، اشتہار، مبلغ، اور حقہ۔

ان کے اصلی معنی بالترتیب پرکھنے، چوکھٹ، پیشگاہ سلطانی، ایک ہاتھ سے دوسرے ہاتھ میں جانے، لوٹنے، پھیلانے، آگے کیا ہوا، بھاری مضبوط تول ترازو، چکھنے، خم کھانے، دھاگے میں پرونے، لڑکے، واجب کرنے، جھنڈ گروہ، مثل و مشابہ دیکھے گئے، دھوکا، لوٹنے آباد کرنے، بٹھانے،

نگاہ رکھنے والے، ثابت کرنے، سامنے آنے، پیچھے آنے، دیران، باریکی، حاکم، مسافر، مٹی، نشانہ، سیدان، درازی، جگہ، بھاپ، میٹھے، احسان، حیرانی، خواہش، پہنچا ہوا، اور ڈبہ کے ہیں، مگر اردو میں ان کے معنی دام کی فوری ادائگی، تعظیمی لفظ، زر و مال، بربادی، پیش کرنے، عدالت کے مقدمہ، مہذب، اعداد کی جمع، ظرافت و بذلہ سنجی، انتظام کرنے، بندہ چاکر، ذمہ داری، تشکر، شکل و صورت، قبول کرنے، اپنی بڑائی کے احساس، خاکساری، بڑے مکان، عیب کمی، عدالت کی نشست، قانون قاعدہ۔ تقریر کرنے، خوش قسمتی، بدقسمتی، دیران و بدمست، مشکل، دولت مند، مفلس، قبر، مقصد، مدت، گاؤں، تپ، حلوا، خوشامد، خون کھانے کی خواہش، روپیوں کی تعداد اور حقہ کے ہو گئے ہیں۔[1]

اُردو میں اس قسم کے فارسی اور ہندی کے سیکڑوں الفاظ ہیں، اسی قسم کے تصرفات ہندی اور سنسکرت کے الفاظ میں بھی ہوئے ہیں، مثلاً ہندی کا مینھو، گھوڑا، ہستیاؤ، برکھا، کنولو، کمبار دیا کمسکار، چندر، ورش، چتر دھر، درت، دگدھ، اور ہست، اُردو میں مینھ، گھوڑا، گدہا، ہاتھی، برسات، کنول، کمھار، چاند، برس، چودھری، بات، دودھ، اور ہاتھ ہو گیا، انگریزی میں لالٹین اور ریل وغیرہ اُس کی مثالیں ہیں۔

زبان کی ترقی کے لئے دوسری زبانوں سے استفادہ ضروری ہے

دنیا کی کوئی زبان بھی اس اخذ و استفادہ اور لین دین سے خالی نہیں ہے اور نہ اس کے بغیر کوئی زبان

[1] حضرت الاستاذ مولانا سید سلیمان ندوی مرحوم نے ایک مضمون تنقید مطبوعہ معارف میں اس قسم کے اور بہت سے الفاظ لکھے ہیں۔

ترقی کر سکتی ہے، عربی باوجودیکہ نہایت وسیع زبان ہے، مادوں، مصادر، اور
مشتقات کی کثرت و وسعت میں کم زبانیں اس کا مقابلہ کر سکتی ہیں، مگر اس میں
علمی و تمدنی الفاظ کا ذخیرہ نہیں تھا، اس لیے جب دوسری قوموں سے مسلمانوں کا
اختلاط اور ان کی علمی و تمدنی ترقی کا آغاز ہوا، تو انھوں نے یونانی، پہلوی اور
ترکی زبانوں کے سیکڑوں علمی و تمدنی الفاظ و اصطلاحیں بجنسہٖ یا تھوڑے تغیر
کے ساتھ عربی میں منتقل کر لیں، بلکہ عربی میں کچھ لاطینی اسپینی اطالین الفاظ و اصطلاحات
بھی پائی جاتی ہیں[1]۔ اور یہ تمام الفاظ اس طرح عربی میں جذب ہو گئے ہیں کہ مبصرین
و ماہرین لغت کے علاوہ دوسرے لوگ ان کی اصل کا پتہ بھی نہیں چلا سکتے، ان کو
عربی میں معرب اور دخیل کہتے ہیں۔

عربی نے تو سنسکرت، اور ہندوستانی زبانوں سے استفادہ میں بھی عار
نہیں کیا، چنانچہ صندل، مشک، تنبول، کافور، قرنفل، فلفل، زنجبیل، نیلوفر
جائفل، اطریفل، ہیل، شیخرہ، اہلیلج، قرنس، ترنج، نارجیل اور انبج۔
چندن، موشکا، تمول (پان)، کپور، کرن پھول (لونگ)، پپلی (سیاہ مرچ)، زرنجابیرا
(سونٹھ)، نیلوپھل، ایل (الائچی)، جائے پھل، تری پھل، شکھر (توتیا)، ہڑ (ہلیلہ)
کرپاس، نیل، ناریل اور آم کا معرب ہیں، ان میں مشک، زنجبیل اور کافور
کے الفاظ قرآن مجید میں موجود ہیں۔

عربی زبان کی اسی وسعت قلب کا یہ نتیجہ تھا کہ وہ کسی زمانہ میں بھی علم
و تمدن کا ساتھ دینے سے قاصر نہیں رہی، اور بغداد کی عباسی اور اسپین کی

---

[1] عربی اور انگریزی کی لغت الفرائد الدریہ میں اس کی پوری تفصیل ہے۔

اموی حکومتوں کا سارا کارخانہ جو اپنے زمانہ کی سب سے زیادہ متمدن اور ترقی یافتہ حکومتیں تھیں اور علم و تمدن میں اس زمانہ کی کوئی حکومت ان کا مقابلہ نہیں کر سکتی تھی، عربی ہی زبان سے چلتا رہا، اسی طریقے سے فارسی اور ترکی نے عربی سے بھی استفادہ کیا، بلکہ ان دونوں زبانوں کا تانا بانا ہی عربی زبان پر قائم ہے، اگر عربی الفاظ ان سے نکال دیے جائیں، تو ان کی علمی و ادبی حیثیت ختم ہو جائے گی، اب سے کچھ دنوں پہلے جب اندھی وطنیت اور قومیت کی ہوا چلی تھی، تو ان دونوں زبانوں سے عربی الفاظ کو نکالنے کی کوشش شروع ہوئی تھی، مگر بہت جلد اس کا تجربہ ہو گیا کہ عربی الفاظ نکل جانے کے بعد ان کی حیثیت ہی بالکل ختم ہو جاتی ہے، اس لیے یہ تحریک ختم ہو گئی، اور اب دونوں زبانوں میں بے تکلف عربی کے رائج الفاظ استعمال کیے جاتے ہیں، جس کی تصدیق ان کی کتابوں، اخبارات اور رسالوں سے ہو سکتی ہے۔

اس زمانہ کی سب سے زیادہ عالمگیر اور وسیع زبان انگریزی ہے، مگر اس میں جس کثرت سے لاطینی اور یونانی الفاظ ہیں ان سے اس زبان کے ماہرین پوری طرح واقف ہیں، بلکہ مسلمانوں کے عروج کے زمانہ میں اسپین و سسلی کی درسگاہوں اور جنگ صلیبی کے وسیلہ سے عربی کے جو الفاظ و اصطلاحیں انگریزی اور یورپ کی دوسری زبانوں میں داخل ہوئی تھیں، وہ بجنسہٖ آج تک موجود ہیں، خواجہ کمال الدین مرحوم نے ام الالسنہ میں اس قسم کے الفاظ کی بڑی طویل فہرست دی ہے، گو اس میں جابجا مبالغہ سے کام لیا گیا ہے، مگر اس میں شبہہ نہیں کہ آج بھی انگریزی میں عربی کی بہت سی علمی اصطلاحات موجود ہیں، الجبرا اور الکحل

سے تو ہم آپ سب واقف ہیں، مسلمانوں کا زیادہ واسطہ اسپین، پرتگال، سسلی، اٹلی اور فرانس سے رہا ہے اس لئے ان تمام زبانوں میں بہت سے عربی کے الفاظ ہیں، شام کے مشہور فاضل کرد علی نے اپنی کتاب الاسلام والحضارۃ العربیۃ میں اس پر ایک مستقل باب لکھا ہے، اس تفصیل کا مقصد یہ ہے کہ دنیا کی تمام ترقی یافتہ زبانوں نے دوسری زبانوں کے وہ الفاظ قبول کیے ہیں، جن کا بدل ان میں نہیں تھا، اس کے بغیر کوئی زبان ترقی کر ہی نہیں سکتی، اس وصف میں اُردو زبان سب زبانوں سے آگے ہے بلکہ اس کا وجود ہی مختلف زبانوں کے مجموعہ سے وجود میں آیا ہے، اس لئے اس حیثیت سے وہ جس قدر وسیع زبان ہے اور اس میں ترقی کی جتنی استعداد ہے وہ کسی دوسری زبان میں نہیں ہے۔

اُردو میں بولیوں کا تنوع لہجوں اور بولیوں کے لحاظ سے بھی اُردو میں بڑا تنوع اور بڑی وسعت ہے، گو ہر زبان میں مختلف طبقوں کی بولیوں میں کچھ نہ کچھ فرق ہوتا ہے لیکن یہ فرق جس قدر اُردو میں ہے، کسی زبان میں نہیں ہے، اس میں شہری، دیہاتی، تعلیم یافتہ اور جاہل طبقوں پھر خود شہر کے مختلف طبقوں کی زبان میں نمایاں فرق ہے، اس کی نیرنگی سرشار کے فسانہ آزاد میں نظر آسکتی ہے، عورتوں کی زبان اور اُن کے محاورات بالکل جدا ہیں، لکھنؤ کی بیگماتی زبان مشہور ہے، اس کے نمونے بھی فسانہ آزاد میں موجود ہیں، شاعری میں اس کا نمونہ ریختی ہے، اس کے سب سے اچھے اور بہتر نمونے دلی کے بعض ادیبوں کی کتابوں خصوصاً آغا حیدر بیگ اور مرزا فرحت اللہ بیگ دہلوی کی تحریروں میں ملتے ہیں، ان کے مجموعہ مضامین چھپ چکے ہیں۔

طرزِ انشا کا تنوع یہی جامعیت اور تنوع اُردو کے طرزِ انشا میں بھی ہے، بعض زبانیں اپنی ساخت کے اعتبار سے علم و فن کے لیۓ زیادہ موزوں ہوتی ہیں، بعض شعر و ادب کے لیۓ بعض بزم کے لیۓ مناسب ہوتی ہیں اور بعض رزم کے لیۓ اُردو میں ان سب کی جامعیت ہے، اس میں فلسفہ کے دقیق سے دقیق مسائل و مباحث کو بھی آسانی کے ساتھ تعبیر کیا جا سکتا ہے اور شاعرانہ نازک خیالی بھی دکھائی جا سکتی ہے، اس سے رجز کا بھی کام لیا جا سکتا ہے اور موسیقی و ترنم کا بھی، بزم ناز کی بھی مصوری کی جا سکتی ہے اور میدان جنگ کی ہولناکی بھی دکھائی جا سکتی ہے، زلزلے اور طوفان کا شور بھی دکھایا جا سکتا ہے، اور نسیم سحر کی اٹھکھیلیاں بھی، غرض اُردو کی انشا اور اس کے اسالیب بیان میں بڑا تنوع اور بڑی جامعیت ہے، علم و فن اور شعر و ادب کا کوئی ایسا شعبہ نہیں ہے جس کا ذخیرہ اُردو میں موجود نہ ہو، اس کی تفصیل آئندہ آۓ گی۔

مرزا غالب اور سر سید کے زمانہ سے لے کر اس وقت تک بہت سے صاحب نظر ادیب پیدا ہوۓ، غالب، سر سید، حالی، شبلی، نذیر احمد، محمد حسین آزاد، رتن ناتھ سرشار، پریم چند، مولانا ابو الکلام آزاد، مولوی عبد الحق صاحب، مولانا سید سلیمان ندوی، مولانا عبد الماجد دریابادی، قاضی عبد الغفار صاحب، خواجہ حسن نظامی، مرزا فرحت اللہ بیگ، اور پروفیسر رشید احمد صدیقی وغیرہ سیکڑوں ادیبوں میں سے چند نام ہیں، ان میں ادیب دانشاپرداز بھی ہیں، اور مورخ و فلسفی بھی، اور ان سب کا طرز تحریر اور اُن کی

خصوصیات جدا جدا ہیں، جن سے آپ حضرات واقف ہیں، اس لئے اس کی تفصیل کی ضرورت نہیں ہے۔

حروفِ تہجی کی وسعت

حروفِ تہجی کے لحاظ سے بھی اُردو میں بڑی وسعت ہے، ہندی، عربی، فارسی، ترکی، انگریزی وغیرہ سب کے مخارج کے حروف اور اُن کی آوازیں اس میں موجود ہیں، اور ان کی تعداد ان تمام زبانوں کے حروف تہجی سے زیادہ ہے[1]۔ اس کا ایک فائدہ یہ ہے کہ ان تمام زبانوں کے الفاظ اردو میں کھپ جاتے ہیں، اور ان کی شکل بگاڑنے کی کم ضرورت پیش آتی ہے، دوسرا یہ کہ اُردو داں ان سب زبانوں کے حروف اور الفاظ کا صحیح تلفظ کر سکتے ہیں، اس کے برخلاف مذکورہ بالا زبانیں بولنے والے اپنی زبان کے علاوہ دوسری زبان کے الفاظ کا صحیح تلفظ مشکل سے کر سکتے ہیں، گو اب تقریباً سب زبانوں میں دوسری زبانوں کی آوازوں کے لئے مرکب حروف بنا لیے گئے ہیں۔ اس کے رسم الخط کی سب سے بڑی خصوصیت اختصار اور زود نویسی ہے اور وہ لکھنے میں کم سے جگہ لیتا ہے، اور بہت جلد لکھا جاتا ہے، لیکن اس کے حروف تہجی کی کثرت اور رسم الخط کی وجہ سے اس کی تعلیم اور ٹائپ بنانے میں بعض دشواریاں بھی پیدا ہو گئی ہیں، جن کے حل کرنے کی ضرورت ہے۔

اُردو قواعد کی تدوین کی تاریخ

یہاں تک اُردو کی لسانی وادبی حیثیت پر گفتگو تھی، اب اس کے قواعد کے متعلق کچھ باتیں کہنی ہیں، یہ مسلم بات ہے کہ اہل زبان کو

---

[1] اردو کے حروف تہجی ۳۸ ہیں فارسی کے ۳۵، انگریزی کے ۲۶ اور ہندی کے ۳۶۔

قواعد جاننے کی ضرورت نہیں ہوتی، عموماً اس لئے عوام اور جہلا تک، قواعد کے علم کے بغیر صحیح زبان بولتے ہیں، قواعد کی ضرورت غیر اہل زبان کے لئے پیش آتی ہے، اسی لئے ہر زبان میں قواعد کی ترتیب دوسروں کی تعلیم کے لئے عمل میں آئی ہے، عربی نہایت وسیع زبان ہے، اس کی زمانہ جاہلیت کی شاعری مشہور رہی ہے، اس زمانہ میں بڑے بڑے زبان آور خطیب بھی پیدا ہوئے اور زمانہ جاہلیت سے لے کر اسلام کے تقریباً ایک صدی بعد تک کا سارا ادبی سرمایہ قواعد کے بغیر وجود میں آیا، بنی امیّہ کے زمانہ میں جب عجمی اور رومی قومیں مسلمان ہوئیں، اور قرآن مجید کی تلاوت میں غلطیاں کرنے لگیں، اس وقت اُن کی عربی تعلیم کے لئے عربی صرف و نحو مرتب کی گئی، تقریباً یہی حال دوسری زبانوں کے قواعد کی تدوین کا بھی ہے۔

اُردو کے کسی اہل زبان شاعر اور ادیب کو قواعد کی ضرورت نہیں پیش آئی اور وہ اس کی مدد کے بغیر صحیح اُردو لکھتے اور بولتے رہے، البتہ شاعروں کو کسی قدر علم عروض سے واقفیت کی ضرورت ہوتی ہے، وہ بھی اس لئے کہ شاعری میں اظہار خیال کا دامن بہت تنگ ہے اور اُردو شاعری کی بنیاد عربی اور فارسی شاعری پر ہے، اور اس میں عروض و قوافی کے قواعد پہلے سے موجود تھے، جن کی پابندی دونوں زبانوں کے شعراء کرتے چلے آرہے تھے اس لئے یہ پابندی اُردو شعراء کے حصہ میں بھی آئی، لیکن زمانہ حال کے بہت سے شعراء عروض سے واقفیت کے بغیر، محض ذوق کی رہنمائی میں اچھی خاصی شاعری کر لیتے ہیں، گو کبھی کبھی اس میں غلطی بھی کر جاتے ہیں، اور نثر میں چونکہ کسی قسم کی

پابندی نہیں ہے، اس لیے اس میں قواعد سے واقفیت کی ضرورت پیش نہیں آتی،
سب سے پہلے اُردو قواعد کی ضرورت اہل یورپ کو محسوس ہوئی، جب
انھوں نے ہندوستان کی سرزمین میں قدم رکھا، چنانچہ اٹھارھویں صدی کے
آغاز سے انیسویں صدی کے شروع تک اُردو قواعد کی تمام ابتدائی کتابیں جن کی
تعداد ایک درجن سے زیادہ ہوگی[1] ان ہی کی لکھی ہوئی ہیں، ہندوستانیوں
میں سب سے پہلے انیسویں صدی کے آغاز میں انشاء اللہ خاں نے دریائے لطافت
اور اسی زمانہ میں حکیم احمد علی یکتا لکھنوی نے دستور الفصاحت لکھی، اس کے
بعد سے ہندوستانیوں میں اردو قواعد کی ترتیب و تدوین کا سلسلہ شروع ہوا
اور انیسویں صدی میں بہت سی کتابیں لکھی گئیں، جن کا سلسلہ اب تک
جاری ہے،

اردو قواعد میں ایک غلطی اور اُس کی اصلاح

لیکن ہمارے قواعد نگار عرصہ تک ایک غلطی میں مبتلا رہے
وہ یہ کہ اُردو آریائی زبان ہے، اور اُس کے قواعد نہ
صرف عربی بلکہ فارسی اور ہندی سے بھی مختلف اور اپنی مستقل حیثیت رکھتے ہیں
مگر اُردو کے قواعد نگار اس میں عربی اور فارسی قواعد کی پیروی کرتے رہے، جو
اُردو کے مزاج اور ساخت سے مطابقت نہ کرتے تھے، ان کی اصطلاحات کے
استعمال میں البتہ مجبوری تھی، سب سے اول مولوی محمد اسماعیل صاحب نے اس
روش سے ہٹ کر جدت سے کام لیا، اور نئے طرز سے اُردو کے قواعد کی تدوین کی
مگر اُن کی کتاب بہت مختصر اور درسی ضرورت کے لیے تھی، تاہم اس نقش اول سے

---

[1] مولوی عبدالحق صاحب نے اپنی کتاب قواعد اُردو میں اس کی پوری تفصیل لکھی ہے۔

آئندہ لکھنے والوں کے لئے ایک نئی راہ کھل گئی، اس کے بعد مولوی عبدالحق صاحب نے اس کی جانب توجہ کی، اور عربی اور فارسی کے قواعد کی شاہراہ سے الگ ہٹ کر اُردو کے مستقل قواعد لکھے، جو چھپ کر شائع ہو چکے ہیں، پھر اسی نہج پر مولوی زین العابدین کوتانوی نے آئین اُردو لکھی، ان کے علاوہ اُردو میں درسی ضرورت کے لئے قواعد کی اور بھی بہت سی کتابیں لکھی گئیں، اور اب ان کا اچھا خاصا ذخیرہ فراہم ہو گیا ہے، لیکن اب بھی ایک مبسوط، جامع اور مکمل اور ایک مختصر بنیادی قواعد کی ضرورت ہے، جس سے اُردو کی تعلیم میں سہولت پیدا ہو۔

اردو لغت کی تدوین

لغات کی تدوین کے متعلق کچھ زیادہ نہیں کہنا ہے، اس کی تدوین بھی اردو کے قواعد کی طرح عمل میں آئی، سب سے پہلے انگریزوں نے لغت کی کتابیں لکھیں، جو زیادہ تر معمولی درجہ کی ہیں، ان میں فیلن، شیکسپیر اور جان ٹی پلیٹ کی لغتیں نسبتاً اہم اور زیادہ مشہور ہیں، اول الذکر لغت کی تدوین نے مولوی سید احمد صاحب دہلوی نے بھی مدد کی تھی، اسی زمانہ میں منشی امیر مینائی نے امیر اللغات کی تدوین شروع کی تھی، مگر وہ پوری نہ ہو سکی تاہم اس وقت اُردو میں لغت کی متعدد اچھی کتابیں موجود ہیں، ان میں مولوی نور الحسن صاحب مرحوم نیر کاکوروی کی نور اللغات اور خواجہ عبدالمجید لاہوری کی جامع اللغات نہایت جامع مکمل اور کئی ضخیم جلدوں میں ہیں، بلکہ خاص اسلامی اصطلاحوں، اردو محاورات، ضرب الامثال اور مختلف پیشوں کی اصطلاحوں تک پر مستقل کتابیں موجود ہیں[1]، اور اس حیثیت سے بھی اردو کا دامن وسیع ہو گیا ہے۔

[1] جلال لکھنوی، خواجہ عبدالرؤف عشرت، امیر مینائی، حسرت موہانی (باقی ص ۳۲۲ پر)

اُردو زبان کی علمی حیثیت علمی حیثیت سے اُردو ایک ترقی یافتہ اور دولت مند زبان ہے، علم و فن کی جتنی اصطلاحیں اور سنجیدہ علمی و ادبی لٹریچر کا جس قدر ذخیرہ اردو میں ہے، ہندوستان کی کسی زبان میں نہیں ہے، اس کی علمی اصطلاحات دوسری صدی ہجری کے شروع ہی سے بننا شروع ہو گئی تھیں، عباسیوں کے ابتدائی دور میں جب یونانی، سریانی، ایرانی اور ہندی علوم کی فلسفہ، منطق، طب، ریاضی، نجوم اور ہیئت وغیرہ کی کتابوں کا ترجمہ شروع ہوا تو اس کے ساتھ ان علوم کی اصطلاحوں کے ترجمے بھی عربی میں کئے گئے، اور بعض اصل زبانوں کی اصطلاحیں بجنسہ عربی میں شامل کر لی گئیں، چنانچہ فلسفہ و منطق خصوصاً طب میں بکثرت یونانی اصطلاحیں آج تک موجود ہیں پھر جب ان علوم کو مسلمانوں نے ترقی دی اور نئے علوم پیدا کئے، تو اُن کے لئے نئی اصطلاحیں بھی وضع کیں، مثلاً ریاضی میں الجبرا ان ہی کی ایجاد ہے، جس کا پورا نام الجبر و المقابلہ ہے، اب اس کا مختصر الجبرا رہ گیا ہے، اس طریقہ سے دوسرے علوم میں بھی اُن کی بہت سی وضع کردہ اصطلاحات ہیں، فن عمرانیات یا علم الاجتماع کا موجد ابن خلدون ہے، جس کا مقدمہ اس موضوع پر آج بھی بنیادی کتاب شمار کیا جاتا ہے، اور علم الاجتماع کی بہت سی اصطلاحیں ابن خلدون کی بنائی ہوئی ہیں، جو آج بھی رائج ہیں، اسی طریقہ سے حیوانات اور نباتات وغیرہ پر بھی مسلمانوں نے بہت سی

(بقیہ ص۳۲۱) مولوی محمد اسمٰعیل، سید حامد حسین رضوی، دکی احمد خاں زیر ریاست جاورہ، مولوی ظفر الرحمٰن دہلوی وغیرہ نے اردو زبان و لغت کے مختلف پہلوؤں پر کتابیں لکھی ہیں، بہت سے ناموں میں سے یہ صرف چند نام ہیں۔

کتابیں لکھیں، اور ان سب کے لیے اصطلاحیں بنائیں، یہ سارے علوم ان کے ساتھ ہندوستان آئے، اور یہاں کے نصاب تعلیم میں داخل ہوئے، اور صدیوں ان کا رواج رہا، جس سے تعلیم یافتہ طبقہ میں ان علوم کے ساتھ ان کی اصطلاحیں بھی پھیل گئیں، عباسیوں ہی کے زمانہ سے سنسکرت کی بعض اصطلاحیں عربی میں آگئی تھیں، اس کے بعد البیرونی نے کتاب الہند میں جو ہندوستان کے عقائد و تصورات، تہذیب و معاشرت اور علوم و فنون پر بہترین کتاب ہے بہت سی سنسکرت کی اصطلاحیں استعمال کی ہیں، اس کے بعد ہندوستان کے اسلامی سلاطین خصوصاً تیموریوں کے زمانہ میں جب ہندوؤں کی کتابوں اور ان کے علوم و فنون کا فارسی میں ترجمہ کیا گیا، تو اس ذریعہ سے ان کی بہت سی اصطلاحیں فارسی میں آگئیں[1]، عربی اور فارسی کے بعد جب اُردو نے اُن کی جگہ لی، تو ان دونوں زبانوں کی یہ ہزار سالہ میراث بھی اُس کے حصہ میں آئی، اور ایک ہزار سال سے عربی اور فارسی میں مختلف علوم و فنون کی اصطلاحوں کا جو ذخیرہ جمع ہوا تھا وہ سب اردو میں منتقل ہو گیا۔

انگریزوں کے دور میں جب یورپ کے نئے علوم و فنون کی تعلیم شروع ہوئی تو فلسفہ، منطق، ریاضی اور ہیئت وغیرہ میں ان علوم و فنون کی بہت سی قدیم اصطلاحیں قائم رہیں اور ان میں جو نئے اضافے ہوئے اور سائنس نفسیات، معاشیات وغیرہ جو نئے فنون پیدا ہوئے اُن کی اصطلاحوں کے

---

[1] مولانا سید سلیمان ندوی مرحوم نے عرب و ہند کے تعلقات میں عربی کی ان اصطلاحوں کی تفصیل لکھی ہے جو ہندی یا سنسکرت سے ماخوذ ہیں مثلاً ہیئت کی اصطلاح اوج ہندی کا اونچ ہے۔

اُردو ترجمے کئے گئے، اگرچہ تعلیمی ضروریات کی بنا پر اس کا آغاز انگریزوں کے
ابتدائی دور ہی سے ہو گیا تھا، مگر اس کام کو جامعہ عثمانیہ حیدرآباد نے
تکمیل تک پہنچایا، جس میں سارے جدید علوم کی تعلیم اُردو میں ہوتی تھی اس لئے
اُردو میں نئے اور پرانے تمام علوم کی اصطلاحات موجود ہیں، دارالترجمہ
حیدرآباد سے خاص ان اصطلاحوں پر کئی کتابیں شائع ہوئی ہیں، بلکہ
اس سے بھی بہت پہلے پرانے علوم و فنون کی اصطلاحوں اور اُن کی
تشریح پر مستقل کتابیں لکھی گئی ہیں، خود ہندوستان کے ایک فاضل مولانا
محمد علی تھانوی نے اس موضوع پر کشاف اصطلاحات الفنون کے نام
سے دو ضخیم جلدوں میں ایک کتاب لکھی تھی، جو کلکتہ سے شائع ہوئی تھی
اب یہ کتاب نایاب ہے۔

اردو کا علمی ذخیرہ اردو علمی حیثیت سے اگرچہ ترقی یافتہ زبانوں سے
بہت پیچھے ہے، مگر اس کی عمر کے لحاظ سے اس کا علمی ذخیرہ بہت وافر
ہے اور وہ مشرق کی زبانوں میں ترقی یافتہ زبان کہلانے کی مستحق ہے
مگر اس مقالہ میں اس کی علمی حیثیت پر مختصر تبصرہ کی بھی گنجائش نہیں ہے
اس لئے محض سرسری تذکرہ پر اکتفا کیا جاتا ہے،

اردو میں نثر کی تصنیف کی ابتدا دکن سے ہوئی اور چودھویں صدی
عیسوی میں اس کا آغاز ہو گیا تھا خواجہ گیسو دراز المتوفی سنہ ۸۲۵ھ (۱۳۹۸ء) کی معراج العاشقین
اور شاہ برہان الدین بیجاپوری المتوفی سنہ ۹۰۲ھ (۱۴۹۶ء) کی کلمۃ الحق اور مرغوب القلوب
وغیرہ اس دور کی تصنیفیں ہیں، مگر یہ سب دکھنی زبان میں ہیں، ان کا سب سے

سلیس نمونہ ملا وجہی کی سب رس ہے۔

شمالی ہند میں اردو کی تصانیف کا سلسلہ اٹھارھویں صدی کے آغاز محمد شاہ رنگیلے کے زمانہ سے شروع ہو، اور فضلی اور میر محمد عطا حسین وغیرہ نے دہ مجلس اور نوطرز مرصع وغیرہ لکھیں، مگر اس دور کی بیشتر تصنیفات مذہبی یا قصص اور افسانوں پر مشتمل ہیں اور ان کی زبان بھی صاف اور سلیس نہیں ہے۔

اردو کی ترقی کی ابتدا اٹھارھویں صدی کے وسط سے فورٹ ولیم کالج سے ہوئی، اور ڈاکٹر جان گلگرائسٹ کی کوششوں سے، اُس نے صاف وسلیس زبان کی شکل اختیار کی، اور اس میں علمی وادبی تصانیف کا سلسلہ شروع ہوا، اور میر امن دہلوی، میر شیر علی افسوس، میر بہادر علی حسینی، للولال جی، نہال چند لاہوری، اور بینی پرشاد وغیرہ کی تصانیف و تراجم سے اردو میں علمی زبان بننے کی اہلیت پیدا ہوئی، انھوں نے ادبی کتابوں کے ساتھ سنجیدہ علمی تصنیفیں اور اُن کے ترجمے بھی کیے، اس وقت سے اردو میں علمی تصانیف کا سلسلہ شروع ہوا، اور چند ہی دنوں میں وہ اتنی ترقی کر گئی، اور اس کا علمی وادبی ذخیرہ اتنا وسیع ہو گیا کہ اس کی شہرت ہندوستان سے نکل کر یورپ تک پہنچ گئی، اور انیسویں صدی کے وسط میں یورپ کے نفضلا نے اس کی جانب توجہ شروع کر دی، چنانچہ فرانس کے مشہور فاضل اور محسن اردو گارسان دتاسی نے اردو زبان پر اپنے مشہور خطبات دیے، جس کا حال آگے آتا ہے۔

مگر اردو کی ترقی کے لحاظ سے یہ دور بھی درمیانی تھا، اس کی اصلی ترقی کا زمانہ انیسویں صدی کے آخر سے شروع ہوتا ہے، اس کے تمام بڑے بڑے مصنفین اور اصحاب قلم اسی زمانہ میں پیدا ہوئے، اردو زبان کے مستقل ادارے اور اشاعت خانے قائم ہونے لگے، جنھوں نے ہر علم و فن کی بلند پایہ کتابوں اور تصانیف سے اُردو کا دامن بھر دیا اور سنجیدہ علمی تالیف و تصنیف کا عام مذاق پیدا ہو گیا، اور اس کی رفتار اتنی بڑھ گئی کہ نصف صدی کے اندر اردو جیسی تہی دامن زبان علمی زبان بن گئی۔

جدید علوم و فنون کے تراجم اور ان کی تصانیف کا آغاز انگریزی حکومت کے قیام کے ساتھ ہی شروع ہو گیا تھا، اور خود لکھنؤ میں جہاں انگریزوں کے قدم سب کے آخر میں پہنچے، شاہان اودھ کے زمانہ ہی سے اسکول بک سوسائٹی کے نام سے ایک علمی مجلس یا دار الترجمہ قائم ہو گیا تھا، جس نے جدید علوم و فنون کی بہت سی کتابیں شائع کیں، اس ترجمہ اور تصنیف کا سلسلہ انگریزی تعلیم کی توسیع و اشاعت کے ساتھ برابر بڑھتا گیا اور دار الترجمہ حیدرآباد نے اس کو کمال تک پہنچا دیا، اور اردو میں تمام مغربی علوم و فنون منتقل ہو گئے، چنانچہ جامعہ عثمانیہ میں ان سب کی تعلیم اُردو زبان میں ہوتی تھی، اور آج جدید و قدیم علوم میں مذہب و اخلاقیات اور فلسفہ و سائنسی فنون سے لے کر شعر و ادب اور افسانہ و ڈرامہ تک کوئی ایسا علم و فن نہیں ہے جس کی تصانیف یا ترجمے اردو میں موجود نہ ہوں ان سب کی تفصیل کی اس مختصر مقالہ میں گنجائش نہیں ہے۔

اس کا اجمالی اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ فرانس کے مشہور فاضل اور
محسن اردو گارساں دتاسی نے انیسویں صدی کے وسط میں اردو زبان کی تاریخ
و ترقی پر خطبات دیے تھے، جن میں اس کی ہر جہتی ترقی کا جائزہ لیا گیا تھا اس کے
مطالعہ سے معلوم ہو سکتا ہے کہ آج سے ایک صدی پیشتر اردو زبان کتنی ترقی
کر چکی تھی، اور اس کا علمی ذخیرہ کتنا وسیع ہو چکا تھا، اور قدیم فنون کے علاوہ
جدید مغربی علوم کا بھی خاصہ ذخیرہ اس میں فراہم ہو گیا تھا، ان خطبات کا
اردو ترجمہ انجمن ترقی اردو نے شائع کر دیا ہے جس کی ضخامت آٹھ سو صفحات
سے اوپر ہے۔

انڈیا آفس لندن کی مشہور لائبریری کی اردو کی مطبوعہ کتابوں کی
فہرست تین سو صفحات پر مشتمل ہے، جس میں بیاسی جدید و قدیم علوم و فنون کی
کتابیں ہیں، یہ فہرست بلوم ہارٹ نے سنہ ۱۹۰۰ء میں مرتب کی تھی، اس لئے اس میں
بیسویں صدی کی مطبوعہ کتابیں نہیں ہیں، جو اردو کی ترقی کا اصلی زمانہ ہے،
اور یہ کہنا مبالغہ نہ ہوگا کہ اردو کی جس قدر کتابیں انیسویں صدی سے پہلے شائع
ہوئیں، اتنی تنہا اس پچاس سال کے اندر شائع ہوئی ہیں، اور اس کی غیر مطبوعہ
کتابوں کا بھی بڑا ذخیرہ ہے، اس سے اس کے علمی ذخیرہ کا اندازہ ہو سکتا ہے۔

آج سے بیس پچیس سال پہلے مرزا سجاد بیگ دہلوی نے اردو کی مطبوعہ
کتابوں کی ایک فہرست الفہرست کے نام سے کتابی شکل میں مرتب کر کے شائع
کی تھی، افسوس ہے کہ اس مقالہ کی تحریر کے وقت وہ پیش نظر نہیں تھی اس لئے
اس کی کتابوں کی صحیح تعداد نہیں بتائی جا سکی، لیکن جہاں تک خیال آتا ہے

کئی ہزار تھی، اور اس کی ضخامت ایک ہزار صفحوں سے اوپر تھی، اور اس پچیس سال کے عرصہ میں یہ تعداد اور زیادہ بڑھ گئی ہوگی۔[1]

میرے محترم استاذ مولانا سید سلیمان ندوی مرحوم کے وطن دیسنہ ضلع پٹنہ میں ایک کتب خانہ عرصے سے قائم ہے، جس میں اردو کی تمام مطبوعات کے جمع کرنے کا خاص اہتمام کیا گیا ہے، اس کی کتابوں کی تعداد اب سے کئی سال پہلے دس ہزار کے قریب تھی، آپ کے اس شہر لکھنؤ کے صرف ایک مطبع نولکشور نے اردو کی اتنی کتابیں شائع کی ہیں، جن سے اردو کا پورا کتب خانہ قائم ہو سکتا ہے، اور ہندوستان خصوصاً یوپی، بہار، پنجاب کے تمام بڑے بڑے شہروں بالخصوص دلی، لکھنؤ، لاہور، اور حیدرآباد میں اردو کے بکثرت پریس، دارالاشاعت اور مکتبے قائم تھے، اور آج بھی موجود ہیں، جنھوں نے اردو کی

---

[1] الفہرست پہلے بھی اردو کی تمام مطبوعات پر حاوی نہیں تھی، اس میں بہت سی کتابوں کے نام نہیں تھے، اور اب تو اس کی ترتیب و اشاعت پر بھی پچیس سال گزر چکے ہیں، اور اس مدت میں سیکڑوں کیا ہزاروں نئی کتابیں شائع ہو چکی ہیں اس لیے اردو مطبوعات کی ایک جامع اور مکمل فہرست کی بڑی ضرورت ہے، جس سے اس کے علمی و ادبی ذخیرے کا اندازہ ہو سکے، یہ کام کچھ زیادہ دشوار نہیں ہے، ہندوستان کے کتب خانوں کی فہرستوں کی مدد سے آسانی کے ساتھ یہ فہرست تیار ہو سکتی ہے، خصوصاً حیدرآباد کے اردو کے کئی کتب خانوں کی فہرستیں شائع ہو چکی ہیں، انڈیا آفس اور برٹش میوزیم کے کتب خانوں کی فہرستوں سے بھی اس میں بڑی مدد مل سکتی ہے۔

ہزاروں کتابیں شائع کیں، ان کے علاوہ اُردو کی ترقی و اشاعت کے بہت سے ادارے قائم ہوئے، ان میں دار المصنفین، انجمن ترقی اُردو، دار الترجمہ حیدر آباد، ہندوستانی اکیڈمی الہ آباد، اور ندوۃ المصنفین زیادہ اہم ہیں، جنھوں نے اپنی تصنیفات و تراجم سے اُردو کا تصنیفی معیار بلند اور اس کا دامن سنجیدہ علمی تصانیف سے مالا مال کر دیا، اور آج اُردو زبان بھی ایک علمی زبان کہلانے کی مستحق ہو گئی، اس سے اُردو زبان کے علمی ذخیرہ کا سرسری اندازہ ہو سکتا ہے، ع

قیاس کن ز گلستان من بہار مرا

دوسری زبانوں میں اُردو کتابوں کے ترجمے

اُردو زبان کی علمی اہمیت اور اس کے علمی ذخیرہ کی گرانمایگی کا ایک ثبوت یہ بھی ہے کہ مشرق و مغرب کی مختلف زبانوں میں اس کی متعدد اہم کتابوں کا ترجمہ ہو چکا ہے، یوں تو مشرق کی قدیم اقوام و مذاہب اور ان کی تاریخ و تمدن کی تحقیقات کے سلسلہ میں بہت سی قدیم مشرقی زبانوں کی کتابوں کا جن میں کوئی اہم علمی ذخیرہ یا کلاسکل لٹریچر موجود ہے، مستشرقین نے ترجمہ کیا ہے، اس قسم کی ہندوستان کی قدیم کتابوں کا ترجمہ بھی مختلف زبانوں میں ہو چکا ہے، لیکن اُردو جیسی کسی نومولود زبان کی کتابوں کا جس کی عمر چند صدیوں سے زیادہ نہ ہو، اور وہ کوئی قدیم علمی ذخیرہ بھی نہ رکھتی ہو، اُردو کے علاوہ ترجمہ نہیں کیا گیا، اور یہ فخر و امتیاز صرف اُردو کو حاصل ہے کہ اس کی متعدد کتابوں کا ترجمہ ان کی علمی اہمیت کی بنا پر دوسری ترقی یافتہ زبانوں میں کیا گیا۔

ان ترجموں کی بھی دو حیثیتیں ہیں، ایک تو ان کتابوں کے ترجمے ہیں، جن کی کوئی علمی اہمیت نہیں ہے، بلکہ مترجمین نے اردو زبان سے اپنی ذاتی دلچسپی یا اس کے لٹریچر کو اپنی زبان میں روشناس کرنے یا اپنی قوم کی اردو کی تعلیم کے لئے کئے ہیں، مثلاً اردو کے مشہور محسن گارسان دی تاسی نے میر کی مثنوی اژدرنامہ، تحسین الدین کی کامروپ، مسکین کے مرثیوں، نہال چند لاہوری کی تاج الملوک اور بکاؤلی اور میر امن کی باغ و بہار کا فرنچ زبان میں ترجمہ کیا، کلیات ولی مرتب کر کے شائع کیا، اردو اور فرنچ لغت مرتب کی فرنچ میں اردو زبان کی تاریخ اور اس کے مصنفین اور تصانیف پر ایک کتاب لکھی، اس قسم کی اردو کی اور بھی خدمات انجام دیں، یا اردو زبان کے انگریز محسن ڈاکٹر جان گلگرایسٹ نے مختلف حیثیتوں سے اردو زبان کی خدمت کی، اس کے مختلف پہلوؤں پر انگریزی میں کتابیں لکھیں، انگریزوں کی اردو تعلیم کے لئے متعدد کتابیں تالیف کیں، اور اردو کی بعض کتابوں کا ترجمہ کرایا، تعلیمی سلسلہ میں میر امن کی باغ و بہار اور ڈپٹی نذیر احمد کی مرأۃ العروس کا انگریزی سے ترجمہ کیا گیا مگر یہ تمام تراجم بیشتر تعلیمی ضرورت، یا مترجمین کی اردو سے دلچسپی کی بنا پر کئے گئے، ایسے ترجمے ہندوستان کی بعض دوسری زبانوں کی کتابوں کے بھی ہو چکے ہیں اور ہمارا مقصود یہ ہے کہ اردو کی کتابوں کا ترجمہ ان کی علمی اہمیت اور علمی استفادہ کے لئے کیا گیا، مثلاً سرسید کی آثار الصنادید کا انگریزی اور فرنچ میں ترجمہ ہوا، فرنچ کے مترجم گارسان دی تاسی ہیں، اردو کتابوں میں بھی یہ فخر سب سے زیادہ مولانا شبلی مرحوم اور دار المصنفین کی کتابو

کو حاصل ہے، چنانچہ شعر العجم کا فارسی ترجمہ افغانستان کی وزارت تعلیم کی
جانب سے عرصہ ہوا کیا گیا جو حکومت افغانستان کی جانب سے شائع ہو چکا
ہے، اور نامور مستشرق مسٹر براؤن نے اپنی مشہور کتاب لٹریری ہسٹری آف پرشیا
میں اس سے فائدہ اٹھایا، جس کا اعتراف اس کتاب میں کیا ہے، بلکہ اس کا
آخری حصہ جو ۱۵۰۰ء سے لے کر ۱۹۲۴ء تک کے شعراء کے حالات پر
مشتمل ہے، اس میں تیموری دور کے تمام شعراء کے حالات بیشتر شعر العجم سے
ماخوذ ہیں، جن کے حوالے حواشی میں موجود ہیں، سیرۃ النبی حصہ اول، دوم اور
سوم اور الفاروق کا ترجمہ ترکی زبان اور ہندوستان کی بعض زبانوں میں
کیا گیا، یہ تمام ترجمے دار المصنفین کے کتب خانہ میں موجود ہیں، عرصہ ہوا مصر کے
بعض فضلا نے اس کے عربی ترجمہ کی اجازت مانگی تھی جو دیدی گئی تھی مگر اس کے
بعد پھر کوئی اطلاع نہیں ملی، مولانا سید سلیمان ندوی مرحوم کی کتاب خیام کا
ترجمہ بھی ایران میں ہونے والا تھا، مگر اس کے متعلق بھی اب تک کوئی علم
نہیں ہو سکا، مولانا محمد حسین آزاد کی سخندان فارس کا ترجمہ ایران میں کیا گیا،
نواب امداد امام اثر کی ایک کتاب کا جو فن باغبانی پر ہے، ڈچ زبان میں ترجمہ
ہوا، اس کے علاوہ انگریزوں کی اردو تعلیم کے سلسلہ میں اس کی متعدد کتابوں
کے ترجمے کئے گئے، مگر ان سب کا استقصار مقصود نہیں ہے، سرسری یادداشت
سے جو نام یاد آئے، وہ لکھ دئے گئے، اگر تلاش سے کام کیا جائے تو اور بھی
بہت سی کتابوں کے نام مل جائیں گے، اس سے اردو کے علمی ذخیرہ کی اہمیت
کا اندازہ ہو سکتا ہے۔

اردو کی شاعری

یہ تو اردو کے نثر کی ذخیرہ کا حال ہے، اس کی نظم کا ذخیرہ بھی کم نہیں ہے، اور اس پر بھی ایک سرسری نظر ڈال لینا مناسب معلوم ہوتا ہے، اُردو میں نظم کا آغاز نثر کی تصانیف سے بھی پہلے ہوا اور اب تک اُس کی ترقی کا سلسلہ برابر جاری ہے، اور اس میں شاعری کی ہر صنف کا بڑا ذخیرہ موجود ہے، شاعری سے اُردو زبان کو بہت فائدہ پہنچا، اسی نے اُس کو تراش خراش کر سنوارا، اور اس کو حسن بیان اور تیغ زبان کے جوہر عطا کئے مثنویوں اور مرثیوں نے موضوع شاعری میں وسعت پیدا کی، اور اُس کو جذبات نگاری، منظر نگاری اور واقعہ نگاری کی قوت بخشی، غزل شاعری کی سب سے محدود اور تنگ صنف ہے، اور اس میں بہت سی خامیاں ہیں مگر اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ اسی نے اُردو کو سلیس و فصیح بنایا، اور اس خصوصیت میں تو اس کا کوئی شریک و سہیم نہیں کہ مختصر حکیمانہ اور اخلاقی خیالات کے اظہار کے لئے سب سے زیادہ موزوں غزل ہی کے فرد اشعار ہیں جو اس کو ضرب المثل بنا دیتے ہیں، اور کبھی کبھی ایک ایک شعر بلکہ ایک ایک مصرعہ ایک جہان معنی کا کام دے جاتا ہے۔

تاہم اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ اُردو شاعری خامیوں سے پاک نہیں ہے، خصوصاً موجودہ اصطلاح میں وہ زندگی کی حرارت اور اُس کے تقاضوں سے خالی تھی، مگر یہ اس ماحول کا قدرتی نتیجہ ہے، جس میں وہ پروان چڑھی، محمد شاہ رنگیلے اور جان عالم پیا کی رنگینیوں میں خون جگر کی آمیزش کہاں سے ہو سکتی تھی، اور بہادر شاہ کی زنگ خوردہ تلوار میں تیمور اور بابر کی

تلوار کے جوہر کہاں سے پیدا ہو سکتے تھے، اس زمانہ میں جب کہ پوری سوسائٹی مست و مدہوش تھی، زندگی کے سنجیدہ مسائل کا ہوش کس کو تھا، اس لئے اسی زندگی کا عکس اُردو شاعری میں بھی آیا، تاہم یہ شاعری بھی محض دفتر بے معنی نہیں ہے، اور اس میں ہماری بہت سی پُرانی قدریں اور ہماری تہذیب کے پُرانے نقش و نگار محفوظ ہیں۔

مگر شاعری بھی ماحول کا آئینہ ہوتی ہے، اس لیے جب ہوا کا رُخ بدلا حکومت کی بساط اُلٹی، اور مغربی تہذیب اور مغربی علوم و افکار نے ہندوستانیوں کے خیالات پر اثر ڈالا تو اُردو شاعری کا رنگ بھی بدلا، اور سب سے پہلے غالب نے غزل کی تنگ دامانی میں وسعت پیدا کی، محمد حسین آزاد نے نیا راگ چھیڑا، حالی، شبلی، اور اکبر نے شاعری سے قومی اصلاح اور پس ماندہ کاروانِ ملت کے لیے حُدی کا کام لیا اور اقبال نے اُس کو کارزار حیات کا صور اور میدانِ جنگ کی تکبیر بنا دیا، اُن کی شاعری میں حکیمانہ خیالات کا ایک عالم ہے، قوموں کی موت و حیات ترقی و تنزل اور تعمیر و ترقی کا وہ کون سا اصول اور فلسفہ ہے جو اس میں نہیں ہے، اور اب اُردو شاعری موجودہ دور کے تقاضوں کو بھی قبول کر رہی ہے، جس کا نمونہ ترقی پسند شاعری ہے اور اُردو نظم میں قومی و ملی شاعری کا بڑا ذخیرہ جمع ہو گیا ہے۔

جس شاعری کا دامن میر و غالب، انیس و دبیر، اکبر و حالی اور اقبال کے کلام سے معمور ہو، وہ بے تکلف ہر زبان کی شاعری کے سامنے فخریہ اپنا سر بلند کر سکتی ہے، اس لئے شاعری کے میدان میں بھی اُردو کسی سے پیچھے نہیں ہے

تاہم ابھی اس کے بعض پہلو اصلاح طلب ہیں، جن کی اصلاح خود زمانہ کرتا جا رہا ہے، اور وہ دیر سویر ہو کر رہے گی۔

اُردو زبان کی تمدنی حیثیت اُس کے تمدنی الفاظ کا ذخیرہ

اُردو تمدنی حیثیت سے بھی نہایت ترقی یافتہ اور وسیع زبان ہے اور اس میں نظامِ حکومت سے لے کر تہذیب و معاشرت تک ایک اعلیٰ اور متمدن زندگی کے ہر شعبہ کے متعلق نہایت کثرت سے تمدنی الفاظ و اصطلاحات ہیں، ہندوستان کے مسلمان سلاطین خصوصاً تیموریوں کا تمدن، عربی، ایرانی، ترکی اور ہندی تہذیب کا خلاصہ اور عطر تھا، ایرانی اور عربی تمدن تو وہ اپنے ساتھ لائے تھے، ہندوستان آنے کے بعد وہ قدرۃً یہاں کے تمدن سے متاثر ہوئے اور چونکہ انھوں نے ہندوستان کو اپنا وطن بنا لیا تھا، اس لئے ہندی تمدن کو انھوں نے اپنانے کی بھی کوشش کی، چنانچہ بہت سی ہندوانہ رسمیں تک اختیار کرلیں، اور اُن کا تمدن ہندو تہذیب سے اتنا موثر ہوا کہ اس کا کوئی شعبہ حتےٰ کہ مذہب تک اُس کے اثرات سے خالی نہیں ہے، مسلمانوں کی شادی اور غمی کی بہت سی رسمیں آج بھی ہندوانہ ہیں جن سے ہم سب واقف ہیں، اس اثر سے ہندو تہذیب کے بہت سے الفاظ و اصطلاحات بھی اردو میں آگئے، جس کی مثالیں آئندہ آئیں گی۔

تیموریوں کے زمانہ میں اُردو نے مستقل زبان کی صورت اختیار کی، اور وہ عوام و خواص سب کی زبان بن گئی، اور قلعۂ معلےٰ تک سے فارسی اور ترکی کو ہٹا کر اُن کی جگہ قابض ہو گئی، چنانچہ آخری دور کے تیموری سلاطین کی زبان

اُردو تھی، بلکہ قلعۂ معلّٰے ہی کی زبان سب سے زیادہ مستند اور فصیح سمجھی جاتی تھی، جو آج تک اُردوئے معلّٰے کے نام سے موسوم ہے۔

اُردو زبان گو عوام کے میل جول سے پیدا ہوئی، مگر حکومت کے سایہ میں اس کی نشو و نما ہوئی اور دلّی اور لکھنؤ کے درباروں میں اس کا رنگ روپ نکھرا اس لیے عربی، فارسی، ترکی اور ہندی کے تمدنی الفاظ کا جس قدر ذخیرہ تیموریوں کے زمانہ میں تھا، وہ سب اُردو میں منتقل ہو گیا، اس کے بعد انگریزوں کے دور میں ان کے نظامِ حکومت اور مغربی تہذیب و معاشرت کے جو نئے الفاظ ہندوستان آئے، وہ بھی اُردو میں داخل ہو گئے، اس طرح اُردو کے تمدنی الفاظ کا ذخیرہ نہایت وسیع ہو گیا، اور اس میں تمدنی سر و سامان کے جس قدر الفاظ ہیں، وہ ہندوستان کی کسی زبان میں نہیں ہیں، گو قدیم مشرقی تہذیب یا نئی اصطلاح میں جاگیردارانہ تمدن کے زوال کے ساتھ بہت سے پُرانے الفاظ جن کے استعمال کا اب کوئی محل ہی نہیں رہ گیا ہے، ترک ہو گئے ہیں، مگر وہ ہر شعبۂ زندگی میں اس قدر سرایت کئے ہوئے تھے کہ اب بھی ہندوستانی تہذیب و معاشرت میں، اُن ہی کا اثر غالب ہے۔

ان الفاظ کو پیش کرنے سے پہلے ایک چیز کی طرف اشارہ کر دینا ضروری ہے، اُردو میں جیسا کہ اوپر اعداد و شمار سے بتایا گیا ہے، عربی اور فارسی کے مقابلہ میں ہندی الفاظ کی بڑی کثرت ہے، اور روزانہ کی معاشرت، بول چال اور رسم و رواج کے بیشتر الفاظ ہندی ہیں، لیکن تمدنی الفاظ، عربی اور فارسی کے زیادہ ہیں، جو بالکل قدرتی ہے، اس لیے کہ ہندوستان میں جو اسلامی تمدن آیا

وہ صدیوں کا ترقی یافتہ اور بڑی عظیم الشان اور متمدن حکومتوں کا ساختہ و پرداختہ تھا، اس لیے ہندوستانی تمدن کے مقابلہ میں قدرۃً اس میں تمدنی الفاظ کا ذخیرہ زیادہ تھا، جس طرح آج مغربی تمدن کے سیکڑوں بلکہ ہزاروں انگریزی الفاظ و اصطلاحات جن کا بدل ہندوستانی زبان میں موجود نہیں ہے اس میں رائج ہو گئے ہیں۔

حکومت کے مختلف شعبوں کے الفاظ و اصطلاحات

تیموریوں کا نظام حکومت اپنے زمانہ کے لحاظ سے بڑا ترقی یافتہ تھا، اور اس کے مختلف شعبوں کے متعلق سیکڑوں الفاظ اور اصطلاحیں تھیں، جن کی تفصیل آئین اکبری میں موجود ہے اس میں عربی فارسی اور ترکی کے ساتھ بہت سے ہندی کے الفاظ بھی ہیں، انگریزوں کے زمانہ میں جو نظام حکومت قائم ہوا، اس میں گو بہت سے پرانے الفاظ ترک ہو گئے، پھر بھی ان کی خاصی تعداد باقی ہے، اور ان کے ابتدائی دور میں عربی اور فارسی کا اتنا اثر غالب تھا کہ ان کے دور میں جو نئے الفاظ بنائے گئے، ان میں بھی عربی اور فارسی الفاظ کی بڑی کثرت ہے، مثلاً

صوبہ، ضلع، تحصیل، عدالت، کچہری، دیوانی، فوجداری، منصفی، محافظ خانہ، مال خانہ، خزانہ، جیل خانہ، تھانہ، چنگی گھر، وزیر، منصف، تحصیلدار، نائب تحصیلدار، کوتوال، گرداور، قانون گو، پٹواری، پیشکار، منصرم، قرق امین، امین بٹوارہ، حاکم بندوبست، پیمائش، کوتوالی، حوالات، داروغہ، تھانہ دار، حوالدار، دفعدار، ضلع دار، سربراہ کار، نمبردار، محرر، منشی، مدعی، مدعی علیہ، عرضی دعویٰ، استغاثہ، گواہ، بحث، جرح، مسل، مسل خواں،

سمن، اجرائے ڈگری، قرقی جرمانہ، ہرجانہ، دستاویز، بیعنامہ، رہن نامہ، اقرارنامہ
صلحنامہ، بیع، رہن، رہن بالقبضہ، فک رہن، مکفول، عذرداری، حبس دوام، بندوبست،
بے دخلی، دخل دہانی، اراضی کاشتکار، مزروعہ، غیر مزروعہ، تردد آراضی،
کاشت، خودکاشت، سیر، شکمی، غلطی، پٹہ، قبولیت، پٹہ استمراری، لگان، مالگذاری
محصول، مکتوبی، سیاہہ، واصل باقی، سیاہ نویس، واصل باقی نویس، ڈاک خانہ،
تار گھر، بیمہ، لفافہ وغیرہ، نظام حکومت کے مختلف شعبوں کے متعلق اس قسم کے
سیکڑوں الفاظ ہیں، جن کو جاہل سے جاہل دیہاتی بھی آسانی کے ساتھ بولتے
اور سمجھتے ہیں۔

انگریزوں کے زمانہ میں انگریزی کے جو الفاظ آئے، وہ بھی اردو زبان میں
اس طرح کھپ گئے کہ آج ان کو ہر عامی و جاہل سمجھتا ہے، مثلاً گورنر، کمشنر،
ڈپٹی کمشنر، کلکٹر، ڈپٹی کلکٹر، جج، ہائی کورٹ، بیرسٹر، جیل، جیلر، پولیس،
ڈسٹرکٹ بورڈ، میونسپلٹی، کونسل، اسمبلی، پارلیمنٹ، پوسٹ آفس، پوسٹکارڈ،
منی آرڈر، وی پی، اسپتال، اسکول، کالج، یونیورسٹی، پروفیسر، ٹیچر، ماسٹر،
ریل، ڈرائیور، گارڈ وغیرہ۔

کھانے اور ان کے اقسام انسانی ضروریات میں ہمارے ترقی پسند دوستوں کے
خیال کے مطابق سب سے مقدم پیٹ اور کھانا ہے، اردو کا نعمت خانہ الوان
نعمت سے معمور رہے۔ شاہی اور طبقۂ امراء کے خاصہ کے کھانوں کو چھوڑ کر جن کے
نام اب صرف کتابوں میں ملتے ہیں، ان کھانوں کی بھی بڑی تعداد ہے جو آج بھی
خوشحال گھروں میں خصوصاً تقریبات کے موقعوں پر عام طور سے رائج ہیں، مگر اس

گرانی کے زمانہ میں جب کہ پیٹ بھر روٹی نہیں ملتی ان کھانوں کا تذکرہ ایسا ہی ہے جیسے :۔

عہد پیری شباب کی باتیں ایسی ہیں جیسے خواب کی باتیں

اور ان کے اقسام اس قدر کثیر ہیں کہ اُن کا مزا چکھنا بھی دشوار ہے اور ان سے بہتیرے لوگ واقف ہیں، اُردو میں ان کھانوں اور اُن کے پکانے کی ترکیب پر مستقل کتابیں موجود ہیں، اس لئے ان کی تفصیل کی ضرورت نہیں، اسی طرح مٹھائیوں اور حلوہ جات، شربت اور مربوں کی بے شمار قسمیں ہیں، پھر ان میں لذت وکام ودہن کے ساتھ کیوڑے، زعفران، چاندی کے ورق، اور تپسہ کی ہوائی سے حسن ولطافت اور رنگ ورائحہ کا اہتمام کیا گیا، بازاری مٹھائیاں، اگرچہ زیادہ تر ہندوستانی ہیں، لیکن اُردو نے حلوائی تک کے نام پر قبضہ کرلیا، جو عربی ہے، اور اگر ہندی میں اس کے لئے کوئی لفظ ہے بھی تو وہ بالکل متروک ہے، اور ہندو مسلمان سب حلوائی بولتے ہیں، ممکن ہے اب اس کا کوئی ہندی ترجمہ ہو جائے۔

کھانے اور دسترخوان کے لوازم اُردو میں کھانے اور دسترخوان کے لوازم اور ساز وسامان کا بھی بڑا ذخیرہ ہے، کھانے کا سادہ طریقہ تو یہ ہے کہ چولھے کے پاس بیٹھ کر، پترے یا مٹی کے برتن میں کھالیا، اور ہاتھ، منھ پونچھ کر ڈکار لیتے ہوئے اٹھ کھڑے ہوئے، مگر اُردو کے دسترخوان کے تکلفات ملاحظہ ہوں :۔

فرش، دسترخوان، سینی، کشتی، خوان، خوان پوش، پیالے، بادیئے کاسے، رکابی، تشتری، قاب، چمچے، نمکدان، سلاپچی، آفتابہ، تسلہ، صابون

رومال، صراحی، آبخورے، برفاب، رکابدار، باورچی وغیرہ، یہ کوئی غیر معمولی ساز و سامان نہیں ہے، بلکہ یہ تمام چیزیں عام طور سے خوشحال اور ستھرے طبقوں میں روزانہ کے معمولات میں شامل ہیں۔

پان اور حقہ ہندوستانی گھروں میں پان اور حقہ کھانے کا گویا بدرقہ اور ملنے والوں کی تواضع اور مدارات کا ضروری جزو ہے، پان خاص ہندوستان کی چیز ہے، اُردو نے اس میں جس قدر نفاست اور تکلفات پیدا کیے اس کا اندازہ لکھنؤ کے بیگماتی پانوں سے ہو سکتا ہے، اس کو پاندان، خاصدان، مقابہ اور اگالدان دیئے، چاندی کے ورق سے آراستہ، اور زردہ، قوام، شاہی گولیوں اور الائچی دانہ سے معطر کیا، کتھے کو کیوڑے سے بسایا، دھان اور پان کی نزاکت مشہور ہے، اسی سے نازک اور نزاکت کے لیے دھان پان کا محاورہ پیدا ہوا، اُردو نے پان کو گرمی کی تمازت سے بچانے کے لیے خس کی پٹاری کا خسخانہ اور بتوں سے منڈھی ہوئی کوری سوندھی سوندھی اور پانی سے تر بتر ہانڈیوں کا آبدار خانہ تیار کیا، اور پان جیسی معمولی چیز کو لطف و لطافت کا مرقع بنا دیا۔

یہی حال حقہ کے تکلفات کا ہے، اس کی ابتدائی اور سادہ شکل نریل ہے، جو آج بھی دیہاتوں میں رائج ہے، بلکہ خالی سلفہ کی دم کشی ہے، اردو نے نیچہ، پیچوان، سٹک، فتح پیچ، ہدیہ، اور ہر دم تازہ وغیرہ بنائے، اُن کو مکلف فرشی سے آراستہ کیا، چلم کے سر پر مہنبل کا تاج رکھا، صفائی و نفاست کے لئے مہنال لگائی، گرمیوں میں ان کو خس سے ٹھنڈا کیا، عطر یا کے

بسایا، اور دورسہ اور چورسہ وغیرہ ایسے خوشبودار خمیرے تیار کئے، جن کی خوشبو سے فضا معطر ہو جاتی ہے۔

لباس و پوشاک کھانے اور اُس کے لوازمات کے بعد لباس کا درجہ ہے، اُردو کا توشہ خانہ مختلف قسم کی پوشاکوں سے مزین ہے، اور ان پرانے لباسوں کو چھوڑ کر جواب جسم سے اُتر چکے ہیں، رائج لباسوں کی جن کو ہندو مسلمان سب پہنتے ہیں، بہت سی قسمیں ہیں، مثلاً شیروانی، انگرکھا، اچکن، کرتا، قمیص، پائجامہ، اور اس کی قسمیں، آڑا، چوڑی دار، بڑی مہری وغیرہ۔

شلوار، شرعی پائجامہ، دھوتی، لنگی، تہمد، مرزئی، صدری، فتوحی، نیم آستین، شال، دوشالہ، دولائی، موزہ، رومال، ازاربند، ٹوپیاں، دوپلی، کشتی نما، چوگوشیہ، پلّہ، رام پوری، کلاہ، ترکی ٹوپی، گاندھی ٹوپی، صافہ، پگڑی، عمامہ وغیرہ۔

پرانے جوتے تو اب ترک ہو چکے ہیں، اُن کی جگہ انگریزی جوتوں کا چلن ہے، تاہم آج بھی دلّی کے سلیم شاہی، سادہ مخملی اور پُر زرجے پور کے پرکار اور حیدرآباد کے نازک اندام جوتے، نفاست پسند طبقہ میں عام طور سے رائج ہیں۔

انگریزی لباس کوٹ، پتلون اور ہیٹ وغیرہ بھی گویا ہندوستانی بن گئے ہیں، یہ تو صرف مردانہ لباسوں کے نام ہیں، اگر عورتوں کے لباسوں کو بھی شامل کر لیا جائے تو اُن کی تعداد بہت بڑھ جائے گی۔

بستر میں دری، قالین، لحاف، توشک، سوزنی، رضائی، دولائی، پلنگ کی چادر، تکئے، بغلی تکئے یا گل تکئے، بوغبند اور بستر بند وغیرہ۔

لباس سے متعلق خیاطی کی اصطلاحات، قطع، دامن، آستین، جیب، گریبان
کلی، گلوبند، تعویذ، کف، مہری، بغل، چوبغلہ، کلی، نیفہ، پائنچے، ابرو، استر
مغزی، گوٹے، بخیہ، سوزن کاری، اور رفو وغیرہ جن سے ہر درزی واقف ہے،
اسی قسم کے الفاظ ہر پیشہ سے متعلق ہیں۔

کپڑوں کی قسمیں

پارچہ بافی اگرچہ ہندوستان کی قدیم صنعت ہے، مگر مسلمانوں
کے زمانہ میں اس میں بڑی ترقی ہوئی، اور بڑا تنوع پیدا ہوا، ان میں بہت سے
نام اپنی وصل ونسل کا پتہ دیتے ہیں، مثلاً مشروع، گلبدن، ہنگی، سوسی،
اطلس، مخمل، کمخواب، مشجر، نیم زری، موج دریا، جامدانی، کامدانی، تنزیب
آب رواں، جامہ وار، طوس اور شال وغیرہ۔
کپڑوں اور لباس کے متعلقات سے سیکڑوں الفاظ ہیں، جن کی فہرست
بہت طویل ہے۔

مکان

مسلمانوں نے ہندوستان کے طرز تعمیر میں بڑی جدتیں پیدا کیں، اس لیے
عمارتوں اور رہائشی مکانوں کے متعلق اردو میں بہت سے الفاظ ہیں، جو ان کی
تمدنی نقش آرائی کا پتہ دیتے ہیں، مثلاً محل، محل سرا، دیوان خانہ، مردانہ،
زنان خانہ، زنانہ ڈیوڑھی، خلوت، ڈیرہ، باورچی خانہ، غسل خانہ، مودی خانہ،
پاخانہ، آبدار خانہ، بالا خانہ، شاگرد پیشہ، دالان، اسارا، رواق، صحنچی،
شہ نشین، اک درہ، سہ درہ، بارہ دری، سائبان، برآمدہ، کمرہ، تہ خانہ،
وغیرہ، عمارتوں کے متعلق در و دیوار، محراب، ستون، کرسی، برج، گنبد، مینار،
روشندان، روزن، ہوادار، آتارہ، بنیاد، طاق، آئینہ بندی، کاشی کاری،

اور پچہ کاری وغیرہ۔

مکان کی آرائش تمدنی زندگی کا ایک بڑا مظہر مکان کا طرز آرائش اور سامان زینت ہے، اردو میں مکانوں کی آرائش کا بڑا سامان ہے، مثلاً تخت، چوکہ، چوکی، تپائی، چٹائی، دری، فرش، قالین، جاجم، شطرنجی، مسند، گاؤ تکیہ، پردے، چلمن، چھت گیری، دیوار گیری، فراشی پنکھا، مسہری، مچھر دانی، گلدان، گلدستہ، تصویریں۔ مرقعے، طغرے، آئینے، میز پوش اور پلنگ پوش وغیرہ، میز اور کرسی کو انگریزی تمدن کی ایجاد سمجھا جاتا ہے، مگر یہ الفاظ خود اپنی اصل کے شاہد ہیں، یہ سامان آرائش کوئی غیر معمولی نہیں بلکہ عام طور سے اوسط درجہ کی صاف ستھری معاشرت کے لیے ضروری ہے۔

شیشہ آلات یعنی وہ سامان جو روشنی اور آرائش دونوں کا کام دیتے ہیں اردو میں اس کی اتنی قسمیں ہیں کہ اس زمانہ میں بھی جب کہ بجلی کی روشنی نے سارے چراغ گل کر دیے ہیں، روشنی کے آلات کی اتنی قسمیں نہیں مل سکتیں مثلاً شمع، شمعدان، قندیل، مشعل، جھاڑ، فانوس، کنول، ہانڈی، مردنگی، اکا، دوشاخہ، سہ شاخہ، پنجشاخہ، قمقمہ، لگن، اکاس دیا، اور دیپ مالا وغیرہ۔

باغ وچمن وسط ایشیا کا بڑا حصہ باغ و بہار پر مشتمل ہے، اس لئے یہاں کی قوموں کو باغ وچمن، اور سبزہ و آب رواں کا بڑا ذوق تھا، ہندوستان کا خطہ قدرتی طور پر سیر حاصل اور سرسبز و شاداب ہے، تیموریوں نے اس کو اپنے حسن مذاق سے چمن زار بنا دیا، جس کی شہادت آج بھی کشمیر اور لاہور کے باغات دیتے ہیں، کشمیر کا علاقہ ہمیشہ سے ہندوستان میں تھا، مگر اس اٹھو

پیکر جمال کی طرح جو اپنے حسن کی سحر آفرینی سے بے خبر ہو تیموریوں نے اُس کو سنوار کر رشک فردوس بنا دیا، ان کو باغ و چمن کا اتنا ذوق تھا کہ ہندستان کا کوئی ایسا خطہ نہیں ہے، جس میں تیموریوں کی چمن آرائی کی کوئی نہ کوئی یادگار نہ ہو، خود آپ کا یہ شہر لکھنؤ جو اب پرانے لکھنؤ کی صرف یادگار رہ گیا ہے، کسی زمانہ میں سراپا گلزار تھا، اُس کے پُرانے باغوں کے نام قیصر باغ، سکندر باغ، بنارسی باغ، عیش باغ، چار باغ، بادشاہ باغ، نشاط باغ وغیرہ آج بھی اس کی شہادت دیتے ہیں، اب صرف دو باغ، بنارسی باغ اور سکندر باغ خزاں کی دست و برد سے بچ رہے ہیں، تاہم اس شہر کی یہ خصوصیت آج بھی کسی حد تک قائم ہے، اور اتنے باغ و چمن مشکل سے کسی دوسرے شہر میں نکلیں گے، چمن آرائی کے اس ذوق کی وجہ سے اردو میں باغ و بہار کے متعلق دلکش و دلفریب الفاظ کا پورا ذخیرہ موجود ہے، مثلاً گل و گلزار، گلشن، گلستاں، گلکدہ، گلبن، خیاباں، باغباں، چمن، چمنستاں، باغ و راغ، پھلواڑی، گلاب باڑی، چمن بندی، چمن آرائی، روش، جدول، تختۂ گل، آبِ رواں، مرغزار، حوض، فوارہ اور نہر وغیرہ، اس حیثیت سے اُردو کے باغ کی بہار دیکھنے کے لائق ہے، مگر اس کی تفصیل کی گنجائش نہیں ہے۔

خیمہ و خرگاہ | فارسی کا مشہور شعر ہے،

ہر جا کہ رفت خیمہ زد و بارگاہ ساخت
منعم بکوہ و دشت و بیاباں غریب نیست

دشت و بیاباں کی اس بارگاہ کی کیفیت اور اس کا ساز و سامان اُردو میں ملاحظہ ہو :-

خیمہ، چھولداری، اک چوبا، دو چوبا، خرگاہ، شامیانہ، حجابی، دو آشیانہ، راوٹی، قلندری، سراپردہ، سراچہ، شیمچی، نمگیرہ، منڈل، قنات، خیموں کی قسمیں اور اس کے دوسرے لوازم کی فہرست اس سے بھی زیادہ طویل ہے۔

تمدنی صنعتوں اور اہل حرفہ کے نام

ہر دور کی صنعت و حرفت اور پیشے اس دور کے تمدنی درجہ کا مظہر ہوتے ہیں، اردو میں اعلیٰ اور ترقی یافتہ صناعیوں اور پیشوں، اور اہل حرفہ کے متعلق بہت سے الفاظ ہیں، مثلاً:۔

عطرساز، آئینہ ساز، گھڑی ساز، عینک ساز، دنداں ساز، ملمع کاری، منبت کاری، مینا کاری، پچی کاری، کاشی کاری، سوزن کاری، مرصع کاری، زرکار، سابچہ کار، قلعی گر، صیقل گر، زرگر، کیمیاگر، شیشہ گر، کاریگر، رفوگر، طبلچی، باورچی، مشعلچی، بندوقچی، توپچی، خزانچی، تحصیلدار، چوکیدار، ضلعدار، صوبہ دار، جمعدار، ٹھیکہ دار، کتب فروش، تھوک فروش، خوردہ فروش۔

علم و ادب میں:۔ مضمون نگار، افسانہ نگار، سوانح نگار، نامہ نگار، اخبار نویس، افسانہ نویس، چٹھی نویس، عرائض نویس، کاپی نویس، نقشہ نویس، نقل نویس، مسودہ نویس، مختصر نویس وغیرہ، اس قسم کے الفاظ کی فہرست طویل ہے۔

مختلف شعبوں کے الفاظ ملاحظہ ہوں:۔ آئینہ خانہ، آبدارخانہ، خستخانہ، توپخانہ، پاگل خانہ، شفاخانہ، ڈاکخانہ، غریب خانہ، کتب خانہ، لنگرخانہ، عاشورخانہ، موسیقی خانہ، چڑیا خانہ اور مہمان خانہ، آرامگاہ، بندرگاہ، درگاہ، بارگاہ، تماشاگاہ، خیمہ و خرگاہ وغیرہ۔

گلاب پاش، عطردان، قلمدان، عودان، چراغدان، اگردان، توشہ دان، سنگھاردان، پاندان، پاانداز، زیرانداز، اصطبل، سائیس، گاڑی بان، کوچبان، فیلبان، میانہ، فنیس، پالکی

سکھ پال، دربان، خانساماں، انا، ماما، اصیل، کھلائی، دائی، مغلانی، پیش خدمت، خدمتگار، جاروب کش، ادب خانہ، چوکی، حمام، توشہ خانہ، آتش باز، آتشبازی، آرام کرسی وغیرہ۔

اردو کے تمدنی الفاظ کی تفصیل اس مختصر مضمون میں دشوار ہے، ان کی بوقلمونی، دلی اور لکھنؤ کے پرانے مصنفین کی کتابوں مثلاً فسانہ آزاد، امراؤ جان ادا، لکھنؤ کے تمدن کا آخری نمونہ اور شاہد رعنا وغیرہ میں نظر آ سکتی ہے۔

زبان کی شائستگی جو زبان جس قدر مہذب اور شائستہ ہوگی، اسی قدر اس کے آداب، ملنے جلنے کے طریقے، انداز گفتگو اور اس سے متعلق الفاظ بھی شائستہ ہوں گے، آج کل مشرقی تہذیب خصوصاً لکھنؤ کے رسمی تکلفات کا مذاق اڑایا جاتا ہے، اور اس کے متعلق بہت سے لطائف و ظرائف مشہور ہیں لیکن ان کی حیثیت لطائف ادبی سے زیادہ نہیں ہے، کوئی مہذب قوم بھی اس قسم کے آداب و تکلفات سے خالی نہیں، اگرچہ ان کی نوعیت مختلف ہو، ادب و تمیز شائستگی کا ثبوت ہے، اردو اس حیثیت سے بھی نہایت شستہ زبان ہے کہ اس میں ہر موقع و محل کے لئے نہایت شائستہ الفاظ ہیں، مثلاً اسلامی سلام "السلام علیکم" ہے، اردو نے اس میں آداب، آداب عرض، تسلیم، تسلیمات، اور بندگی وغیرہ کا اضافہ کیا۔

مختلف مدارج کے اپنے سے بلند مرتبہ کے خطاب کے الفاظ:۔
عالیجناب، جناب والا، جناب عالی، عالی مرتبت، سرکار، حضور، اعلیحضرت، بندگان عالی، بندہ پرور، بندہ نواز، پیر و مرشد، خداوند نعمت، صاحبزادہ، صاحبزادی وغیرہ۔

خاکساری کے الفاظ:۔ حقیر، فقیر، خاکسار، کمترین، نیازمند، نیازکیش، فدوی، خادم، خانہ زاد، غلام، دعاگو، ذرہ بیمقدار، ہیچمیرز، بندہ زادہ، اور بندہ زادی وغیرہ

شکریہ کے الفاظ:۔ شکریہ، لطف و کرم، عنایت، نوازش، عزت افزائی، ذرہ نوازی،

بندہ پروری، قدردانی، قدرافزائی اور حوصلہ افزائی وغیرہ۔

درخواست کے الفاظ:۔ درخواست، عرض، گذارش، التماس، التجا وغیرہ۔

نام و وطن کے استفسار کے لئے:۔ اسم گرامی، اسم سامی، اسم شریف، نام نامی، دولت خانہ، دولت کدہ، وطن مالوف وغیرہ۔

مزاج پرسی کے لئے:۔ مزاج عالی، مزاج گرامی، مزاج شریف، مزاج مبارک وغیرہ۔

دعائیہ فقرے:۔ مدظلہ، دام ظلہ، زاد مجدہ، زاد فضلہ، دامت برکاتہ، دامت معالیہ، خدا خوش رکھے، سلامت رکھے، تا صد سی سال سایہ قائم رکھے، غالب نے اسکو یہاں تک بڑھا دیا۔

تم سلامت رہو ہزار برس ہر برس کے ہوں دن، پچاس ہزار

زبان کی شائستگی کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ اس میں ایسے الفاظ کے استعمال سے پرہیز کیا جاتا ہے، جس میں تحقیر، عیب، سوءِ ادب، ذم یا بدشگونی کا پہلو نکلتا ہو، اور اس مفہوم کو دوسرے پیرایہ میں ادا کیا جاتا ہے۔ مثلاً:۔

مر گئے کے بجائے، اللہ کو پیارے ہو گئے، واصل بحق ہو گئے، سفر آخرت کیا، جنت کی راہ لی، جنت کو سدھارے وغیرہ۔

مُردوں کے لئے:۔ مرحوم، رحمۃ اللہ علیہ، قدس سرہ، خلد آشیاں، خلد نشیں، خلد مقام، جنت آرام گاہ، اور راہی جہانی وغیرہ۔

اسی طریقہ سے احمق کے لئے عقلمند، غبی اور کُند ذہن کے لئے خوش فہم، منحوس کے لئے سبز قدم وغیرہ۔

ہندوستان میں ذات پات کی تقسیم کی وجہ سے ادنیٰ پیشوں کو ذلیل سمجھا جاتا ہے اور ان پیشوں کے الفاظ میں بھی ذلت اور تحقیر کا پہلو نکلتا ہے، اردو نے اس قسم کے بہت سے

الفاظ کو بدل دیا، مثلاً بھنگی کے لئے مہتر، حلال خور، جمعدار، جولاہے کے لئے نوربافت، اور شیخ جی، گندھی کے لئے عطار، نائی کے لئے خاصہ تراش کے الفاظ ایجاد کئے، جتنے کہ ذلیل ترین پیشہ وروں کو جو اخلاقی حیثیت سے بھی نہایت پست ہیں، معشوق، میر شکار اور استاد جی جیسے القاب عطا کئے، اندھے کو سورداس اور حافظ جی کے لقب سے ملقب کیا، فارسی میں اس کو بصیر کہتے ہیں، اس قسم کے اور بھی بہت سے الفاظ ہیں، مثلاً:۔ ادب خانہ اور چوکی وغیرہ۔

مختلف موقعوں کے متفرق الفاظ:۔ تشریف آوری، کرم گستری، قدم رنجہ فرمانا، حکم، ارشاد، جیسا ارشاد ہو، لطف ہو، مرحمت ہو، اجازت ہو، بسر و چشم، نظر انور، ملاحظہ گرامی نگاہ لطف، نظر کرم، ملاحظہ فرمانا، سماعت فرمانا وغیرہ، اس قسم کے الفاظ کا اردو میں بہت بڑا ذخیرہ ہے، اس مضمون میں اس کے مختصر نمونے بھی دکھانا مشکل ہے، درحقیقت اردو زبان کی شائستگی الفاظ کے ذریعہ پوری طرح ذہن نشین نہیں ہو سکتی، اس کی مکمل تصویر حضرات لکھنؤ اور ان کی صحبت یافتہ اشخاص ہی میں نظر آ سکتی ہے، خوش قسمتی سے یہ اجلاس اسی گہوارہ تمدن میں ہو رہا ہے جہاں اس کے زندہ مرقعے دیکھے جا سکتے ہیں، بلکہ اس جلسہ میں بھی موجود ہیں، اس بحث میں راقم اپنے منصب سے آگے بڑھ گیا ہے، اس کا حق حضرات لکھنؤ کو ہے راقم ایک دیہاتی ہے، ممکن ہے کسی لفظ کے استعمال میں اس سے غلطی ہو گئی ہو جس کے لئے وہ معذرت خواہ ہے

اردو زبان کی کلچرل حیثیت خالص ہندستانی نقطہ نظر سے اردو زبان کی کلچرل اہمیت اس کی تمدنی اہمیت سے بھی زیادہ ہے، لیکن اس کا یہ پہلو ہمارے موضوع سے خارج تھا، اسلئے اسپر بحث نہیں کی گئی تاہم اسکی اہمیت کے لحاظ سے اسکی جانب بھی اشارہ کر دینا ضروری ہے۔

اردو خالص ہندستانی زبان ہے، اور ہندو مسلمانوں کے میل جول سے بنی ہے،

اس لئے اسمیں نہ صرف عربی اور فارسی الفاظ کے مقابلہ میں ہندی الفاظ کی کثرت ہے بلکہ خالص ہندو کلچر اور ہندو تہذیب کے بھی بڑے گہرے اثرات ہیں، اس کی وجہ یہ ہے کہ ہندوستانی مسلمانوں کی بڑی تعداد نسلاً ہندوستانی ہے، جن کا مذہب تو اسلام ہو گیا لیکن اُن کا کلچر ملکی اور قومی ہی رہا ہے، باہر سے جو مسلمان ہندوستان آئے، وہ اجنبیوں کی طرح ہندوستانیوں سے الگ تھلگ نہیں رہے، بلکہ ہندوستان میں رس بس کر ہندوستانی بن گئے، اس لئے وہ قدرۃً یہاں کی قدیم تہذیب سے متاثر ہوئے اور اس کو اپنانے کی بھی اتنی کوشش کی کہ ہندوستانی معاشرت کے ساتھ بہت سی خالص ہندوانہ رسمیں تک اختیار کر لیں چنانچہ آج بھی ان کی شادی غمی کی بہت سی رسمیں ہندوانہ ہیں اور اُن کی زندگی کا کوئی شعبہ بھی ان اثرات سے خالی نہیں ہے، جن سے ہم سب واقف ہیں۔

ہولی، دیوالی اور بسنت کے تہوار تو غریبوں کے جھونپڑوں سے لے کر امراء و سلاطین کے محلات اور صوفیہ کی خانقاہ تک میں منائے جاتے تھے اور اب بھی منائے جاتے ہیں پُرانے بادشاہوں کی ہولی کی رنگ رلیوں کی داستانیں اب تک ہماری شاعری میں محفوظ ہیں، بسنت آج بھی صوفیہ کی خانقاہوں اور بزرگوں کے مزارات پر منایا جاتا ہے حضرت امیر خسرو کے بسنتی گیت مشہور ہیں، دیوالی روشنی اور مٹھائی کے بدلہ مسلمانوں نے شبرات کی آتشبازی اور حلوا ایجاد کیا۔

ان کی شادی اور غمی کی اکثر رسمیں ہندوانہ ہیں، پیدائش میں چھٹی، چھلا، سوہل اور سوَر کی ساری رسمیں اور ٹونے ٹوٹکے، شادی میں مانجھا، منڈوا، بارات، دُھرہ، سہرا، بدھی، بری بدھاوا، ڈولہ، چوتھی، چالا، نیگ، اور بابل وغیرہ تمام رسمیں ہندوانہ اور اُن کے سارے گیت ہندی کے ہیں، لڑکیوں کی رخصتی کے وقت ہر شریف کے گھرانے میں امیر خسرو کا ہندی بابل

گا یا جاتا ہے، موت کی رسموں میں تیجہ، دسواں، بیسواں، چالیسی، تماہی، چھماہی، برسی
مُردہ کی چیزوں سے چھوت، فاتحہ کا مروجہ طریقہ سب ہندوانہ رسوم ہیں ہندو تہذیب کے اثر نے اسلامی طریقوں
کو بھی بدل دیا مثلاً جس گھر میں موت ہو جائے وہاں دو تین وقت کھانا بھیجنا مسنون ہے،
مسلمانوں نے اس دستور کو تو قائم رکھا لیکن اس مسنون کھانے کو بھاتی بنا دیا، غرض
مختلف موقعوں کے مراسم اور شگون و بدشگونی کے ٹونے ٹوٹکے، خصوصاً عورتوں کی
اکثر رسمیں خالص ہندوانہ ہیں، اگر ان اثرات کی ہمہ گیری دیکھنا ہو تو مرثیے ملاحظہ فرمایئے
جن میں اہل بیت کرام کی عرب خواتین بھی خالص ہندوستانی لباس میں نظر آتی ہیں
اور حضرت قاسم کی شادی اور غمی کے تمام مراسم ہندوستانی ہیں۔

معاشرت تو معاشرت مسلمانوں کا مذہب بھی ہندو اثرات سے محفوظ نہیں رہا،
چنانچہ تصوف میں جو مذہب کی اصل ہے یوگ اور ویدانت کی بہت سی چیزیں شامل
ہوگئیں، صوفیائے کرام کے عرسوں کے بیشتر مراسم غسل، گاگر، صندل، چراغاں، چادر،
چڑھاوا، قوالی وغیرہ، سب ہندو تہذیب کے اثرات کا نتیجہ ہیں، حضرت امیر خسرو اور دوسرے
صوفی شعراء کے ہندی گیت آج بھی قوالی کی محفلوں کو گرم کرتے ہیں، محرم کے بہت سے
مراسم بھی ہندو اثرات کا نتیجہ ہیں، جن کو مذہب اسلام سے کوئی علاقہ نہیں ہے ممکن ہے اس میں
ایران کے بھی کچھ اثرات ہوں، مگر ہندو اثرات سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔

اس سے ظاہر ہوگا کہ مسلمانوں کی زندگی کا کوئی شعبہ بھی ہندو تہذیب کے اثر سے
خالی نہیں ہے، اسلئے ہماری روزانہ کی معاشرت، عام بول چال اور ریت رسموں کے سارے
الفاظ و اصطلاحات خالص ہندی ہیں، معاشرہ کی بنیاد خاندان پر ہے، اور اردو میں رشتوں
اور ناتوں کے سارے الفاظ ہندی یا ہندوستانی ہیں، مثلاً باپ بیٹا، ماں بیٹی، لڑکا لڑکی،

بہن بھائی، بھاوج، بہنوئی، چچا، چچی، ماموں، ممانی، نانا، نانی، دادا، دادی، ناتی، نتنی یا نواسہ، نواسی، پوتا، پوتی، سالہ، سالی، سلہج، دیور، جیٹھ، دیورانی، جیٹھانی، سمدھی، سمدھن، ساس، سُسر، میکہ، سُسرال، ننھیال، ددھیال، وغیرہ بلکہ خالہ خالو کے علاوہ رشتے ناتے کے سلسلے الفاظ ہندستانی ہیں اور خالہ خالو کے معنی اور محل استعمال بھی دونوں بدل گئے، عربی میں خال ماموں کو کہتے ہیں اور خالہ خالہ کو، اردو میں خالہ کا استعمال تو صحیح رہا مگر خال، خالو بن گیا، اور ماموں کے بجائے خالہ کے شوہر کے لیے استعمال ہونے لگا، یعنی یہ دونوں لفظ بھی ہندستانی بن گئے۔

راگ، راگنی، موسیقی اور رقص وسرود کے سارے الفاظ و اصطلاحات خالص ہندی کے ہیں، مگر اُن کی تفصیل ہمارے موضوع سے خارج ہے، راقم نے کئی سال ہوئے ہندستانی اکیڈمی الہ آباد کے اجلاس میں ایک مقالہ پڑھا تھا، اس میں تفصیل کے ساتھ اردو شاعری میں ہندو کلچر اور ہندستان کے طبعی و جغرافی اثرات دکھلائے تھے یہ مقالہ اکیڈمی کے رسالہ میں شائع ہو چکا ہے[1]، اگر دوسرے کاموں سے فرصت ملی، تو انشاء اللہ کسی موقع پر اُردو زبان میں خالص ہندو مذہب اور ہندو تہذیب کے اثرات دکھانے کی کوشش کیجائیگی۔

اُردو کی سیاسی اہمیت آخر میں مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اُردو کی سیاسی اہمیت پر بھی ایک نظر ڈال لی جائے، ہندستان کے تمام پڑوسی ملک اسلامی ہیں، جن کی زبان فارسی یا عربی ہے، اردو میں عربی اور فارسی کے الفاظ بکثرت ہیں، اسلئے وہ ان ملکوں میں اجنبی اور نامانوس نہیں ہے، اس کے علاوہ مختلف اسباب و تعلقات کی بنا پر وہ ان تمام ملکوں میں کسی نہ کسی حد تک سمجھی جاتی ہے، سب سے قریبی ملک پاکستان ہے وہ اگرچہ سیاسی حیثیت سے ایک مستقل اور جداگانہ مملکت بن گیا ہے مگر ابھی وہ سیاسی حیثیت کے علاوہ

[1] یہ مضمون اس مجموعہ میں شامل ہے۔

ہر حیثیت سے ہندوستان کا ہی ایک کٹا ہوا ٹکڑا ہے، اور ایک دو پشتوں تک اس کی اس حیثیت میں فرق نہیں آسکتا، اسلئے اس کا ذکر ہی نہیں، اس کے بعد دوسرا پڑوسی ملک افغانستان ہے اس کے ہندوستان کے ساتھ اتنے گوناگوں تعلقات ہیں، اور دونوں ملکوں کے درمیان اس قدر آمد و رفت رہتی ہے کہ اس کے ہر حصہ میں اردو پوری طرح سمجھی جاتی ہے، حتٰے کہ شاہی خاندان کے ارکان تک نہ صرف اردو سمجھتے ہیں بلکہ ان کو اس کے بولنے پر بھی پوری قدرت ہے ابھی حال ہی میں افغانستان کے وزیر اعظم محمود شاہ خاں نے ہندوستان کی پارلیمنٹ میں نہایت فصیح و بلیغ اردو میں تقریر کی تھی، جو اخبارات میں شائع ہو چکی ہے ایران سے اردو کا ایک رشتہ تو فارسی کے واسطہ سے ہے، دوسرے وہاں بھی ہندوستانیوں خصوصًا مسلمانوں کی بڑی آمد و رفت رہتی ہے اسلئے ایران میں بھی اردو اجنبی نہیں ہے عرب اور عراق میں تو مسلمانوں کے مقدس مقامات ہی ہیں، جن کے حج و زیارت کے لئے ہزاروں ہندوستانی مسلمان ہر سال جاتے ہیں بلکہ بہت سے وہاں آباد بھی ہو گئے ہیں اسلئے ان دونوں ملکوں میں اردو پوری طرح سمجھی جاتی ہے اور وہاں اس کی تعلیم کا بھی انتظام ہے عرب سے آگے بڑھ کر مصر و شام کے ملک ہیں، ان سے بھی ایک رشتہ تو عربی کے تعلق سے ہے، دوسرے دنیائے اسلام میں مصر، عربی تعلیم کا سب سے بڑا مرکز ہے، اس کی سب سے بڑی یونیورسٹی جامعۂ ازہر مصر ہی میں ہے، اس میں اردو کی بھی تعلیم ہوتی ہے اور ہندوستان کے سیکڑوں مسلمان طالب علم وہاں حصول تعلیم کیلئے جاتے ہیں، اس لئے مصر میں بھی اردو سے روشناس ہے، شام و فلسطین کا بھی یہی حال ہے، ان کے علاوہ جن جن ملکوں میں عربی بولی جاتی ہے، وہاں اردو بالکل اجنبی زبان نہیں ہے۔

مشرق میں سیلون اور برہما میں ہندوستانیوں کی بڑی تعداد آباد ہے، ان کے

ذریعہ ان دونوں ملکوں میں بھی اُردو پہنچ گئی ہے، مشرق کے سب سے بڑے اسلامی ملک انڈونیشیا کی زبان اگرچہ عربی اور فارسی نہیں ہے، لیکن وہاں عربی کے بڑے اثرات ہیں خصوصاً جاوا اور سماٹرا میں تو عربی کا بڑا اثر ہے، اسی کے ساتھ ہندی اور سنسکرت کا بھی اثر ہے، اس لئے اُردو وہاں کے لئے بھی یکسر اجنبی نہیں ہے، اس کے علاوہ وہ پاکستان و ہندوستان کی زبان سمجھے جانے کی وجہ سے خاص وقعت کی نظر سے دیکھی جاتی ہے، اور انڈونیشیا کی آزادی کے بعد وہاں اُردو کے اثرات اور بڑھ جائیں گے، اس لئے سیاسی حیثیت سے بھی اُردو کی بڑی اہمیت ہے، غرض اس کی جس حیثیت پر بھی نگاہ ڈالی جائے وہ ایک نہایت اہم ترقی یافتہ اور بلند زبان ہے، اس لئے اس کو باقی رکھنا اور ترقی دینا نہ صرف ہندوستانی بلکہ ہر علم دوست کا علمی فرض ہے۔

اس مقالہ میں اُردو کی اہمیت کے جو پہلو دکھائے گئے ہیں، وہ درحقیقت اس کا ایک نامکمل خاکہ ہیں، اگر کوئی صاحب علم ہمت کریں تو اس خاکہ میں رنگ بھر کر اُردو کا ایک نہایت دلکش مرقع تیار کیا جا سکتا ہے اور اس موضوع پر ایک مستقل کتاب لکھی جا سکتی ہے۔



مولانا عبدالسلام ندویؒ

دارالعلوم ندوۃ العلماء نے اپنے دورِ کمال میں جو نامور فرزند پیدا کیے، اُن میں ایک مولانا عبدالسلام ندوی بھی تھے، وہ اعظم گڈھ کے ایک چھوٹے سے گاؤں علاء الدین پٹی میں سنہ ۱۳۰۰ھ میں پیدا ہوئے، ان کے والد متوسط درجہ کے زمیندار تھے، مگر کاشتکاری بڑے پیمانہ پر کرتے تھے، نیل کی تجارت بھی تھی، اس لیے ان کا شمار گاؤں کے خوش حال لوگوں میں تھا، مولانا عبدالسلام کی تعلیم گھر کے مکتب میں ہوئی، فارسی کی ابتدائی کتابیں مکتب ہی میں ایک معلم سید امداد علی سے پڑھیں اور اس کی تکمیل اپنے خسر مولوی عبداللہ صاحب سے کی۔

فارسی کی تکمیل کے بعد عربی کی تعلیم کے لیے کانپور گئے، اور اس کی ابتدائی تعلیم کانپور اور اس کے بعد آگرہ کی جامع مسجد کے مدرسہ میں حاصل کی، اس زمانہ میں مشرقی اضلاع میں مدرسہ چشمۂ رحمت غازی پور کا بڑا شہرہ تھا، یہاں مولانا کے ایک عزیز مولانا شبلی[۱] مدرس تھے، اس لیے وہ آگرہ سے غازی پور چلے آئے، اور متوسطات تک کی تعلیم چشمۂ رحمت میں پائی، پھر سنہ ۱۹۰۶ء میں دارالعلوم ندوۃ العلماء میں داخل ہوئے اور سنہ ۱۹۱۰ء میں یہاں سے فراغت

---

[۱] ان مولانا شبلی کا وطن جیراجپور ضلع اعظم گڈھ تھا، یہ بھی دارالعلوم ندوۃ العلماء میں مدرس ہو گئے تھے اور درس کے فقیہ اول اور مفتی تھے، راقم الحروف نے بھی ان سے ہدایہ پڑھی ہے، ابھی چند سال ہوئے کہ ان کا انتقال ہوا۔ رحمہ اللہ تعالےٰ۔

حاصل کی اور یہیں ادب کے مدرس مقرر ہو گئے۔

ان میں شعر و ادب اور لکھنے پڑھنے کا ذوق ابتدا سے تھا، چنانچہ مولانا شبلی کی جوہر شناس نگاہ نے اسی زمانہ میں ان کی صلاحیتوں کا اندازہ کر لیا تھا، اور جن لوگوں کو انھوں نے تالیف و تصنیف کی تربیت دی تھی، ان میں ایک مولانا عبد السلام بھی تھے اور ان کے بارہ میں یہ پیشین گوئی کی تھی کہ آگے چل کر وہ ایک اچھے مصنف ہوں گے۔ یہ پیشین گوئی بالکل صحیح ثابت ہوئی، انھوں نے پہلا مضمون ندوہ میں داخلہ کے بعد ہی ۱۹۰۶ء میں "تناسخ" پر لکھا تھا، مولانا شبلی کو یہ مضمون اس قدر پسند آیا کہ اس کو اصلاح کئے بغیر اپنے نوٹ کے ساتھ الندوہ میں شائع کیا اور مولانا کو پانچ روپے انعام دیے، اسی مضمون سے مولانا کی علمی و ادبی زندگی کا آغاز ہوا۔ اور اس کے بعد برابر ان کے مضامین الندوہ میں نکلتے رہے، اور وہ پہلے اس کے سب اڈیٹر پھر اڈیٹر مقرر ہوئے۔

اس کے بعد جب مولانا شبلی نے سیرۃ النبیؐ کی تالیف کا کام شروع کیا تو مولانا عبد السلام کو اپنا لٹریری اسسٹنٹ بنایا، اسی زمانہ میں مولانا ابوالکلام بھی مولانا شبلی کے زیر تربیت تھے، وہ بھی الندوہ کے سب اڈیٹر رہ چکے تھے۔ اور ان کا اور مولانا عبد السلام کا ساتھ رہ چکا تھا، چنانچہ ۱۹۱۲ء میں جب انھوں نے کلکتہ سے اپنا مشہور اخبار الہلال نکالا تو مولانا عبد السلام صاحب کو بھی بلا لیا۔ اور وہ ڈیڑھ دو سال تک الہلال میں کام کرتے رہے، ۱۹۱۴ء میں الہلال کو بنگال گورنمنٹ نے بند کر دیا، اسی سنہ میں ۱۸ر نومبر کو مولانا شبلی کا بھی انتقال ہو گیا۔

مولانا شبلی کے پیش نظر جو مذہبی اور علمی کام تھے اور جن کو وہ اپنی زندگی میں پورا نہ کر سکے تھے، اُن کی تکمیل کے لئے دار المصنفین کا خاکہ بنا کر اپنے شاگرد رشید مولانا سید سلیمان ندوی کو ان کی تکمیل کی وصیت کر گئے تھے، چنانچہ مولانا شبلی کی وفات کے بعد ہی دسمبر ۱۹۱۴ء میں جب انھوں نے دار المصنفین قائم کیا تو مولانا عبد السلام صاحب کو کلکتہ سے اعظم گڈھ بلا لیا، اس وقت سے لے کر وفات تک وہ برابر دار المصنفین سے وابستہ رہے اور مر کر اس سے جدا ہوئے۔

مولانا شبلی کی طرح مولانا سید سلیمان ندوی کی شخصیت بھی بڑی جامع و ہمہ گیر تھی، انھوں نے نہ صرف مولانا شبلی کے ناتمام کاموں کو پورا کیا بلکہ حالات و ضروریات کے مطابق دار المصنفین کے کاموں کا دائرہ اتنا وسیع کر دیا کہ وہ مولانا شبلی کے تخیل سے بہت آگے بڑھ گیا، اور اس کی شہرت عالمگیر ہو گئی، دار المصنفین کے کاموں میں مولانا عبد السلام صاحب ندوی مولانا سید سلیمان ندوی کے دست راست تھے، مگر

ع ہر گلے را رنگ و بوئے دیگر است

مولانا سید سلیمان ندوی کی شخصیت بڑی جامع تھی، ان کے افکار و خیالات نہایت بلند اور ان کے کاموں کا دائرہ بڑا وسیع تھا، اور مولانا عبد السلام صاحب طبعاً نہایت خاموش، گوشہ نشین، قانع اور شہرت و نام و نمود سے بالکل بے نیاز تھے، ان میں ایجاد و اختراع، حوصلہ مندی اور قیادت کا مادہ مطلق نہ تھا، لیکن تصنیفی قابلیت اور زور قلم میں امتیازی حیثیت رکھتے تھے، اس لیے انھوں نے اپنا دائرہ عمل تالیف و تصنیف ہی تک محدود رکھا اور نہایت خاموشی کے ساتھ عمر بھر اس کام کو انجام دیتے رہے، اور اس میں وہ دار المصنفین کے رکن اعظم

تھے، جس پر ان کے مضامین اور تصانیف شاہد ہیں، مولانا سید سلیمان ندوی کی بعض اہم کتابوں مثلاً سیرۃ النبیؐ اور حیات شبلی کی تالیف میں ان کا بھی حصہ ہے، جس کی تصریح ان کتابوں کے مقدمہ میں موجود ہے۔

ادب و انشاء میں وہ نہایت ممتاز تھے، اور علامہ شبلی کی یہ وراثت ان کے حصہ میں زیادہ آئی تھی، چمنستان ادب میں ان کا قلم بڑا سبک خرام تھا، ذہن بڑا اخاذ پایا تھا، سرسری مطالعہ سے کتابوں کا جوہر کھینچ لیتے تھے اور عربی کی ہر اہم اور نئی کتاب سے وہ اپنے کام کی کچھ نہ کچھ باتیں ضرور نکال لیتے تھے، اور اس پر ایک مضمون تیار کر دیتے تھے، چنانچہ ان کے بیشتر مضامین کسی نہ کسی کتاب کے مطالعہ کا نتیجہ ہیں، بلکہ کبھی کبھی وہ ان سے مستقل تصنیف کا خاکہ تیار کر لیتے تھے، چنانچہ سیرۃ عمرؓ بن عبدالعزیز کی تالیف میں انھوں نے اگرچہ بہت سی کتابوں سے مدد لی ہے لیکن اس کا ابتدائی خاکہ سیرۃ العمرین ابن جوزی سے ان کے ذہن میں آیا تھا، اسی میں رنگ بھر کر حضرت عمرؒ بن عبدالعزیز کی سیرۃ کا مرقع تیار کیا، اسی طریقہ پر ان کا ایک رسالہ القضاء فی الاسلام ابن جوزی کی الطرق الحکمیہ سے ماخوذ ہے، ان کو فطری لگاؤ شعر و ادب سے تھا، لیکن مذہبیات سے لے کر شعر و ادب تک ہر موضوع پر لکھنے کی یکساں قدرت تھی، اسی لئے ان کے مضامین میں جس قدر تنوع ہے وہ مشکل سے کسی دوسرے اہل قلم کے مضامین میں نکل سکتا ہے، ایک زمانہ میں معارف کا کوئی نمبر مشکل ہی سے ان کے مضمون سے خالی ہوتا تھا، اگر ان سب کو جمع کیا جائے تو کئی جلدوں میں آئیں گے اور تنوع و رنگا رنگی کا نہایت دلکش نمونہ نظر آئے گا

لیکن طبیعت شاعرانہ اور تخیل پرست تھی، اس لیے محنت و مشقت سے گھبراتے، اور لکھنے کے لئے ایسے ہلکے پھلکے موضوع کا انتخاب کرتے تھے جس میں زیادہ کد و کاوش کی ضرورت نہ ہو، اور اس کمی کو وہ ادبی حسن و لطافت سے پورا کر دیتے تھے، قلم اتنا پختہ اور منجھا ہوا تھا کہ قلم برداشتہ لکھتے تھے اور لکھنے کے بعد مسودہ پر نظر ثانی اور حک و اصلاح کی ضرورت بہت کم پیش آتی تھی۔

محنت کے زیادہ عادی نہ تھے، صرف دن میں تین چار گھنٹے کام کرتے تھے، مگر اس معمول میں فرق نہ آتا تھا، اور اس انہماک سے لکھتے کہ کوئی ہنگامہ اور شور و غل ان کے کام میں خلل انداز نہ ہو سکتا تھا۔ اس پابندی کا یہ نتیجہ ہے کہ سہولت پسندی کے باوجود ان کے کام کی مقدار سب سے زیادہ ہوتی تھی، انھوں نے مختلف موضوعوں پر سیکڑوں مضامین اور ہزاروں صفحات لکھے، ان کی مستقل تصانیف کی تعداد ایک درجن سے زیادہ ہے، اہم تصانیف حسب ذیل ہیں۔

اسوۂ صحابہؓ، دو جلد، مسلمانوں کے لیے آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کے بعد صحابہ کرامؓ کی زندگی اسوۂ عمل ہے، اس لیے دار المصنفین میں سیرۃ النبیؐ کے ساتھ ہی سیر الصحابہ کی تالیف کا سلسلہ بھی شروع کیا گیا تھا، جو ۱۲ جلدوں میں ہے، اس کے مختلف حصے مختلف رفقاء نے لکھے ہیں، ان میں اسوۂ صحابہ دو جلدوں میں اور اسوۂ صحابیات مولانا عبد السلام صاحب کی تالیف ہیں، پہلی جلد میں عقائد، عبادات، معاملات اور اخلاق و معاشرت وغیرہ کے متعلق صحابہ کرام کے مؤثر و سبق آموز واقعات اور دوسری جلد میں ان کے مذہبی، سیاسی اور علمی کارناموں کو اس انداز سے تحریر کیا گیا ہے جس سے

زندگی کے ہر شعبہ میں اسلامی تعلیمات کا عملی مرقع سامنے آجاتا ہے اور مسلمانوں کو زندگی کے مختلف پہلوؤں میں ہدایت و رہنمائی حاصل ہوتی۔

اسوۂ صحابیاتؓ:۔ اسلام نے نہ صرف مردوں بلکہ عورتوں میں بھی عظیم الشان انقلاب پیدا کر دیا تھا، اور جس طرح مسلمان مردوں کے لیے صحابہ کرام کی زندگی اسوۂ حسنہ ہے، اسی طرح مسلمان عورتوں کے لیے صحابیات کی زندگی نمونہ ہے، اس لیے اسوۂ صحابیات میں آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کی ازواج مطہراتؓ، بنات طاہراتؓ اور عام صحابیاتؓ کے اخلاق و معاشرت وغیرہ کے متعلق مؤثر واقعات جمع کیے گئے ہیں، جو مسلمان خواتین کے لیے مشعل ہدایت کا کام دیتے ہیں۔

سیرۃ عمرؓ بن عبدالعزیزؒ:۔ خلفائے راشدین کے بعد اسلامی خلافت نے بادشاہت کی شکل اختیار کر لی تھی اور اس میں وہ تمام خرابیاں پیدا ہو گئی تھیں جو دنیاوی بادشاہتوں کا خاصہ ہیں، جب عنان حکومت حضرت عمرؓ بن عبدالعزیزؒ کے ہاتھوں میں آئی تو انھوں نے ہر طرح کے خطرات برداشت کر کے بڑی جرأت و دلیری سے اس حکومت کو خلافت کے قالب میں بدل کر ایک مرتبہ پھر صدیقی اور فاروقی عہد کی یاد تازہ کر دی، عمرؓ بن عبدالعزیزؒ نے تخت شاہی پر بیٹھ کر جیسی فقیرانہ زندگی بسر کی اور جیسی عادلانہ حکومت کی اس کی مثال خلافت راشدہ کے علاوہ اور کسی دور میں نہیں مل سکتی، اور اس حیثیت سے ان کی زندگی نہ صرف مسلمان بادشاہوں بلکہ تمام دنیا کے فرمانرواؤں کے لیے نمونہ ہے، سیرۃ عمرؓ بن عبدالعزیزؒ میں اسی مؤثر طریقہ سے ان واقعات کی

تفصیل تحریر کی گئی ہے جس سے مسلمانوں کے ایمان میں تازگی اور غیر مسلموں کے دلوں میں اسلام کی عظمت کا نقش قائم ہوتا ہے۔

تاریخ اخلاق اسلامی :- دوسری قوموں کے اخلاق کی تعمیر و تشکیل اور اس کے تغیرات میں مختلف عوامل و اسباب کو بڑا دخل ہوتا ہے، لیکن مسلمانوں کا ضابطۂ اخلاق کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ ہے، جس میں کوئی تغیر نہیں ہو سکتا، مگر طبعی اسباب کی بنا پر مسلمانوں کے مختلف طبقوں کے اخلاق میں بھی تغیرات ہوتے رہے ہیں، مولانا شبلی کی تاریخ اخلاق یورپ کے طرز پر مسلمانوں کے اخلاق کی تاریخ لکھنا چاہتے تھے، مگر اس کی ایک ہی جلد مرتب کر سکے، اس میں پہلے بعثت نبوی کے قبل عربوں کے اخلاق کی تصویر دکھائی گئی ہے، پھر اسلام نے اس میں جو انقلاب پیدا کیا اور عہد نبوی میں جس طرح اسلامی اخلاق کی تعمیر و تشکیل عمل میں آئی اس کی تفصیل ہے۔

امام رازی :- مسلمان فلاسفہ اور متکلمین میں امام فخر الدین رازی کا درجہ نہایت ممتاز ہے، دینی علوم میں بھی ان کو امامت کا درجہ حاصل تھا، اور وہ اپنے دور کے نامور فلسفی اور متکلم بھی تھے، امام غزالی کے بعد وہ پہلے شخص ہیں جنھوں نے فلسفہ اور علم کلام کے مسائل پر تنقیدی نگاہ ڈالی، اور ان کو جامعیت اور وضاحت کے ساتھ پیش کیا، اس لیے امام غزالی اور مولانا روم کی طرح ان پر بھی اردو میں ایک مستقل کتاب کی ضرورت تھی، اسی ضرورت کے پیش نظر اس کتاب کی تالیف عمل میں آئی، اس میں ان کے مفصل حالات اور ان کی تصانیف پر تبصرہ اور ان کے فلسفہ، علم کلام اور نظریات و خیالات کی توضیح و تشریح اور

ان پر نقد و تبصرہ کیا گیا ہے۔

حکمائے اسلام۔ دو جلدیں:۔ فلسفہ کی تمام شاخوں طبیعیات، الٰہیات، منطق اور ریاضی وغیرہ میں مسلمان حکماء و فلاسفہ کے بڑے کارنامے ہیں، یونان کا فلسفہ ان ہی کے دم سے زندہ رہا، وہ قدیم اور جدید فلسفہ کی درمیانی کڑی تھے، اگر انھوں نے قدیم فلسفہ کو زندہ نہ رکھا ہوتا تو آج نئے فلسفہ کا وجود نہ ہوتا، اور نہ بعض دوسرے علوم پیدا ہوئے ہوتے، مسلمان محض یونانی فلسفہ کے مقلد نہ تھے، بلکہ اس کے ناقد بھی تھے، اُنھوں نے اس کی تہذیب و اصلاح کی اور فلسفہ میں نئے نظریات پیدا کیے، ان فلاسفہ کے متعلق ایک عام شہرت یہ بھی ہے کہ وہ ملحد و بے دین تھے، جو علی الاطلاق صحیح نہیں ہے، بہت سے اکابر فلاسفہ نے فلسفہ کے ملحدانہ نظریات کی تنقید و تردید کی، اس سے مذہب کی تائید کا کام لیا، مابعد الطبیعی مسائل کو فلسفہ سے ثابت کیا، اور عقلیات و نقلیات میں تطبیق دی، اس لئے اردو میں مسلمان فلاسفہ کے حالات، اور ان کے فلسفیانہ و متکلمانہ کارناموں کو پیش کرنے کی بھی ضرورت تھی، اس اہم کام کو بھی مولانا کے آزمودہ کار قلم نے انجام دیا، اور دو ضخیم جلدوں میں مسلمان فلاسفہ کے حالات لکھے، اس میں تاریخ اسلام کے پہلے نامور فلسفی یعقوب کندی سے لے کر مولانا فضل حق خیر آبادی تک، ہر دور کے اکابر فلاسفہ مثلاً محمد بن موسیٰ خوارزمی، فارابی، زکریا رازی، ابن مسکویہ، ابن ہیثم، مصنفین اخوان الصفا، شیخ الرئیس بو علی سینا، ابو ریحان بیرونی، امام غزالی، ابوالبرکات بغدادی، عمر خیام، ابن باجہ، ابن طفیل، شیخ الاشراق، ابن رشد، امام رازی،

نصیر الدین طوسی، قطب الدین شیرازی، قطب الدین رازی، سعد الدین تفتازانی سید شریف جرجانی، جلال الدین دوانی، قوشجی، میر باقر داماد، خاندان فرنگی محل دخیر آباد اور ہندوستان کے دوسرے نامور حکماء کل ۹۶ فلاسفہ کے حالات ہیں، اور ان کے علمی خدمات و فلسفیانہ نظریات کی تفصیل بیان کی ہے، کتاب کے شروع میں ایک مقدمہ ہے، جس میں حکمائے قدیم کے فلسفیانہ مذاہب فلسفۂ اشراق، مسلمانوں میں یونانی فلسفہ کی اشاعت کی تاریخ اور ان کے قدیم مرکزوں کا حال لکھا ہے، جس سے مسلمانوں میں فلسفہ کی پوری تاریخ سامنے آجاتی ہے، اردو میں اس موضوع پر یہ پہلی جامع کتاب ہے۔

شعر الہند دو جلد:۔ اردو میں شعراء کے قدیم طرز کے بہت سے تذکرے ہیں، لیکن وہ سب موجودہ نقطۂ نظر سے ناقص اور سپاٹ ہیں، ان سے شعراء کے ضروری حالات اور ان کے کلام کی خصوصیات بھی پوری طور سے معلوم نہیں ہوتیں، ان میں نہ ادوار کی تقسیم ہے نہ شاعری کے عہد بعہد کے تغیرات اور اس کے اسباب پر بحث ہے، نہ شعراء کے کلام پر تفصیلی رائے ہے؛ جس سے ان کی خصوصیات کا اندازہ ہو سکے، نہ اصناف شاعری پر بحث و تبصرہ ہے، بس صرف شاعروں کا مختصر حال اور ان کے کلام کے متعلق ایک دو فقرے ہوتے ہیں، جن سے ان کی خصوصیات کا پورا اندازہ نہیں ہوتا، اس حیثیت سے سب سے پہلے مولانا محمد حسین آزاد نے اردو شاعری کو آب حیات پلایا، اور جدید نقطۂ نظر سے آب حیات لکھی، جس سے ایک حد تک یہ کمی پوری ہو گئی، آب حیات ادبی حیثیت سے غیر فانی ہے، جب تک اردو

زبان زندہ ہے، آبِ حیات زندہ رہے گی، لیکن وہ نقشِ اول ہے، اس لیے اس میں بھی وہ جامعیت نہیں ہے جو اُردو شاعری کی تاریخ کے لیے ضروری ہے، اس کی حیثیت ایک تاریخی و تنقیدی تذکرہ کی ضرور ہے، مگر اس میں تمام اصنافِ شاعری کی تاریخ اور اس پر ریویو نہیں ہے، بعض اور خامیاں بھی ہیں نواب امداد امام اثر کی کاشف الحقائق میں صرف اصنافِ شاعری پر نقد و تبصرہ ہے، اس لیے وہ بھی جامع نہیں ہے، مولانا عبدالسلام کو شعر و ادب سے فطری لگاؤ تھا، اور اس پر ان کی نظر بڑی وسیع تھی، چنانچہ انھوں نے مولانا شبلی کی شعر العجم کے طرز پر شعر الہند لکھی، اس کی پہلی جلد میں اُردو شاعری کی ابتدا سے لے کر فانی، حسرت، اصغر، شاد عظیم آبادی، عزیز لکھنوی، اکبر، اقبال، جوش، یعنی جدید دور تک کے شعرا کا تذکرہ ہے، اور ان کے مختلف دور قائم کر کے ہر دور کے شعرا کے الگ الگ حالات، اس دور اور اس کے شعرا کی خصوصیات، عہد بعہد کے تغیرات اور اس کے اسباب کی پوری تفصیل ہے، اس حصہ کے شروع میں ایک مقدمہ ہے، جس میں اُردو شعرا کے قدیم تذکروں کی فہرست اور ان کی کیفیت تحریر کی گئی ہے دوسرے حصہ میں اصنافِ شاعری یعنی غزل، ریختی، واسوخت، قصیدہ، مرثیہ، مثنوی، ڈراما، اور مذہبی، صوفیانہ، اخلاقی اور فلسفیانہ شاعری پر تاریخی اور ادبی حیثیت سے مفصل ریویو کیا گیا ہے، جس سے اس کی پوری سرگزشت سامنے آجاتی ہے، آخر میں شعر کے اجزا اور اس کے محسنات لکھے گئے ہیں، اور اُردو شاعری میں ہندوستانی اثرات دکھائے گئے ہیں،

اس حصہ کے شروع میں اردو میں تنقید کی تاریخ پر مختصر روشنی ڈالی گئی ہے
اس طرح آبحیات کے بعد شعر الہند اردو شعرا کا پہلا جامع تذکرہ ہے، جس سے
اردو شاعری کے تمام رُخ سامنے آجاتے ہیں، اب تو اس کے ایک ایک پہلو
پر مستقل کتابیں لکھی جاچکی ہیں، مگر جب شعر الہند تالیف ہوئی، اُس وقت
اُردو میں آبحیات اور کاشف الحقائق کے علاوہ اور کوئی نمونہ سامنے نہ تھا۔

اقبال کامل۔ اقبال اور اُن کے کلام کے متعلق اتنا لکھا جاچکا ہے
کہ مشکل ہی سے اس کا کوئی پہلو تشنہ ہوگا اور اس کا سلسلہ اب تک جاری
ہے، اور لکھنے والوں کو عجیب و غریب نئے نئے پہلو تلاش کرنا پڑتے ہیں،
مگر اس کے باوجود کوئی ایسی جامع کتاب نہ تھی جو اقبالیات کے ہر پہلو پر
حاوی ہو۔ اقبال کامل کی تالیف کا مقصد یہ تھا کہ اب تک اقبال پر جو کچھ لکھا
جاچکا ہے، اس کو نقد و تبصرہ کے ساتھ مرتب طریقہ سے ایک جگہ جمع کردیا جائے
چنانچہ اس میں اقبال کے سوانح، ان کی مذہبیت، اخلاق و سیرت، اور
تصانیف پر تبصرہ اور ان تصانیف کا بھی ذکر ہے جن کی تالیف ان کے پیش
نظر تھی، مگر ان کے لکھنے کا موقع نہ مل سکا، اس کے بعد ان کی شاعری کی تاریخی سرگزشت
اور اس کے مختلف دور قائم کرکے ہر دور کے کلام پر الگ الگ تبصرہ کیا گیا ہے
پھر اسی طریقہ سے فارسی شاعری پر ریویو ہے، اس کے بعد ان کے کلام کے
ادبی محاسن دکھلائے گئے ہیں، اور اس کی شہرت و مقبولیت اور مختلف زبانوں
میں اس کے تراجم کا ذکر ہے، اس سلسلہ میں ان کی ادبی و لسانی فروگذاشتیں
بھی دکھائی گئی ہیں، پھر ان کے فلسفۂ خودی پر تفصیلی بحث ہے، اور اس کے

اجزاء و عناصر پر روشنی ڈالی گئی ہے، اور فلسفۂ بے خودی کا اجمالی تعارف ہے، پھر نظریۂ ملت، تعلیم، سیاسیات، صنفِ لطیف، فنونِ لطیفہ اور نظامِ اخلاق وغیرہ کے بارہ میں ان کے خیالات پیش کیے گئے ہیں، آخر میں نعتیہ کلام پر ریویو ہے۔ اس طرح یہ کتاب اقبالیات کے ہر پہلو پر حاوی ہے، اور جن معلومات کے لیے ہزاروں صفحات کی ورق گردانی کرنی پڑتی ہے، وہ اقبالِ کامل میں ایک جگہ مل جاتی ہیں۔

ان مستقل تصانیف کے علاوہ مولانا نے عربی کی متعدد اہم کتابوں کے ترجمے کیے، مثلاً:۔

تاریخ فقہ اسلامی:۔ اردو میں فقہ اسلامی کی کوئی تاریخ نہیں تھی، اس لیے دار المصنفین کے پیش نظر اس کی تالیف بھی تھی، مگر اسی زمانہ میں مصر کے ایک فاضل محمد خضری کی کتاب التشریع الاسلامی شائع ہو گئی، جس سے دار المصنفین کے پیش نظر کتاب کا مقصد پورا ہو جاتا تھا، اس لیے مولانا نے اس کو اردو کے قالب میں ڈھال دیا، یہ فقہ اسلامی کی مفصل تاریخ ہے، جس میں ہر دور کے فقہ و فقہا کے حالات، ان کے مذاہب، ان کی خصوصیات اور ان کے علل و اسباب وغیرہ ہر پہلو کو تفصیل کے ساتھ دکھایا گیا ہے، اس سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ جب تک اسلامی علوم کی ترقی کا دور رہا، فقہ اسلامی بھی ترقی کرتی رہی، اس کے بعد اس پر بھی زوال طاری ہو گیا۔

ابن خلدون:۔ مصر کے نامور فاضل ڈاکٹر طٰہٰ حسین نے ابن خلدون اور اس کے فلسفہ پر ایک کتاب فرنچ میں لکھی تھی، مصر میں اس کا عربی ترجمہ ہوا،

یہ کتاب اسی عربی ترجمہ کا ترجمہ ہے، ابن خلدون نہ صرف مسلمانوں بلکہ دنیا کے مؤرخین میں فلسفہ اجتماعیات کا پہلا عالم ہے، جس نے عمرانی مسائل پر سب سے پہلے فلسفیانہ نگاہ ڈالی اور اس کو علمی طور سے مرتب کیا، چنانچہ اس کا مقدمہ اس کے زمانہ تصنیف تک کے اسلامی علوم و خیالات پر سب سے پہلا تبصرہ، تاریخی واقعات کو سائنس بنانے کی سب سے پہلی کوشش اور اقتصادیات و اجتماعیات پر فن کی حیثیت سے پہلی نگاہ ہے، اس حیثیت سے یہ مقدمہ موجودہ دور کے بہت سے علوم و مسائل کا سنگ بنیاد ہے، طہٰ حسین کی کتاب میں ابن خلدون کے مختصر حالات اور اس کے سیاسی، اقتصادی اور اجتماعی و عمرانی نظریوں پر مفصل روشنی ڈالی گئی ہے۔

انقلاب الامم :- یہ کتاب مشہور فرانسیسی عالم و مفکر گستاؤلی بان کی کتاب کے عربی ترجمہ کا ترجمہ ہے، اس میں ان نفسی اصول اور اخلاقی قوانین کی تشریح کی گئی ہے، جن سے قوموں کی ترقی اور ان کا تنزل وابستہ ہوتا ہے، یعنی جس طرح افراد میں ایک مخصوص روح ہوتی ہے، جس کے مطابق اس کے تمام افعال صادر ہوتے ہیں، اسی طریقہ سے قوموں میں بھی مخصوص اخلاق و عادات ہوتے ہیں، جن پر ان کی ترقی و تنزل کا مدار ہوتا ہے اس کتاب میں ان ہی اخلاق و عادات اور اس کے مظاہر و نتائج کو دکھایا گیا ہے۔

ان اہم تصانیف و تراجم کے علاوہ چند اور چھوٹی چھوٹی کتابیں ہیں، مثلاً :-

القضاء فی الاسلام :- یعنی اسلام کا نظام عدالت۔ اس کتاب میں شہادت اور فصل مقدمات کے اسلامی قوانین و اصول تحریر کیے گئے ہیں اور ان کی تشریح کی گئی ہے۔ اس کا خاکہ مولانا کے ذہن میں ابن جوزی کی کتاب الطرق الحکمیہ سے آیا تھا، اگرچہ اس کتاب میں حدیث و فقہ کی دوسری کتابوں سے بھی مدد لی گئی ہے۔ مگر زیادہ تر الطرق الحکمیہ سے ماخوذ ہے۔

فقرائے اسلام :- علامہ شہاب الدین احمد بن علی دلجی نے ان علماء کے حالات میں جنھوں نے علمی کمالات کے باوجود فقر و فاقہ کی زندگی بسر کی ہے، ایک کتاب "الفلاکۃ والمفلوکون" لکھی ہے، فقرائے اسلام حذف و اضافہ کے ساتھ اسی کی تلخیص ہے، یہ کتاب صوفی پبلشنگ کمپنی پنڈی بہاء الدین نے شائع کی تھی۔

ابن یمین :- عرصہ ہوا ابن یمین اور اس کے کلام پر ایران سے فارسی میں ایک کتاب شائع ہوئی تھی، مولانا نے اردو میں اس کی تلخیص کی تھی، یہ کتاب بھی پنجاب کے کسی ناشر نے شائع کی تھی، اور اس وقت ہمارے سامنے نہیں ہے۔

مولانا کی دلچسپی کسی خاص فن تک محدود نہ تھی، اس لیے ان کا کوئی موضوع بھی متعین نہ تھا، شعر و ادب سے ضرور ان کو فطری لگاؤ تھا، مگر ان کے قلم کی جولانیاں اس دائرے میں محدود نہ تھیں، اور وہ ہر موضوع پر ہر وقت لکھنے کے لیے تیار رہتے تھے، اور جس طرف چاہتے تھے قلم کی باگ موڑ دیتے تھے، اسی لیے جو تنوع اور رنگا رنگی ان کے مضامین میں ہے، مشکل سے کسی دوسرے اہل قلم کے مضامین میں نظر آ سکتی ہے، ان کی تعداد اتنی کثیر ہے کہ

اگر ان کی پوری فہرست نقل کی جائے تو کئی صفحوں میں آئے گی۔ اس لئے مختصر فہرست لکھی جاتی ہے جس سے ان مضامین کے تنوع کا اندازہ ہوگا۔ مسجد نبوی، جنگ اور اخلاق، خلفائے عباسیہ اور فریضۂ اشاعت اسلام، تربیت و تعلیم، اسلامی یتیم خانے، تحریفات یہود، مثنوی خواب و خیال، کیا انسان کی اجتماعی زندگی ترقی کر رہی ہے، فلسفۂ البیان، اسلام اور نصرانیت کی کشمکش، مشرقی کتب خانے، عیسائی مذہب کی تمدنی ناکامیاں مذہب و عقلیات، اسلام کی تمدنی کامیابیاں، قرآن مجید اور شاعری، دین حنیف، خوش قسمت حافظ اور بد قسمت خیام، طلاق عیسائی مذہب میں، اشرف علی خاں فغاں، وحدۃ الوجود اور اکابر اسلام، اسلام اور عیسائیت، شیخ مصحفی کا تذکرہ، فن تراجم و طبقات، تحریم سود کے علل و اسباب، مسلمانوں کے تنزل کی داستان، مہندسین اسلام، عقیقہ اور اس کے مصالح، امام غزالی اور فلسفۂ اخلاق، سوشلزم کی مختلف حیثیتیں اور اس کی اشاعت کے اسباب، الفقار فی الاسلام، شیریں و فرہاد، معتزلہ اپنی اصلی شکل میں، اسلام اور مغربی لباس و تمدن، اسلامی اقتدار کا اثر یورپ کی معیشت پر، فلسفۂ جمال اور اس کا اثر تصوف پر، خصائص القرآن، ایک قدیم دکھنی شاعر، اندلس کے عربی آثار، فرانسیسی شاعری اور اس پر عربی ادب کے اثرات، اسلام اور تکمیل اخلاق، اسلامی فن تعمیر، رہبانیت اور اسلام، کلیات حسن دہلوی، تصوف کی اجمالی تاریخ، تصوف کا اثر علوم و فنون پر، صوفیانہ نظام اخلاق، مولانا کاتبی، موفق الدین عبد اللطیف بغدادی، فلسفۂ اشراق اور اسلام، اقبال اور

فلسفۂ خودی، اسلامی طب کی مختصر تاریخ، اقبال کے اخلاقی تصورات، اسلامی ہند کے تمدنی کارنامے، عربی نظم و نثر کی تاریخ، معجزۂ قرآن کی نوعیت، فلسفۃ البلاغۃ، اُردو شاعری میں انقلاب کیونکر پیدا ہوا، دلی اور لکھنؤ کی شاعری اور ایک کا دوسرے پر اثر۔

مولانا طبعاً خاموش، گوشہ نشین اور نام و نمود سے بے نیاز تھے، اور اس کے جو مواقع بھی ان کو ملتے تھے، اس سے بھی فائدہ نہ اُٹھاتے تھے، اور پروپیگنڈے کے فن سے تو بالکل ہی ناواقف تھے، اس لئے پبلک اسٹیج سے ہمیشہ الگ رہے، اور ان کا دائرۂ عمل دارالمصنفین کے اندر تالیف و تصنیف تک محدود رہا، حتےٰ کہ خالص علمی اجتماعات میں بھی تقریر، مقالہ خوانی یا صدارت کی نوبت شاید ہی کبھی آتی ہو، ایک دو مرتبہ ہندوستانی اکیڈمی الہ آباد کے جلسہ میں البتہ شرکت کی تھی، اور "اُردو شعرائے ایک اچھے انتخاب کی ضرورت" کے عنوان سے ایک مقالہ پڑھا، جو اسی زمانہ میں معارف میں شائع ہوگیا تھا، اور ایک مرتبہ عرصہ ہوا کانپور کے کسی ادبی اجتماع میں شعبۂ نثر کی صدارت کی تھی، اور اس کے لئے خطبۂ صدارت بھی لکھا تھا، یہ خطبہ بھی معارف میں چھپا تھا، اس جلسہ میں ہم لوگوں نے بڑے اہتمام سے مولانا کو روانہ کیا تھا، وہ منظر آج تک آنکھوں کے سامنے ہے، مگر وہ سفر سے اس قدر گھبراتے تھے کہ اس کے بعد غالباً کسی علمی جلسہ کے لئے سفر نہیں کیا، اس لئے ایسے علمی مقالات اور خطبۂ صدارت کی تعداد جو علمی اجتماع میں پڑھے گئے ہوں دو چار سے زیادہ نہیں ہے، البتہ مقامی مشاعروں کی صدارت بڑے شوق سے

کرتے تھے اور اس کے لیئے قریب کے اضلاع کا کبھی کبھی سفر بھی کرتے تھے۔

ایک زمانہ میں کبھی کبھی تقریر بھی کرتے تھے، اور اگر اصرار کیا جاتا تو وعظ بھی کہہ دیتے تھے، مگر جیسا کہ آئندہ معلوم ہوگا، جذب کی وجہ سے ان کے خیالات میں توازن نہ تھا، اس لیئے تقریر یا وعظ کے حدود و قیود کی پابندی سے بری رہتے تھے، اس لیئے وہ خود بھی اس سے بچتے تھے اور رُو کے بھی جاتے تھے، وہ طبعاً خاموش تھے، مگر بعض خاص موضوعوں پر بڑی دلچسپ اور شاعرانہ گفتگو کرتے تھے، جو سننے کے لائق ہوتی تھی۔

مولانا کا اصلی موضوع شعر و ادب تھا اس سے ان کو فطری مناسبت تھی، اور اُردو، فارسی شعر و ادب خصوصاً اُردو شاعری سے بڑی دلچسپی تھی، اتفاق سے شروع سے ان کو ماحول بھی ایسا ملا جس سے اس ذوق کے نشو و نما میں اور مدد ملی، ان کے بہنوئی مولوی محبوب الرحمن صاحب مرحوم بی، اے ایل، ایل، بی جن کے ساتھ مولانا عرصہ تک رہے، شاعر تھے اور کلیم تخلص کرتے تھے، مولانا اپنی طالب علمی کے زمانہ میں انہی کے ساتھ کانپور اور آگرہ گئے تھے، یہ وہ زمانہ تھا جب گھر گھر شعر و شاعری کا چرچا تھا، اور آگرہ اس کا بڑا مرکز تھا، چنانچہ محبوب الرحمن صاحب اور ان کے ساتھ مولانا بھی یہاں کے مشاعروں میں شریک ہوتے تھے، ان صحبتوں نے مولانا کے ذوق شعری کو بھی اُبھارا، اور کبھی کبھی وہ غزلیں کہہ کر مشاعروں میں پڑھنے لگے، اس کے بعد غازی پور کی تعلیم کے زمانہ میں ان کو مولانا عبدالاحد شمشاد مرحوم فرنگی محلی کی، جو چشمۂ رحمت میں مدرس اعلیٰ اور اپنے زمانہ کے اساتذہ میں تھے، شاعرانہ

صحبت میسر آئی، ان کی صحبت اور حوصلہ افزائی نے مولانا کے ذوق سخن کے لیے مہمیز کا کام کیا اور وہ باقاعدہ شاعری کرنے اور مولانا عبدالاحد سے اصلاح لینے لگے، ان کی فارسی استعداد شروع سے پختہ اور فارسی اور اردو کے اساتذہ کے کلام پر پوری نظر تھی، اس لیے ابتدائی مشق سخن ہی میں اس زمانہ کے مذاق کے اچھے اشعار نکلنے لگے، جس کی داد اس دور کے اساتذہ نے دی، مثلاً

میں مر گیا ہوں یہ کس عندلیب چمن کے لیے
کہ لائیں چادر گل بلبلیں کفن کے لیے

بدگمانی سے انھیں میری نظر وہ سمجھے
چمکے ذرے بھی اگر روزن دیوار کے پاس

کانپور کے بعد وہ اردو شاعری کے اصل مرکز لکھنؤ پہونچ گئے، یہاں کے در و دیوار سے شاعری برستی تھی، پرانے اساتذہ کی متعدد یادگاریں باقی تھیں لکھنؤ کی فضا امیر مینائی اور جلال لکھنوی کی زمزمہ سنجیوں سے گونج رہی تھی، خود مولانا شبلی کی صحبت میں بھی شعر و ادب کا چرچا رہتا تھا، اس ماحول نے مولانا کو پورا شاعر بنا دیا۔

اس زمانہ میں لکھنؤ میں میر ضامن علی جلال کا طوطی بولتا تھا، اور ان کا رنگ بہت مقبول تھا، اس لیے مولانا بھی اس سے متاثر ہوئے، اور اصلاح کے لیے جلال کی جانب رجوع کیا، لیکن مولانا ہی کے بیان کے مطابق وہ نذرانہ لیے بغیر اصلاح نہیں دیتے تھے، جس کا تحمل طالب علمی کے زمانہ میں مولانا کے لیے دشوار تھا، اس لیے یہ تعلق قائم نہ ہو سکا، مگر اس سے جلال کے

ساتھ ان کی عقیدت میں کوئی فرق نہ آیا اور وہ ہر دور میں یکساں قائم رہی۔

اقبال سہیل مرحوم اور مرزا احسان احمد صاحب کے ذوق سخن کی وجہ سے اعظم گڑھ میں بھی شعر و شاعری کا مذاق تھا، جگر و اصغر اکثر آتے رہتے تھے، اور دارالمصنفین و مرزا صاحب کے یہاں شعر و شاعری کی محفلیں جمتی تھیں مشاعرے بھی ہوتے تھے، اس لئے مولانا عبد السلام کو یہاں بھی شاعرانہ ماحول ملا، وہ ان صحبتوں اور مشاعروں میں برابر شریک ہوتے تھے، اور اکثر غزلیں بھی پڑھتے تھے، اور ان کا یہ ذوق آخر عمر تک قائم رہا، چنانچہ آخری غزل انھوں نے وفات سے ایک ہفتہ پہلے کہی تھی۔

فن شاعری پر مولانا کی نظر بڑی گہری اور استادانہ تھی، جس کا ثبوت ان کی کتاب شعر الہند ہے، وہ قدیم طرز سخن کے دلدادہ اور خود بھی اس کے پابند تھے، دور جدید کی بعض جدتوں بلکہ بدعتوں کو سخت ناپسند کرتے تھے اور اس کو شاعری نہیں سمجھتے تھے، اس پر انھوں نے ایک تنقیدی مضمون بھی لکھا تھا، جس میں دور جدید کے بہت سے شعرا کی غلطیاں دکھائی تھیں، اس کی اشاعت سے ایک ادبی ہنگامہ برپا ہو جانے کا خطرہ تھا، اس لئے شائع نہیں کیا گیا، اور اس کا مسودہ اب تک محفوظ ہے[1]، فن کے قواعد کی پابندی اور زبان کی صحت و صفائی کو بڑی اہمیت دیتے تھے، اور اس حیثیت سے وہ لکھنؤ کی شاعری کو دلی کی شاعری پر ترجیح دیتے تھے، ان کو لکھنؤ کا اصلاح شدہ رنگ بہت پسند تھا، اس لئے جلال کو آخری دور کا سب سے بڑا شاعر مانتے تھے، اور خود بھی اسی رنگ میں کہتے تھے، مگر کبھی کبھی داغ و امیر کے رنگ کے شوخ اشعار

[1] اب یہ مضمون شائع کر دیا گیا ہے۔

بھی قلم سے نکل جاتے تھے۔

مگر اس ذوق کے باوجود شاعری ان کا مستقل مشغلہ نہ تھا، بلکہ کبھی کبھی تفنناً یا اعظم گڈھ کے مشاعروں کے لیے کہتے تھے، چنانچہ ان کی اکثر غزلیں اسی کی یادگار ہیں، اسی لیے ان کے ذوق شعری کے مقابلہ میں ان کے کلام کی مقدار بہت کم ہے، مگر جس قدر بھی ہے پرانے طرز کا استادانہ ہے، اس پر تفصیلی تبصرہ کے لیے مستقل مضمون کی ضرورت ہے، اس لیے بغیر کسی تبصرہ کے مختلف رنگ کے اشعار نقل کیے جاتے ہیں جس سے ان کے رنگ سخن کا اندازہ ہو جائے گا۔

ان کے مجموعۂ کلام کی اشاعت کی نوبت نہ آئے گی، اس لیے کچھ زیادہ اشعار نقل کر دیے جاتے ہیں کہ اسی ذریعہ کم سے کم ایک مختصر انتخاب محفوظ ہو جائے۔

نشہ میں ہیں کبھی تو کبھی ہیں خمار میں
اچھی گزر رہی ہے ترے انتظار میں

گزرے گا روز حشر بھی اب انتظار میں
شامل ہے یہ بھی وعدۂ فردائے یار میں

چپ چاپ بھی نہ بیٹھ سکے بزم یار میں
مجبوریاں بھی غیر کے تھیں اختیار میں

تارے بھی جھلملا کے بہ حسرت ہوئے غروب
کیا کیا بجھے چراغ شب انتظار میں

توڑے سبو کو خاک کہ اب محتسب کو بھی
خود لطف آ رہا ہے شکستِ خمار میں

اے چشمِ شوق جلوۂ محبوب کے سوا
کیا کیا نہ دیکھنا ہے تجھے انتظار میں

لاکھوں قفس ہیں لائے گی کس کس میں بوئے گل
چڑھنے لگے گی سانس صبا کی بہار میں

پہنچی کہاں تک ان کے مست گئی بے خبر گئی
جب جب گئی نگاہ بنوعِ دگر گئی

دشوار ہو گئے ہیں اشارے بھی ضعف میں
اس کام سے بھی اب تو ہماری نظر گئی

سامانِ غم بھی ہجر کی شب منتشر ہوا
تڑپے تو آنسوؤں کی لڑی بھی بکھر گئی

گو جس کی جستجو تھی وہ یوسف نہیں ملا
لیکن مری نگاہ سے دنیا گزر گئی

یوسف کو سستے دام زلیخا نے لے لیا
تقدیر تھی کہ حسن کی قیمت ٹھہر گئی

غبارِ معصیت کی اس طرح کی شست و شو برسوں
مئے ساقی سے اے زاہد کیا میں نے وضو برسوں

زبانِ بے زبانی ہم سے بڑھ کر کون سمجھے گا
تری تصویر سے فرقت میں کی ہے گفتگو برسوں

نہ پیاس اپنی بجھے گی بادۂ کوثر سے جنت میں
رہے گی روح میری کشتۂ جامِ سبو برسوں

جہاں دیکھتے ہیں جدھر دیکھتے ہیں فقط اک فریبِ نظر دیکھتے ہیں
یہ صیاد کو کیوں پسند آرہے اتنا مرے ہم نوا میرے پر دیکھتے ہیں
اشارہ جو پائیں تو تم کو بھی دیکھیں ابھی تو تمھاری نظر دیکھتے ہیں
نظر باز بن کر شمیم اس گلی میں تماشا رہے اہلِ نظر دیکھتے ہیں

یوں آشیاں کو دیکھ رہے ہیں قفس سے ہم
گویا یہ کوئی پھول ہے فصلِ بہار کا

مستی میں کھینچ لیتے ہیں رندانِ مے پرست
دامن پکڑ کے رحمتِ پروردگار کا

لاکھوں مصیبتیں ہیں مگر پھر بھی روزِ حشر
محبوب ہے کہ دن ہے ترے انتظار کا

اے بے خودی بھٹک کے چلے آرہے خلد میں
ہم راستہ ہی بھول گئے کوئے یار کا

سب کچھ اُسے ملے جو یہ ہو جائے نا اُمید
بس آسرا ہے یہ ترے اُمیدوار کا

حریم دل سے یا عرش بریں سے — تمہیں ہم ڈھونڈھ لائیں گے کہیں سے

ہوا مرنے پہ آغاز محبت — شروع ہوتا ہے یہ قصہ یہیں سے

بجھے دل کا چراغ اے شمع رو آج — جلا دے اپنے روئے آتشیں سے

جو اس کی جستجو میں گھر سے نکلے — تو خود کھوئے گئے دنیا و دیں سے

مری تقدیر ایسی چاندنی میں — جو چمکے گی تو تم سے مہ جبیں سے

صدا اس بام تک اب بھی نہ پہونچی — پکار آئے اسے عرش بریں سے

فلک سے پہلے ہی کوچے میں انکے — نپٹ لینا پڑا ہم کو زمیں سے

چھپے چوری جو کچھ کرتا ہے زاہد — کھلا راز اس کا اک پردہ نشیں سے

تری انگڑائیاں کہتی ہیں مجھ سے — تجھے کچھ ملنے والا ہے کہیں سے

نشہ آتا ہے تو پھر وعظ بھی کہہ لیتے ہیں
پی کے ہم اور بھی ہشیار ہوئے جاتے ہیں

تیغ کی ان کو پئے قتل ضرورت کیا ہے
خود ہی کھنچ کھنچ کے وہ تلوار ہوئے جاتے ہیں

مست آنکھوں کے اشارے مجھے دیتے ہیں یہ طنز
بے پیئے آپ تو سرشار ہوئے جاتے ہیں

میرے پہلو میں تو بیٹھے ہیں مگر غیر کے ساتھ
ہو کے آسان وہ دشوار ہوئے جاتے ہیں

مثل منصور جنھیں حق نے کیا ہے حق گو
اور بے باک سر دار ہوئے جاتے ہیں

جنھیں تیرے ہاروں میں گوندھا گیا ہے
بھلا کب ہیں وہ پھول مرجھانے والے
تم اپنا اُنھیں کشتۂ ناز سمجھو
ابھی جی اُٹھیں گے یہ مرجانے والے
متاع دل و جاں کریں نذر پہلے
کچھ اپنا بھی کھوئیں انھیں پانے والے

لیں گے اُچک کے بادۂ کوثر کا جام بھی
پہونچا جو ہاتھ دامنِ ابرِ بہار تک
رندو پھرا ہے جام یہ جم تک کے ہاتھ میں
مٹ مٹ گئے ہیں اس کے تو نقش و نگار تک
اللہ رے غرور پہنتے نہیں کبھی
گردن جھکا کے آپ تو پھولوں کا ہار تک

رندوں میں یوں ہی بخشش پیر مغاں رہے
ہو لاکھ قحط پھر بھی یہ دریا رواں رہے
رخصت ہوں وہ تو اشک مسلسل رواں رہے
یوسف کے ساتھ لگا کارواں رہے
بجلی بھی اس کے ڈر سے گرے گی نہ باغباں
ہاں ہاں تری نظر میں مرا آشیاں رہے

مرے دل سے آخر وہ باہر کہاں ہیں
رقیب اپنے، اپنے ہی وہم و گماں ہیں

پڑیں بھی تو کیا مجھ پہ شرمائی نظریں
نہ یہ جاں فزا ہیں نہ یہ جاں ستاں ہیں

ملے گا وہ کوچہ تو آوارگی سے
مری رہنما میری گمراہیاں ہیں ٭

پی کے جھونکوں میں تو میخانے سے ہم اُٹھتے نہیں
لے نہ لیں ساقی سے جب تک جام جم اُٹھتے نہیں

رہنما اس حد سے آگے تو ہی خود اے شوق ہو
تھک گئے ہیں خضر اب انکے قدم اُٹھتے نہیں

راہ بے پایاں تھی وہ بھی گرم رفتاری شمیم
قرب منزل نے تھکایا اب قدم اُٹھتے نہیں

کر دے بیخود نہ گھٹا کے زلف کی بو ٭ چھین لے آج مجھ کو تو مجھ سے
یاد اس چشم مست کی آئی ٭ چھین لو ساغر و سبو مجھ سے
ہیں اشارے یہ موجِ مے کے شمیم ٭ کر بھی لو آج تم وضو مجھ سے

ہر ایک خار ہے رنگین خونِ بلبل سے
خزاں کے آنے پہ بھی یہ بہار باقی ہے

بکھر کے زلف نے رخ پہ بڑھائی ظلمت اور
وہ آئے پھر بھی شب انتظار باقی ہے

ہر ایک پہ مرے اُڑتے ہیں برگ گُل کی طرح
خزاں میں بھی یہ نشاطِ بہار باقی ہے

محو ہے گلگشت میں وہ گل عذار اب کی برس
کیا بہارِ باغ ہے باغ و بہار اب کی برس
ساغرِ گل دے رہا ہے جامِ جم ہر ہاتھ میں
ہر فقیرِ بے نوا ہے شہریار اب کی برس

کسے خبر ہے کہ در پردہ نیست زاہد ؟
شریکِ صحبتِ رندانِ بادہ خوار میں ہے
جنونِ عشق میں ہو پختگی اگر تو ثمیم ؟
خزاں میں بھی ہے وہی رنگ جو بہار میں ہے

چلو جنت میں شغلِ ساغر و پیمانہ ہو جائے
جگہ پُر لطف ہے اک صحبتِ رندانہ ہو جائے
ذرا تو ہاتھ تو رکھ دے کسی کے روئے روشن پر
مرا ذمہ جو ملے زاہد ید بیضا نہ ہو جائے

کیا عقدِ ثریا مری نظروں میں سمائے
یہ تو ہے بس اک اترا ہوا ہار تمہارا
دیوانو! یہ عزت تمہیں بخشی ہے جنوں نے
وابستۂ دامن ہے ہر اک خار تمہارا

خزاں دیدہ جو کچھ پتے پڑے تھے آشیانہ میں
انھیں کو برگِ گل سمجھے انھیں کو بال و پر جانا
کڑی ہے دھوپ محشر کی ٹھہر لے واعظِ ناداں
ہمارے ساتھ زیرِ سایۂ دامانِ تر جانا

ان کے علمی و ادبی کمالات اور کارناموں کی تفصیل کے بعد ان کی سیرت اور عادات و خصائل کی مرقع نگاری بھی ضروری ہے، اس کے بغیر ان کی پوری تصویر سامنے نہ آئے گی اور ان کی خصوصیات کا صحیح اندازہ نہ ہو گا، گو حسن و جمال کی طرح ان کی اداؤں کی مصوری بہت دشوار ہے، تاہم اس کا اجمالی خاکہ پیش کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔

وہ ایک علمی مجذوب اور اپنی خصوصیات میں یگانہ تھے، ان میں بعض ایسی خوبیاں تھیں جو اس زمانہ میں ناپید ہیں یا کم از کم ان کی مثالیں بہت کم ملتی ہیں، وہ نہایت نیک سیرت، بے نفس اور مرنجان مرنج انسان تھے، ان کی ذات سے کبھی کسی کو ادنیٰ تکلیف بھی نہیں پہونچی، ان میں ایذا رسانی کا مادہ ہی نہ تھا، حقوق العباد سے ان کا دامن اتنا پاک تھا کہ کسی کا ادنیٰ حق بھی ان کے ذمہ نہ تھا، اور ان کے رفقاء و متوسلین میں مشکل ہی سے کوئی ایسا شخص ہو گا جس کے ذمہ ان کا کوئی حق نہ ہو، معاملات کے اس قدر صاف تھے کہ کسی کا ایک حبہ بھی باقی نہ رکھتے تھے، بازار کے معمولی حساب کتاب کے سوا ان کو کسی سے قرض لینے کی ضرورت ہی نہ پیش آتی تھی، تنخواہ ملنے کے بعد سب سے پہلے حساب چکاتے تھے، جب تک پورا حساب صاف نہ ہو جاتا

ان کو چین نہ آتا، حتےٰ کہ اگر دھوبی اور مہتر وغیرہ وقت پر نہ پہونچتے تو گھر جاکر ان کی تنخواہ دے آتے، مگر جس مستعدی سے اپنا قرض ادا کرتے تھے، اسی مستعدی سے دوسروں سے بھی وصول کرتے تھے، اور وقتاً فوقتاً یاد دلاتے رہتے تھے، کبھی کبھی بھرے مجمع میں یاددہانی کردیتے اور تنخواہ ملنے کے ساتھ ہی وصول کرلیتے، ہم میں سے ہر شخص ان کا مقروض رہتا، اس کے لئے ان کو بڑی زحمت اٹھانی پڑتی تھی، ہر وقت چالیس پچاس کی رقم پاس رکھتے تھے، اور یہ پوری رقم جیب ہی میں رہتی تھی، اس کے لئے کئی جیبوں کی واسکٹ پہنتے تھے، اور اس کی حیثیت صراف کی دوکان تھی، جس میں نوٹ سے لے کر ہر قسم کی ریزگاری ہوتی تھی، وہ قرض، خواہ چند پیسوں کا ہی کا ہو، بڑی ناگواری سے دیتے تھے، لیکن انکار بھی ان کے بس میں نہ تھا جس کو جس قدر ضرورت ہوتی تھی کسی نہ کسی طرح ان سے وصول ہی کرلیتا تھا ان میں مقابلہ اور مدافعت کی مطلق طاقت نہ تھی، کسی معاملہ میں خواہ ان کے مزاج کے کتنا ہی خلاف ہو، ان کے لئے انکار پر قائم رہنا دشوار تھا، ان کی اس کمزوری سے ہر شخص فائدہ اٹھاتا تھا، چھوٹے چھوٹے بچے چمٹ جاتے تھے اور بغیر پیسہ لئے نہ چھوڑتے تھے، دارالمصنفین میں جو مشترک مہمان بھی آتا تھا، یا اکل و شرب کی جو اجتماعی تقریب بھی ہوتی، اس کی زد زیادہ تر مولانا ہی پر پڑتی اور اس کی حیثیت "گپت دان" کی ہوتی تھی یعنی جس پر صرف ہوتا تھا اس کو پتہ بھی نہ چلنے پاتا تھا، اس قسم کے جبری ٹیکس اکثر مولانا کو ادا کرنے پڑتے تھے، مولانا مسعود علی صاحب نے اس کا نام

جذبہ رکھا تھا۔

بڑے قانع و بے نیاز تھے، حصول دنیا کی کبھی کوشش نہیں کی، اور ایک قلیل معاوضہ پر پوری زندگی گزار دی، دارالمصنفین میں تنہا وہی ایسے شخص تھے جس نے اس قلیل تنخواہ کے علاوہ جو ان کو ملتی تھی، دارالمصنفین کے ذریعہ اس کے اندر یا باہر کوئی فائدہ نہیں اٹھایا، یہی حال شہرت سے بے نیازی کا تھا، اس سے وہ دور بھاگتے تھے، مصنفین اور اہل قلم کے طبقہ میں ان کی جیسی بے نیازی کی مثال مشکل سے مل سکتی ہے، بے نیازی کی آخری حد یہ ہے کہ ان کو اپنے کمالات تک کا احساس نہ تھا، اور وہ اپنے ان کارناموں کو بھی کوئی اہمیت نہ دیتے تھے، جن کی ایک دنیا معترف ہے، اس کا ذکر تک پسند نہ کرتے تھے، میں ان سے کہا کرتا تھا کہ تمام مصنفین و اہل قلم کسی نہ کسی بہانے سے اپنے حالات اور کارنامے لکھ جاتے ہیں، آپ بھی لکھوا دیجیے، تاکہ آپ کے بعد ہم لوگوں کو اس کے لکھنے میں کوئی دقت نہ ہو، اور وہ ہمیشہ بڑی بے پروائی سے جواب دیتے، میرے حالات ہی کیا ہیں، اور وہ مرنے کے بعد ان کے لکھنے سے کیا حاصل، ان سطور کی تحریر کے وقت اس سوال و جواب کی پوری تصویر آنکھوں کے سامنے پھر رہی ہے، مگر یہ حسن اتفاق ہے کہ نشاط و مسرت کے آخری دور میں جس کی تفصیل آئندہ معلوم ہوگی، ایک طالب علم کبیر احمد جائسی نے جن کو لکھنے پڑھنے کا ذوق ہے، ان کے حالات و شاعری پر ایک مضمون لکھ کر ان کو دکھلایا، یہ مضمون ان کو پسند آیا تھا انھوں نے ان کی حوصلہ افزائی کے لیے ایک مستقل مضمون ہی ان کی طرف سے

لکھ دیا، جو دسمبر سنہ ۵۰ء کے آجکل میں شائع ہوا ہے، یہ مضمون مولانا ہی کا ہے اور اس حیثیت سے بہت اہم ہے کہ خود مولانا کے قلم سے ان کے حالات ہیں۔ سیاست اور ریا و نفاق کے نام سے نا آشنا تھے، ان کا ظاہر و باطن بالکل ایک تھا، جو دل میں تھا وہی زبان پر، ان کی زندگی ایک کھلی ہوئی کتاب تھی، جس کو ہر شخص پڑھ سکتا تھا، وہ ایسی باتوں کے چھپانے پر بھی قادر نہ تھے جس کے اظہار کی جرأت بہت کم لوگ کر سکتے ہیں، ان کی اس سادگی اور صاف گوئی کی انتہا یہ تھی کہ اگر کسی مسئلہ یا کسی شخص کے متعلق ان کی رائے پوچھی جاتی تو ان کی جو رائے ہوتی بلا تکلف وہی ظاہر کرتے، خواہ اس کا اظہار خلاف مصلحت ہی کیوں نہ ہوتا، اس صاف گوئی کے بدولت کبھی کبھی بڑی مشکل میں پھنس جاتے، اس لیے کہ لوگ لطف و دلچسپی کے لیے اشخاص کے متعلق ان کی موجودگی میں سوال کر دیتے تھے، اس وقت بھی مولانا وہی رائے دیتے جو اُن کے دل میں ہوتی، مگر کسی معاملہ کے متعلق ان کی کوئی مستقل رائے نہ ہوتی، بلکہ وقتی تاثرات کے مطابق بدلتی رہتی تھی، بڑے متحمل مزاج تھے، ناگوار سے ناگوار باتیں سُن کر پی جاتے تھے اور چہرہ پر شکن تک نہ پڑتی تھی، غصہ ان کو بہت کم آتا تھا، جب کسی سے بہت زیادہ برہم ہوتے تو اس کو بیہودہ یا خبیث کہتے تھے، اور چونکہ ان کو ہر شخص چھیڑتا تھا اس لئے اس لقب سے بہت کم لوگ بچے تھے، خودی اور خود نمائی کا ان میں شائبہ بھی نہ تھا، ہر چھوٹے بڑے اور ادنیٰ و اعلیٰ سے ان کا برتاؤ یکساں تھا، ادنےٰ ملازمین تک ان سے بے تکلف تھے، اور ان سے فائدہ اُٹھاتے تھے، وہ کسی سے

اپنے احترام کے متوقع نہ ہوتے تھے اور نہ اس کا ان پر کوئی اثر پڑتا تھا، وہ اصلی احترام یہی سمجھتے تھے کہ ان سے کوئی ناگوار بات نہ کی جائے، ان کے احترام اور مدارات کے لئے کسی بڑے اہتمام کی ضرورت نہ تھی، خوش اخلاقی سے ملنا، ایک پیالی چائے پلا دینا یا ایک پان کھلا دینا بہت کافی تھا، خود بھی وہ دوسروں کی اسی قسم کی مدارات کے قائل تھے، ان کی زندگی اس قدر سادہ تھی کہ ناگزیر ضروریات زندگی کے علاوہ نمایش اور تعیش کا کوئی سامان کبھی نہیں رکھا، ان کی ساری کائنات دو بکس، چند جوڑے کپڑے، ایک بستر اور ایک پلنگ سے زیادہ نہ تھی، جب کو ان کی وفات ہوئی ہے دن شام کو ان کے ورثہ ایک یکہ پر ساتھ لیتے گئے، وہ وقت ایسا تھا کہ یہ منظر دیکھ کر بہتوں کی آنکھوں سے آنسو نکل آئے، لیکن حقیقت شناس نگاہیں کہہ رہی تھیں کہ

سبک سار مردم سبک تر روند

ان کی بعض خصوصیات ایسی ہیں جن کا دکھانا بڑا نازک کام ہے، مگر اس کے بغیر ان کی اہم خصوصیات کا ایک بڑا دلکش رخ سامنے نہ آئے گا، مگر ان کو ایک خاص پس منظر میں دیکھنا ضروری ہے، ورنہ اس کا پورا لطف حاصل نہ ہو گا، اور نہ ان کے متعلق صحیح رائے قائم ہو گی، ان کو مراق کا پرانا مرض تھا اور کبھی کبھی اس کے دورے بھی پڑتے تھے، اس لئے ان پر ہمیشہ جذب کی سی کیفیت طاری رہتی تھی، وہ کھوئے کھوئے سے رہتے تھے، اور ان کے خیالات اور اعمال میں توازن باقی نہ رہ گیا تھا، خصوصاً دورے کے زمانہ میں ان کو اپنے اوپر بالکل قابو نہ رہ جاتا تھا، اور وہ رفع القلم عن ثلاث کے حکم میں

آجاتے تھے۔

یوں تو کم وبیش ہمیشہ ان پر مراق کا اثر رہتا تھا، مگر کبھی کبھی اس کے دورے بھی پڑتے تھے، یہ دورے دو قسم کے ہوتے تھے، جن کو رجائی اور قنوطی کہہ سکتے ہیں، ان دوروں میں ان کو اپنے اوپر مطلق قابو نہ رہ جاتا تھا رجائی دورے میں سراپا جوش و خروش، زندگی و حرکت اور نشاط و مسرت بن جاتے تھے، ان کے ہر موئے بدن سے زندگی اور مسرت کے چشمے اُبلتے تھے ہر چیز ان کو مسرت ہی مسرت اور حسن ہی حسن نظر آتا تھا، ان کے لئے ہر جلوہ جنت نگاہ اور ہر نغمہ فردوس گوش بن جاتا تھا، اور وہ رسوم و قیود سے بے پروا اپنے حال میں مست و سرشار رہتے تھے، ہر وقت حرکت میں رہتے، بازار کے کئی کئی چکر لگاتے، دارالمصنفین کے احاطہ میں ہر وقت چلتے رہتے، رات بھر ٹہل ٹہل کر اشعار پڑھتے، خصوصاً چاندنی راتوں میں پوری رات جاگتے تھے، اکثر زیر لب باتیں کرتے رہتے، طبیعت میں بڑی جودت پیدا اور قوت گویائی بڑھ جاتی تھی اور علمی و مذہبی مسائل میں مجتہدانہ شان پیدا ہو جاتی، بات بات میں مباحثہ کے لئے تیار ہو جاتے اور ان کی افتاد طبع کے خلاف تعلی بھی پیدا ہو جاتی، کسی کو خاطر میں نہ لاتے، گفتگو بھی بڑی شاعرانہ کرتے، قلم میں بھی بڑا زور پیدا ہو جاتا تھا، مگر کوئی متوازن تحریر نہ لکھ سکتے تھے، تعدد ازدواج پر ان کا جو مضمون رسالہ ثقافت لاہور نے بڑے فخر و مباہات سے شائع کیا ہے، وہ اسی دور کی یادگار ہے، طبیعت میں فیاضی بھی آجاتی تھی، دو دو چار چار آنے کی چھوٹی چھوٹی چیزیں خرید کر لوگوں کو تحفے میں دے دیتے،

لباس میں بھی اہتمام پیدا ہو جاتا تھا، خضاب لگاتے بھڑکیلے کپڑے پہنتے، غرض اس دورے میں سراپا زندگی، سراپا نشاط اور سراپا باغ وبہار بن جاتے تھے، اس دورے میں سید صاحب مرحوم ان کو دیکھ کر فرمایا کرتے تھے۔

ع :- ان دنوں جوش جنوں ہے مرے دیوانے کو

اس کے مقابلہ میں دوسرا قنوطی دورہ ہوتا تھا، اس میں دل ودماغ پر غمناک خیالات کا ہجوم ہو جاتا تھا، ہر چیز میں یاس و ناامیدی نظر آتی تھی، ہر وقت افسردہ اور غمگین رہتے تھے، حال ومستقبل سب تاریک نظر آتا، ماضی پر بڑا تاسف پیدا ہو جاتا، مستقبل بالکل تاریک نظر آتا، ہر وقت اپنی اور اہل وعیال کی تباہی کے وہم سے پریشان رہتے تھے، لکھنا پڑھنا بالکل چھوٹ جاتا، رات دن پلنگ پر بالکل خاموش پڑے رہتے اور جب بولتے تو اپنی پریشانیوں اور مستقبل کے خطرات کا رونا روتے، اور اپنی داستان سنا کر ہر شخص سے ہمدردی کے طالب ہوتے، ان دونوں دوروں میں ان کو اپنی کسی چیز پر قابو نہ رہ جاتا تھا، اور ان کے رفیقوں کو ان کا سنبھالنا مشکل ہو جاتا تھا، اس مرض کا اثر انکی پوری زندگی پر تھا۔

طبعاً بڑے سادہ مزاج بلکہ بھولے تھے، جو لوگ ان کی تصانیف کے ذریعہ ان کو جانتے تھے وہ ان سے ملنے کے بعد اس کا یقین ہی نہیں کر سکتے تھے کہ وہ ان کتابوں کے مصنف ہو سکتے ہیں، ان کے خیالات اور عمل کی دنیا بڑی محدود تھی، اس کے باہر وہ بہت کم قدم نکالتے تھے، ذاتی معاملات کے علاوہ ان کو دنیا کے مسائل سے کوئی دلچسپی نہ تھی، نہ ان پر کبھی غور کرتے تھے اور نہ اس کا اثر لیتے تھے، سیاست سے انکو کوئی لگاؤ نہ تھا، دنیا کے اہم امور ومسائل پر غور وفکر تو بڑی چیز ہے، وہ موٹے

موٹے اور عام تہ الورود معاملات و مسائل کے سوا جن پر آجکل ہر صحبت میں گفتگو ہوتی ہے۔ دنیا کے حالات سے بالکل بے خبر تھے، حتیٰ کہ دنیا کے جغرافیہ میں وہ صرف ان بڑے ملکوں اور بڑی حکومتوں کے سوا جن کو ایک عامی بھی جانتا ہے، چھوٹے چھوٹے ملکوں اور حکومتوں سے بھی واقف نہ تھے، مختلف چیزوں کے متعلق ایسے ایسے سوالات کرتے جن کو سن کر ہنسی آتی اور پرانے بھولے بھالے بزرگوں کی یاد تازہ ہو جاتی تھی، لیکن جب لکھنے بیٹھتے تو قلم سے موتی ٹپکتے تھے، ان کے بھولے پن کا یہ دلچسپ واقعہ سُننے کے قابل ہے، ایک مرتبہ وہ شبلی کالج کے مشاعرہ میں غزل پڑھ رہے تھے، مائک پر پڑھنے کا ان کو یہ پہلا اتفاق تھا، وہ اسکے سامنے مگر اتنی دور بیٹھے کہ آواز صاف نہ آتی تھی اور مجمع سے بار بار شور بلند ہو رہا تھا کہ زور سے پڑھیے، اسلیے منتظمین مائک کو مولانا کے مُنھ کے قریب کر دیتے مگر مولانا پھر ہٹ آتے تھے، غرض کسی نہ کسی طرح انھوں نے غزل ختم کی، مشاعرہ کے بعد جب لوگوں نے پوچھا کہ آپ مائک سے مُنھ کیوں ہٹا لیتے تھے تو فرمایا کہ اس میں بجلی ہوتی ہے مجھے خوف معلوم ہوتا تھا کہ مُنھ سے چمٹ نہ جائے۔

اخبار وہ محض بیکاری کے مشغلہ کے طور پر دیکھتے تھے اور زیادہ تر "سنسنی خیز" خبریں پڑھتے تھے چنانچہ پورا اخبار پڑھ جاتے اور اہم سیاسی خبروں تک سے ناواقف رہتے تھے جب کسی دوسرے کی زبان سے کوئی اہم خبر سنتے تو دوبارہ اخبار کی تلاش ہوتی، سیاسی معاملات پر وہ شہر کی ایک مشہور شخصیت حاجی عبدالغفور خستہ سے جو بالکل اَن پڑھ لیکن دارالمصنفین کے بڑے حاضر باش اور دنیا بھر کی خبریں لاتے رہتے ہیں، گفتگو اور تبادلۂ خیالات کرتے تھے، اسوقت ان دونوں ماہروں کی گفتگو سُننے کے لائق ہوتی تھی۔

ان میں بعض متضاد اوصاف تھے بعض چیزوں میں بڑے قدامت پرست اور بعض

میں جدت پسند تھے، جدید تمدن کی اکثر چیزوں کو بہت پسند کرتے تھے اور ان پر حیرت کرتے تھے لیکن ہندوستان کے اس دور کے کسی آدمی کی بڑائی کے قائل نہ تھے ان کے نزدیک بڑائی سر سید، محسن الملک، وقار الملک، مولانا شبلی، آغا خاں، تلک، گوکھلے سر نیدر ناتھ بنرجی، گاندھی جی اور انکے معاصرین پر ختم ہوگئی تھی، یہی رائے علماء کے طبقہ اور علم کے متعلق بھی تھی، علم انکے نزدیک پرانے یا زیادہ سے زیادہ انکے دور کے علماء پر ختم ہوگیا تھا اور اب کوئی علمی کام کرنے کے لئے باقی نہ رہ گیا تھا، بعض پرانے طرز کے علما کے متعلق بڑی دلچسپ ور ظریفانہ رائیں رکھتے تھے، اور ان پر بڑی دلچسپ تنقید کرتے تھے مگر اکابر میں حضرت مولانا اشرف علی کے بہت قائل تھے۔

مگر اسی کے ساتھ دوسرا پہلو یہ تھا کہ ہر بڑے اور صاحب وجاہت آدمی کو خواہ رئیس ہو، بڑا عہدہ دار ہو، لیڈر ہو بڑی ہیبت کی نظر سے دیکھتے تھے، جبتک وہ خود ملنے میں پیشقدمی نہ کرتا تھا، اسکے قریب جانے کی ہمت نہ کرتے، بلکہ دور سے بچوں کی طرح جھانکتے، امراء اور رؤسا کے عیش و تنعم اور شان و شوکت کے واقعات بڑے شوق، دلچسپی اور حیرت کے ساتھ سنتے تھے اور کبھی کبھی خود نواب علی حسن خاں، منشی احتشام علی، مولانا حبیب الرحمن خاں شروانی مرحوم کی امارت کے واقعات بیان کیا کرتے تھے، جنکو سنکر ہنسی آتی تھی، نواب رامپور اور نظام حیدرآباد کے واقعات سنکر تو ان پر ایسی مسرت آمیز حیرت طاری ہوتی تھی کہ معلوم ہوتا تھا الف لیلہ کی کسی محفل میں پہونچ گئے ہیں انگریزی تمدن اور انگریزی حکومت کی شان و شوکت کی بنا پر انگریزوں کے بڑے مداح تھے اور حکمرانی انگریزوں پر ختم سمجھتے، ان کے نزدیک ہندوستان و پاکستان کسی میں بھی حکومت کی اہلیت نہ تھی ان کے ذہن میں آزادی اور غلامی کا امن کے

علاوہ کوئی مفہوم نہ تھا کہ جس حکومت میں حسنِ انتظام شان و شوکت، امن و امان اور خوشحالی ہو وہی اصلی حکومت ہے ورنہ حکومت نہیں پنچایت ہے، طبعاً بڑے کمزور تھے خطرات کے قریب نہ جاتے تھے، مگر بے خطر اور پُر امن ہنگاموں سے بڑی دلچسپی تھی، چنانچہ میلوں میں بڑے شوق سے شریک ہوتے تھے، اور اس دن گھر کے بجائے میلہ ہی کی چٹپٹی چیزیں کھاتے تھے اور کبھی کبھی ہم لوگوں کیلئے بھی خرید کر لاتے تھے۔

ان پر اکثر خود فراموشی طاری رہتی تھی، اسلئے سوسائٹی کے ظاہری آداب و رسوم کے پابند نہ تھے کبھی جب موڈ میں ہوتے تو سلیس آداب برتتے نہایت عمدہ باتیں کرتے ملنے والا سمجھتا کہ وہ واقعی مشہور مصنف مولانا عبدالسلام صاحب ہیں ورنہ ہی اور کبھی دماغ بالکل غیر حاضر رہتا مخاطب کرنے پر بھی ہاں اور ہُوں کے علاوہ کوئی جواب نہ دیتے باتیں کرتے کرتے بالکل غائب ہو جاتے یا ایسی باتیں کرتے کہ سننے والا حیرت سے منہ تکنے لگتا یا دفعۃً اُٹھ کر چل دیتے، انکے اس جذب کی بنا پر سید صاحب رح انکو "بدبت بے پیر" فرمایا کرتے تھے اور اگر کوئی انکو زیادہ چھیڑتا تو فرماتے :۔ ع لوگ پتھر سے نہ ماریں مجھ کو دیوانے کو۔

مولانا عبدالغنی صاحب پھلپھوی انکو مجذوب کہتے تھے اور انکے بھولے پن سے بڑا لطف لیتے تھے، انکی سادگی، بھولے پن اور خود فراموشی کے بڑے دلچسپ واقعات ہیں، مگر ان کی تفصیل تطویل کا باعث ہوگی اسلئے انکو قلم انداز کیا جاتا ہے۔

ان کے بعض خاص اصول و معمولات تھے تین چار میل روزانہ شام کو ٹہلتے تھے مگر کھلی فضا کے بجائے بازار اور آبادی میں ٹہلنا زیادہ پسند تھا، اس معمول میں قنوطی دورے کے علاوہ کبھی فرق نہ آتا تھا مگر اس کی تلافی رجائی دورے میں ہوتی تھی اسمیں ان کی سیر و تفریح بہت بڑھ جاتی شام کے علاوہ صبح اور کبھی کبھی دوپہر کو بھی نکل جاتے

تھے اور اس کے لئے بہانے ڈھونڈھتے تھے، بازار کے سارے کام خود انجام دیتے تھے، اسمیں ملازموں پر اعتماد نہ تھا، ذاتی ضروریات کی چیزیں خود خریدتے تھے، درزی کو کپڑا خود دیجا کر دیتے تھے اور سلنے کے بعد خود ہی لاتے تھے، ڈاک خانہ میں خود روپیہ جمع کرتے تھے اور خود ہی نکال لیتے تھے، حتےٰ کہ خط بھی اپنے ہاتھ سے چھوڑتے تھے۔

جاڑا ان کے لئے نہایت تکلیف دہ موسم تھا، اس سے بہت گھبراتے تھے، اور اسکے لئے بڑا اہتمام کرتے تھے، ہر سال نئی جڑاول بنواتے تھے، دن بھر اوڑھے لپیٹے رہتے تھے، اسکے باوجود انکی سردی نہ جاتی تھی گرمی بہت پسند تھی، اس موسم میں بہت بشاش رہتے تھے کتنی ہی شدید گرمی ہو اسکی شکایت نہ کرتے تھے اور نہ ٹھنڈک کا کوئی انتظام کرتے تھے حتےٰ کہ پنکھا تک استعمال نہ کرتے تھے، لو کے تھپیڑے انکے لئے نسیم سحر سے زیادہ خوشگوار تھے، گرمیوں میں بھی رات کو رضائی اوڑھتے تھے، کپڑا معمولی قیمت کا پھر بھڑکدار پسند تھا، گرمیوں میں بڑے بوٹوں کی چکن یا شوخ پھولدار کپڑے کی شیروانی پہنتے تھے اور جاڑے میں کشمیرے یا چھینٹ کی استعمال کرتے تھے مگر قمیص ہمیشہ موٹی پہنتے تھے مہین کرتہ پسند نہ تھا، جاڑوں میں اونی چادر سر سے لپیٹے رہتے تھے جسمیں منھ بھی چھپ جاتا تھا، رضائی بھڑکیلی شوخ رنگ کی ہوتی تھی، جاڑوں میں پائجامہ اونی استعمال کرتے تھے، اور ایک ہی پائجامے میں کئی جاڑے گزار دیتے تھے جو کثرت استعمال سے کبھی کبھی اس قدر گھس جاتا تھا کہ صرف تانا بانا رہجاتا تھا، اکثر ایسے پھولدار اور شوخ رنگ کے کپڑے بنواتے کہ اس زمانہ کے بچے بھی اسکو استعمال کرنا پسند نہیں کرتے اگر کوئی شخص ٹوکتا تو جواب دیتے تم بدمذاق ہو کپڑا وہی ہے جو دوسروں کی نگاہ میں آئے۔

کھانے پینے میں چٹپٹی چیزیں زیادہ مرغوب تھیں، بازار کے کباب در جات بہت

پسند کرتے تھے اور کبھی کبھی اس قسم کی چیزیں بازار جا کر کھاتے تھے، چائے عمر بھر
استعمال کی، مگر اسکے عادی مطلق نہ ہوئے اگر وقت پر انکو چائے نہ ملتی تو انکو کوئی تلاش
نہ ہوتی، پانی ہر موسم میں ٹھنڈا پسند تھا، جاڑوں میں بھی باسی پانی پیتے تھے، پھلوں
میں امرود بڑے شوق سے کھاتے تھے۔

مراق اور ریاح باسوری کی شکایت کے سوا انکی عام صحت بہت اچھی تھی، بہت
کم بیمار پڑتے تھے، اور بیماری بھی بہت معمولی ہوتی تھی، بیماری میں علاج کے قائل
نہ تھے، معمولی نزلہ زکام کو تو وہ خاطر میں بھی نہ لاتے تھے اور نہ کوئی پرہیز کرتے تھے اس
عمر میں بھی معدہ صحیح اور غذا اچھی تھی اور کھانے پینے میں کوئی احتیاط نہ کرتے تھے، چار پانچ
میل آسانی سے چل لیتے تھے مگر مراق کے دورے کے زمانہ میں ان پر بیماری اور موت کا
بڑا ہراس طاری ہو جاتا تھا اس زمانہ میں وہ موہومہ خطرات کے مقابلہ اور بیماری و موت کے لئے
روپیہ جمع کرتے تھے، میں کہا کرتا تھا کہ آخر موت کیلئے اتنے انتظامات کی کیا ضرورت ہے،
کیا اسکے لئے بھی دھوم دھام کی ضرورت ہوگی، جواب دیتے کہ اگر میں بیکار ہو گیا تو کیا
ہوگا، یہ عجیب اتفاق ہے کہ انکو موت اسوقت آئی جب ان پر زندگی ہی زندگی برستی
تھی اور انکے علاج میں ایک حبہ بھی صرف ہونے کی نوبت نہ آئی، انتقال کے کئی مہینے
پیشتر سے ان پر نشاط کا دورہ تھا ہر وقت شاداں و فرحاں رہتے تھے، انکی وفات سے کچھ
پہلے اعظم گڈھ میں بڑی طوفانی بارش ہوئی تھی وہ اسمیں گھومنے نکل جاتے تھے اگر ٹوکا
جاتا تو جواب دیتے کہ اس موسم سے لطف اُٹھانے کا یہی طریقہ ہے، سفر سے بہت گھبراتے تھے،
مگر اس دورے میں سفر کا شوق بھی پیدا ہو گیا تھا اور اپنے پرانے رفیق مولانا ابوالکلام سے ملنے
کیلئے دلی جانیوالے تھے راستہ میں لکھنؤ اور علیگڈھ ٹھہرنے کا بھی ارادہ تھا اسکے لئے کئی مہینہ سے

بڑی تیاریاں کر رہے تھے، ہر جگہ کیلئے مع شیروانی اور جوتے کے الگ الگ جوڑے بنوائے تھے معلوم ہوتا تھا کہ لندن کے سفر کی تیاریاں ہیں، خط لکھ کر مولانا ابوالکلام سے سفر کی تاریخ بھی طے کر چکے تھے کہ عین اس حالت میں سفر آخرت پیش آگیا اور یہ حادثہ ایسا آناً فاناً ہوا کہ اسکا وہم و گمان بھی نہ تھا، بالکل اچھے خاصے تھے کسی قسم کی کوئی شکایت تھی، ۲۳ اکتوبر ۱۹۵۶ء کو سارے معمولات پورے کیے حتے کہ سہ پہر کو شہر گھومنے گئے رات کا کھانا کھا کر اچھے بھلے سونے کیلئے لیٹے ۲½ بجے شب کو استنجے کیلئے اٹھے غسل خانہ سے پانی لیا، غسل خانہ سے نکلتے ہی قلب کا دورہ پڑ گیا لوٹا ہاتھ سے چھوٹ کر گر گیا میں قریب ہی سویا ہوا تھا مجھے آواز دی میں اٹھا تو وہ زمین پر بیٹھے ہوئے تھے میں نے پوچھا خیریت ہے کیسا مزاج ہے فرمایا میرے پاؤں جواب دے رہے ہیں تنفس ہو رہا ہے میں نے پکڑ کر تخت پر جو قریب ہی بچھا ہوا تھا بٹھایا، کہا مجھ سے بیٹھا نہیں جاتا لٹا دو، میں نے برآمدے سے بیجا کر اپنے کمرہ میں پلنگ پر لٹا دیا، مجھے صورت حال کی نزاکت کا مطلق اندازہ نہ ہوا میں سمجھا کہ جسطرح کبھی کبھی چکر آجاتا تھا آگیا ہوگا تھوڑی دیر میں طبیعت سنبھل جائیگی مگر انکا وقت پورا ہو چکا تھا پلنگ پر لٹاتے ہی دو چار لمبی سانسیں لیں اور ختم ہو گئے، دارالمصنفین کے احاطہ کے لوگ بھی اسوقت پہونچے جب وہ دنیا سے رخصت ہو چکے تھے۔

اپنی نیکی، بے نفسی اور سادگی اور بے تکلفی کی وجہ سے ہر طبقہ میں یکساں مقبول تھے لوگ انکی عزت ہی نہیں انسے محبت کرتے تھے اسلئے انکی موت سے عوام و خواص دونوں متاثر ہوئے بلکہ غربا اور عوام زیادہ متاثر تھے عموماً بڑے لوگوں کا غم بڑے طبقہ تک محدود رہتا ہے اور وہ بھی حقیقی سے زیادہ رسمی ہوتا ہے غربا اور عوام کے کانوں پر جوں تک نہیں رینگتی، موت درحقیقت وہی ہے جس پر غریب اور درمند طبقہ کی آنکھیں اشکبار ہو جائیں، انکی وفات پر بہت سے تعزیتی

خطوط آئے اگر سب سے زیادہ مؤثر تعزیت ادنیٰ طبقہ کے ایک غریب عورت کی تھی اُس نے کہا "مولوی صاحب بڑے بھلے مانس ہیں اب بنگلوا (دارالمصنفین) کھالی ہوئے گوا" اسکا یہ تاثر بالکل صحیح تھا، اسلئے کہ اب واقعی دارالمصنفین میں اس طبقہ سے انسانیت اور ہمدردی کا برتاؤ کرنے والا کوئی نہ رہ گیا تھا، ان کی یہ مقبولیت انشاء اللہ عالم آخرت میں ان کی مقبولیت کا ذریعہ ہوگی۔

ان میں بعض ایسے اوصاف تھے جو اس زمانہ میں ناپید ہیں آجکل کتنے تسبیح و مصلے والے ایسے ہیں جنکا دامن حقوق العباد سے پاک اور معاملات میں صاف ہو اور جن سے کسی انسان کو ایذا نہ پہونچی ہو، مولانا عبدالسلام صاحب کا دامن ان تمام معاملات میں معصوم بچوں کی طرح بے داغ تھا انکے ذمہ کسی کا ادنیٰ حق بھی نہ تھا بلکہ اپنی حق تلفی پر بھی وہ خاموش رہتے تھے، انکی ذات سے کسی کو ادنیٰ تکلیف بھی نہیں پہونچی، یہ معمولی بات نہیں ہے اس زمانہ میں اسکی مثالیں کم ملیں گی، انکے مضامین اور انکی مذہبی کتابوں سے بہتیرے مسلمانوں کو ہدایت حاصل ہوئی، اسلئے انشاء اللہ انکے یہ نیک اعمال رائگاں نہ جائیں گے، باقی بشری کمزوریوں سے کوئی انسان بھی مستثنیٰ نہیں ہے اللہ تعالےٰ غفور الرحیم ہے، امید ہے کہ وہ اِنَّ الْحَسَنَاتِ يُذْهِبْنَ السَّيِّئَاتِ کے اصول پر ان کی نیکیوں کے طفیل میں ان کی کمزوریوں سے درگذر فرمائے گا۔

حق مغفرت کرے عجب آزاد مرد تھا